بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرآۃ الغالب شرح دیوانِ غالب

حضرت غالبؔ کے اردو دیوان کی مکمل شرح

از: جناب سید وحید الدین صاحب بیخودؔ دہلوی جانشین حضرت داغؔ مرحوم

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim Awan

مرآۃ الغالب

حضرت غالب علیہ الرحمۃ کے اردو دیوان کی مکمل

شرح

از جناب سید جلال الدین صاحب حیدر دہلوی صاحب [illegible]

حسب فرمائش آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد

مالک آزاد بکڈپو کوچہ چیلان دہلی

قیمت مجلد مطلا [illegible] (مطبوعہ محبوب المطابع دہلی) قیمت غیر مجلد [illegible]

هو الجمیل

دیباچہ

جب زمانے نے حضرت ذوقؔ و مومنؔ سے مسندِ سخن کو خالی پایا اور نظم کا چراغ گل ہونے لگا تو آسمانی برکتوں کو آخر بار بعد التجا لایا اور عروسِ سخن کو بنا سنوار کر فارسی کے ملک الشعراء مرزا نوشہ کے سامنے لا بٹھایا۔ خدا کی قدرت ہے کل تک جس کا کلام "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" تھا، آج اُس کے سامنے زبان بھی سرنگوں ہے۔ محاورہ بھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ وہ ایچ پیچ کی غیر موزوں ترکیبیں بھی اُلجھ اُلجھ کر سلجھ گئی ہیں جس کیلئے خود اپنا اُردو کلام باعثِ ننگ تھا آج باعثِ فخر ہے۔

حقیقت بھی یوں ہے کہ دہلی کا وہ زمانہ جس میں یہ حضرات جلوہ افروزِ بزمِ ادب تھے نظم کی دنیا میں بہترین زمانہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ میرؔ و سوداؔ نے جو پیوند لگائے تھے اُن پودوں میں اب پھل آرہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص بذاتِ خود ایک انجمن اور شاعر تھا۔ ہر ایک کی زبان فرہنگِ آصفیہ کی کان تھی۔ دہلی کی آخری ادبی بہار کے افسانہ میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جن کا نظیر ہم اب تک پیدا نہیں کر سکے۔ نہ اُمید ہے کہ نظم کی کان سے ایسے لعلِ بے بہا دوبارہ پیدا ہوں گے۔

اللہ اکبر۔ دہلی نے ایک وہ وقت دیکھا ہے جبکہ تاجِ ملک الشعرائی حضرت

ذوق کے سر پہ چھت تھا اور زبان کی صفائی اور محاورہ کی چستی انتہا کو پہنچائی جا رہی تھی۔ دفترِ سخن آفرینی کی اقلیم پر حکیم مومن خاں صاحب مومنؔ کی حکومت تھی جن کی نازک مزاجیاں شیشہ سے پتھر کو توڑ رہی تھیں۔ عروسِ سخن کے دولہا حضرتِ ظفرؔ تھے کہ مراتبِ سخن آرائی پر ایک نیا رنگ اور حاشیہ چڑھا رہے تھے۔

مرزا اسد اللہ خان صاحب غالبؔ اگرچہ فارسی میں ظہوری اور نظیری سے اونچے اُڑتے تھے اور ریختہ اُن کی آنکھوں میں گرد سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا مگر اساتذہ کی بلند پروازیاں۔ احباب کی فرمائشیں۔ زمانے کی رفتار ان کو بھی اس انجمن میں لیے چلی آتی تھی۔ ان کے علاوہ مفتی صدر الدین خان صاحب آزردہؔ حکیم آغا جان عیشؔ۔ غلام علی خان صاحب وحشتؔ۔ نواب مصطفےٰ خان صاحب شیفتہؔ نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب نیرؔ۔ حافظ غلام رسول ویرانؔ۔ حافظ غلام رسول صاحب شوقؔ۔ حضرتِ ظہیرؔ۔ حضرتِ انورؔ۔ حضرت مجروحؔ۔ حضرت زین الدین صاحب عارفؔ۔ حضرت معینؔ۔ حضرت بشیرؔ۔ حضرتِ داغؔ۔ حضرت سالکؔ۔ مولوی عبد الکریم صاحب سوزؔ۔ مرزا قادر بخش صاحب صابرؔ۔ میاں خورسندؔ۔ میاں تشنہؔ تھے اور ان کے بعد سارا شہر ایک برات تھی جو رات دن اُردو نظم کے بیاہ رچاتی تھی۔ اور نئے سے نیا گل کھلاتی تھی اور زبان بجائے ریختہ اور ریختی کے زبان اُردو کہلانے لگی تھی۔

افسوس جب اُن میں سے بہت سے چراغ بجھ گئے تو اُردو بے سرپرست کے رہ گئی قدرت کی نظرِ انتخاب اُس شخص پر پڑی جس کو اس زبان میں شعر کہنا اور پڑھنا بھی عار تھا۔ مگر آفرین ہے اس استادِ سخن پر جب وقت یہ بوجھ اُس کی گردن پر رکھا گیا تو اس طرح سنبھالا گویا اُن کا اپنا مال تھا۔ اُن کی ذاتی دولت تھی جو واپس آ گئی۔ اس تغیر کو اگر معجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اگر مرزا کے کلام کو تقسیم کیا جائے اور غدر سے کچھ دنوں پہلے کا کلام الگ کر لیا جائے تو اُس وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا اُردو میں شعر کہتے

ہیں یا فارسی میں۔ آج جو ہم ان کے ہمعصر شعراء کے طعن آمیز اشعار مرزا کی نسبت منکر چونک اُٹھتے ہیں اُس کی حقیقت اُس وقت معلوم ہو۔ مگر جب اُردو کی ملک الشعرائی اور سرپرستی خود اُنہی کے سر پہ رکھی گئی تو آنکھیں کھل گئیں۔

اُس وقت زبان میں تغیر پیدا ہوا۔ میر و ذوق کی زبان اشعار میں نظر آنے لگی معنی آفرینی جو مومن خان صاحب کے قابو سے بھی نکل جایا کرتی تھی اب صاف محاورہ میں کھپ گئی اور شاعرانہ فلسفہ اُردو میں تکمیل کو پہنچا۔

غدر کے کچھ دنوں بعد جب مرزا کی شاعری نے اپنا پورا سکہ لوگوں کے دلوں پہ بٹھا لیا اور شیریں زبان لطف سخن نے ہر طرف مرزا کا ڈنکا بجایا اور مرزا کے اُردو کلام کی بھی مانگ شروع ہوئی تو مرزا کے احباب نے اُردو دیوان چھپوانے کا قصد کیا۔ مگر سارا دیوان چھپوانا بہت خطرناک تھا۔ لہٰذا انتخاب کیا گیا اور یہ سترہ سو اشعار کا انتخابی گلدستہ کٹ چھٹ کر سرو سہی بنکر نکلا اور سارے ہندوستان میں پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مگر وہ زمانہ ایسا انقلاب خیز تھا کہ اچھے اچھے نقش مٹ گئے۔ فارسی جس نے ہندوستان میں آکر سب پر پُرزے درست کئے تھے مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ فنا ہو گئی۔ اُردو بچہ زبان۔ بازاری زبان۔ اس میں فلسفہ حکمت۔ اخلاق عشق کے انتہائی جذبات کہاں۔ کیونکہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے عام لوگ جن میں یہ باتیں مفقود۔ تو مرزا کا دیوان اپنی خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ شیریں زبان اور انداز بیاں کی وجہ سے پھیلا اور زندہ رہا۔

اس زمانہ میں دو قسم کے لوگ مرزا کے اُردو دیوان کو پڑھتے تھے۔ اول وہ طبقہ جو مرزا کی فارسی شان سے آشنا تھا اور ہر طرح مرزا کی باتوں اور نکتوں کا عاشق تھا۔ دوسرے عام اُردو غزلخواں حضرات جو مرزا کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر۔ مشکل پسند

شاعر، غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ آخر پہلا طبقہ تنہا ہو گیا۔ دوسرے طبقہ نے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے اور پڑھنے کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ جس کے لئے عام طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ جو مرزا کے کلام کا شائق ہوتا وہ پتہ لگاتا کہ اس وقت مرزا کے کلام کا مفسر کون ہے اس سے پڑھتا اور دوسروں کو بھی پڑھاتا۔

مگر جب تعلیم کے چرچے عام ہوئے اور ان چیزوں کی طرف ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ بڑھنے لگے تو اُس وقت بعض حضرات نے شرح کی ضرورت سمجھی اور لکھی بھی گئیں جن میں سے مشہور جناب نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کی ہے۔ وہ ہماری خوش قسمتی کی وجہ سے ہم میں موجود ہیں۔ ورنہ وہ تو طبقۂ اعلیٰ کے انسان ہیں۔ لہٰذا نئی روشنی کے خیالات کا اُنہوں نے بہت کم خیال رکھا، اور اکثر اجتہاد سے کام لیا۔ دوسری جناب شوکت میرٹھی نے شرح لکھی۔ مگر وہ شاید دو صدی پیچھے کے شاعر تھے خدا جانے کیا لکھ گئے۔ اُن کی شرح خود اپنی ایک شرح چاہتی ہے۔

مولانا حالی نے یادگار میں اکثر اشعار کو اس طرح بیان کیا جس طرح حق تھا۔ مگر مکمل شرح نہیں ہے۔ شاعری پہ ریویو کرتے کرتے لکھ دیئے ہیں۔ بعد میں نت نئی شان سے جناب نظامی بدایونی، حضرت حسرت موہانی، حضرت سُہا نے شرحیں نکالیں جنہوں نے بہت کچھ آسانی اور سہولت بہم پہنچائی اور اشتیاق کے جذبہ میں آگ لگائی اور ہر طرف غالب ہی غالب آوازیں آنے لگیں۔

گزشتہ سال مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو ایک جگہ حضرت غالب کا ذکر ہو رہا تھا اور اشعار پہ بحث تھی۔ احباب اُس کے مختلف معنی بیان کر رہے تھے۔ بعض جگہ دہلی کے خاص محاورے پہ تذکرہ تھا۔ اکثر مروجہ شرحوں سے سند لاتے تھے۔ ایک صاحب جناب بیخود صاحب کی طرف اپنے معنوں کو منسوب کرتے تھے جو قرین قیاس اور نفیس تھے۔ اُس دن سے مجھے خیال آیا کہ مرزا غالب دہلی کی زبان، اُردو کی جان

پھر اب تک کسی دہلی والے نے شرح نہیں لکھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ بہتر صورت پیدا ہو جائیگی۔ اس کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا۔ اکثر احباب نے جناب حاجی سید وحیدالدین صاحب بیخود جانشین حضرت داغ کا نام تجویز کیا اور کہا کہ اس وقت مرزا کے دیوان کے مفسر ہیں۔ شاید ان کے بعد دہلی میں ایسا آدمی میسر نہ آئے۔

اس خیال کے آتے ہی میں آغا حیدر حسن صاحب قدر شاگرد رشید جناب بیخود صاحب کو ساتھ لیکر پہنچا اور اپنا منشا ظاہر کیا۔ حضرت بیخود کی حالت یہ ہے کہ دلی انگریزی حکومت کی ناز آفرینیوں کی جولانگاہ ہے۔ گو یہ اردو کے حق میں صحرا ہو گئی ہے تو اسی اجڑی بستی میں حضرت بیخود سجادۂ ادب بچھائے قناعت کے گوشہ میں درس و تدریس کے سلسلے سے قیام رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں اس قدر رعشہ ہے کہ اپنا نام دونوں ہاتھوں سے قلم تھام کر بمشکل تحریر فرماتے ہیں۔ انہوں نے ہر چند ان باتوں کا عذر فرمایا مگر میں نے اور اُن کے حلقہ تلامذہ نے آخر اُن کو منا لیا۔ اور ایک کاتب ملازم رکھکر یہ شرح لکھنی شروع کر دی۔

اس شرح کی اشاعت کے لئے سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ دوسرا حضرت بیخود صاحب کا شکریہ۔ مگر وہ میں کیا ادا کر سکتا ہوں اہل زبان۔ اہل ملک ادا کریں۔ میں تو خود ہمیشہ فخر کیا کروں گا کہ میری ناچیز کوشش سے یہ گرانبہا چیز تیار ہو گئی۔ اس کے ابتدا میں حضرت بیخود صاحب کا وعدہ تھا کہ مرزا کی اردو شاعری پر ایک مقدمہ لکھوں گا مگر شاعرانہ نازک مزاجی نے اردو دانوں کو اس سے محروم کر دیا۔ شاید آئندہ کرم کی نگاہ ہو جائے تو تحریر فرما دیں۔

مرزا کے اردو کلام پر مقدمہ لکھنا میرا کام نہیں۔ نہ شاعرانہ حیثیت سے نہ فلسفیانہ شان سے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہت بڑی ہیں۔ حضرت بیخود نے شرح کو عام فہم بنانے کی جس قدر کوشش کی ہے، اگر مقدمہ بھی ساتھ تحریر

فرمادیتے تو بہت کچھ امداد ملتی ۔

حضرت بیخود صاحب کی شرح زیادہ تر اسی خیال سے چھپوائی گئی ہے کہ شاعرانہ ترکیبیں ۔ زبان کے نکتے ۔ دلی والوں کا خاص طرز ادا عشقیہ جذبات سب عام فہم ہو جائیں ۔ اور کوئی بات سوائے یورپین فلسفہ کے باقی نہ رہے سو وہ میدان ابھی بہت وسیع ہے ۔ ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم نے بھی ابتدا کی ہے ۔ خدا ہمارے ملک میں ایسے ہونہار پیدا کرے کہ اس کی فلسفیانہ شرحیں لکھیں اور اس بڑھے دیوان کو آسمان ادب پر پہنچا دیں ۔

تب انشاء اللہ ہر سمجھدار اور ذی حس انسان کو اس کے تخیل میں بلند پروازی کرنا سکھا دے گی اور غالب کے سمجھنے کے علاوہ وہ اپنے آپ کو بھی سمجھنے کے قابل ہو جائے گا ۔ انشاء اللہ ۔

دعا کا محتاج

طاہر نبیرۂ حضرت آزاد

۱۲ / مارچ ۱۹۳۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غزل

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مطلب یہ ہے کہ ہستی موجبِ ملال و آزار ہے بسبب ناپائداری اور فنا ہونے کے بتشریح یہ ہے کہ نقشِ عالم یعنی موجوداتِ عالم فریادی ہے نقاشِ ازل کی شوخیِ تحریر کا (فریادی کا لباس قدیم دستورِ ایران کے موافق کاغذ کا ہوا کرتا تھا جس طرح ہندوستان میں فریاد کرنے والے دن کو مشعل جلا کر لاتے تھے یا عرب میں مقتول کا لباس برچھے پر رکھکر قصاص لینے کیلئے جاتے تھے) شوخی کے معنی ہیں قیام پذیر نہ ہو۔ ثابت ہے تصویر کے کاغذی پیرہن ہونے سے یعنی عام دستور یہی ہے کہ تصویر کاغذ پہ کھینچی جاتی ہے اور کاغذ جلد بگڑ جانے والی چیز ہے۔ ہر پیکرِ تصویر سے مراد جملہ حیوانات جمادات نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ پھول دن بھر میں کمھلا جاتا ہے۔ انسان کی موت کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ لکڑی۔ پتھر۔ دھات کی بنی ہوئی اشیاء بھی انجام کار بیکار اور شکستہ ہو جاتی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ ہستی کا اپنی ناپائداری اور بے ثباتی پہ فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔ میری رائے میں شعر معنی خیز اور خیال ایک اچھوتا خیال ہے۔ اس شعر کو بے معنی کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو کے معنی کاوش اور کاہش کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں فرہاد کے واسطے حسبِ شرطِ شیریں جوئے شیر کا لانا اس قدر دشوار و مشکل نہ تھا جس قدر ایک عاشقِ وصل طلب تمنا نصیب کیلئے شبِ فراق کا سحر کرنا اور وہ بھی سخت جانی کی حالت میں یعنی سخت جانی نے مرنے کی امید بھی قطع کر دی ہے۔ فرہاد کے واسطے کوہِ بے ستوں کا کاٹنا ایک شغل تنہائی تھا۔ عاشق کو تنہائی کی رات کا کاٹنا ایک صدمۂ جاں گسل ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا

دمِ شمشیر آبداری شمشیر کو کہتے ہیں اور آب ہمیشہ باڑھ کے باہر کے حصہ پر ہوا کرتی ہے۔ عاشق آب شمشیر کا سینۂ شمشیر سے باہر ہونا اپنے جذبۂ بے اختیارِ شوق کی دلیل بتاتا ہے اور دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ شعر کے آبدار ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آگہی کے معنی اطلاع یابی اور خبرداری کے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ سامع کی شعر فہمی کا شوق صیاد بن کر جس قدر چاہے فریب کے جال بچھائے مگر میرے اشعار کا مطلب طائرِ عنقا صفت ہے جو کسی کے دامِ فریب میں پھنستا ہوا معلوم نہیں ہوتا یعنی میرا کلام سراسر اسرار غیبی ہے عام فہم نہیں ہے جو ہر کس و ناکس سمجھ سکے۔ چنانچہ مرزا صاحب اُردو کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "شعر گوئی مضمون نگاری کا نام ہے قافیہ پیمائی کو شعر گوئی نہیں کہتے۔"

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیرِ پا بیقرار اور مضطرب ہونے کا استعارہ ہے حلقۂ زنجیر کا گرمی وحشت سے موئے آتش دیدہ بن جانا جتا رہا ہے کہ اب زنجیر زنجیر نہیں رہی ہے یعنی مجھکو قید کرنے کیلئے زنجیر کافی نہیں ہے۔ قاعدہ ہے۔ بال کو جب آگ پر رکھا جاتا ہے تو وہ آگ کی گرمی سے مرجھا کر حلقہ کی شکل پیدا کر لیتا ہے۔ اور بودا ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں حلقۂ زنجیر میری گرمیٔ وحشت کے مقابلہ میں موئے مجاہد سے زیادہ ناپائدار ہے۔ زنجیر کی کڑیوں کو موئے آتش دیدہ سے تشبیہ دینی نئی طرح کی جدت ہے۔

غزل

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

فرماتے ہیں قیس کے سوا مردِ میدانِ عشق زمانہ میں پیدا نہ ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا جس میں گنجائش ہی کسی دوسرے عاشق کی نہ تھی مطلب شعر کا یہ ہے قبیلۂ عامر میں سے پھر کوئی قیس جیسا عاشق کامل پیدا نہ ہوا جو دشتِ نجد کو آباد کرتا۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی پریشاں حالی اور پریشاں خیالی۔ سویدا سودا کی تصغیر۔ دل پر ایک کالا دھبہ ہوا کرتا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میرے دل پر جو نقش سویدا ہے وہ میری آشفتہ حالی کا پیدا کیا ہوا ہے یعنی میں نے جو پریشاں حالی میں افشائے راز کے خوف سے دھواں دھار آہیں برداشت کی ہیں ان سے میرے دل پر یہ داغ پڑ گیا ہے۔ چنانچہ دھوئیں سے سیہ داغ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ داغ کی پونجی دھواں تھی۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مطلب یہ ہے جن آلامِ ہجر، صدماتِ رشک، خواہشاتِ وصل میں عہدِ شباب گزرا ہے۔ اور جو وصل اور ملاقاتوں کے مزے لوٹے ہیں وہ سب ولولے اور جوش کا زمانہ گزر جانے کے بعد ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی انسان یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہو اور آنکھ کھل جانے پر ان باتوں کے اثر فوائد اور نقائص فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتبِ غمِ دل بالکل نیا اور اچھوتا استعارہ ہے۔ فرماتے ہیں دل کھوئے ہوئے مجھکو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ مگر ابھی غمِ دل کے مکتب میں یہی سبق لے رہا ہوں کہ رفت گیا اور بود تھا۔ یعنی دل کے جانے کا بھی افسوس ہے اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ دل کبھی میرے پہلو میں بھی تھا مگر یہ یاد نہیں آتا کہ دل کب کھویا اور کیونکر کھویا۔ بے خبری عشق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں نہیں کھنچ سکتی اس پر طرہ بیخودی کی آمیزش۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں جیسا میں اصل میں تھا اور جیسا مجھکو ہونا چاہئے تھا ویسا کسی لباس میں بھی ظاہر نہ ہو سکا۔ انجام کار کفن نے میرا داغ عیوب برہنگی چھپایا ورنہ میں ہر لباس میں یعنی اصلیت کو دھبہ لگانے والا قرار پاتا رہا۔ ہر لباس سے مراد یہاں مختلف زمانے اور مختلف اوضاع سے ہے۔

یعنی میں وہی تو ہوں جس کو ملائک نے سجدہ کیا تھا۔ دنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت ۔ وہ عزت میرے اعمال و افعال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ لڑکپن کی بے تمیزیاں۔ جوانی کی بے اعتدالیاں نفس پرستیاں پیری کی ہوسناکیاں میرے جامۂ حقیقت کو دھبہ ہی لگاتی رہیں۔ البتہ مرجانے کے بعد کفن نے ان داغوں کو چھپالیا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرماتے ہیں۔ بغیر تیشہ کے کوہکن شیریں کے عشق میں جان نہ دے سکا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محبت کا نشہ اس حد تک نہ پہنچا تھا کہ فرہاد بغیر اسبابِ قتل کے قتل ہو جاتا۔ یعنی شیریں کا مرنا سن کر ایک آہ کھینچتا اور جان سے گزر جاتا۔ مگر یہ نہ کر سکا۔ اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ رسوم و قیود کا پابند تھا۔ اس کو یوں بیان کیا ہے کہ "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا"۔ خمار نشہ کے اُتار کی حالت کو کہتے ہیں اور قیود قید کی جمع ہے۔ یہاں قید یعنی پابندیٔ رسم استعمال ہوا ہے۔

غزل

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

معشوق کا یہ کہنا سن کر کہ تمہارا دل جو گم ہو گیا ہے اگر ہم کو کہیں گرا پڑا مل گیا تو ہم تم کو واپس نہ دینگے۔ مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں۔ دل ہمارے پاس ہے کہاں جو ہم کھوئینگے۔ اس بات سن کر ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے ہیں۔ یعنی ہمارا دل آپ ہی نے چرا لیا ہے۔ اب الزام سے بری ہونے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں مل گیا تو ہم نہ دینگے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

فرماتے ہیں۔ زندگی کا لطف طبیعت نے عشق سے پایا ہے۔ یعنی بے عشق زندگی گزارنا ایک دردِ لا دوا تھی۔ اس کی دوا مل گئی مگر دردِ عشق لا دوا ہے۔ اس کی دوا دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے "درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا" یہ اسلوبِ بیان مرزا صاحب کے سوا مبدءِ فیاض سے کس کو عطا ہوا ہے۔

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دوستدار دشمن یعنی دشمن کا دوست۔ دشمن سے مراد یہاں معشوق سے ہے۔ فرماتے ہیں وہ ہمارا دشمن ہے اور دل اُس کا دوست ہے اب ہم دل پر خاک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں۔ آہ و نالہ میں اثر نہیں۔ اثر کیونکر ہو دل سے نالہ کیا جائے تو تاثیر ہے افسوس اس بات کا ہے نہ آہ اثر کرتی ہے نہ نالہ رسا ہوتا ہے۔ دل کی دشمنی کا خوب ثبوت دیا ہے۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری　　حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس بیان کے قربان جائیے۔ کیسے پیچیدہ خیال کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے سادگی بھولاپن۔ پرکاری۔ چالاکی۔ بیخودی۔ غفلت۔ ہشیاری۔ خبرداری۔ فرماتے ہیں معشوق کو تغافل یعنی غفلت میں جرأت آزما پایا۔ مطلب یہ ہے عشاق کا دل دیکھنے کیلئے معشوقوں کا بھولاپن ہوا کرتا ہے۔ درحقیقت یہ بھولاپن خاص ہشیاری اور عین چالاکی ہے نشست الفاظ کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل　　خوں کیا ہوا دیکھا گُم کیا ہوا پایا

مطلب یہ ہے۔ ہمارا دل جو خون ہو کر آنکھوں کی راہ سے زمین پر ٹپک گیا تھا اور پہلو میں کہیں اس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ آج ہم نے اُسی دل کو دیکھ لیا اور پا لیا یعنی یہ غنچۂ گل جو فصل بہاراں میں پھر دوبارہ کھلا ہے ہمارا دل ہی تو ہے جو خزاں کے زمانہ میں خون ہو گیا تھا دل کو اکثر غنچے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی　　ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

فرماتے ہیں۔ دل کی حقیقت حال سے ہم واقف و خبردار نہیں ہیں کہ کب گیا اور کیونکر گیا یعنی عشق ایک بے اختیاری شے ہے جو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس وقت پیدا ہو گیا۔ اور کس طرح پیدا ہو گیا۔ لیکن اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے دل کو ہزاروں بار ڈھونڈا ہے اور تم نے اس کو ہزاروں بار پایا ہے۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا　　آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

فرماتے ہیں۔ ناصح کی نصیحت بیجا نے زخم دل پر نمک چھڑک دیا جس کا مزہ کچھ دل ہی

لے رہے آپ سے یعنی حضرت ناصح سے تو کوئی پوچھے کہ آپ کو کیا لطف حاصل ہوا۔

غزل

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

فرماتے ہیں۔ میرا دل سوزِ نہاں سے بے خوف ہو کر جل گیا اور اس کے جلنے کی صورت یہ تھی کہ "آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا"۔ آتشِ خاموش وہ آگ جو چپکے چپکے سلگا کرتی ہے۔ اور جس میں شعلہ نہیں اٹھتا۔ سوزِ نہاں کے مقابلے میں آتشِ خاموش کا لفظ مصرعِ ثانی میں استعمال کرنا، نہایت بلاغت ہے۔ مرزا صاحب کے بیان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کہ بغیر ارادہ اور تلاش کے اکثر لفظی رعایتیں واقع ہو جاتی ہیں۔ جن کو صنعتِ الفاظ میں شمار کیا گیا ہے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مطلب یہ ہے عشق میں یاس و ناامیدی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب دل میں ذوقِ وصل اور یادِ یار تک باقی نہیں ہے۔ اس کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ خانۂ دل میں ایسی آگ لگی کہ جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب جل گیا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ قاعدہ ہے ناامیدی جب حد سے گزر جاتی ہے تو توقع خود بخود مٹ جایا کرتی ہے۔ جیسے "ہجومِ یاس نے ایسا کیا ہے دل کہ حسرت کو ترے آنے کی اب امید باقی ہے نہ خواہش ہے"۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

فرماتے ہیں۔ میں عدم سے بھی کچھ آگے نکل گیا ہوں یعنی فنا فی اللہ ہو گیا ہوں۔ البتہ جب اس منزل کو طے کر رہا تھا تو بارہا میری آہِ آتشیں سے عنقا کے بازو میں آگ لگ گئی تھی۔ مطلب یہ ہے میں نے ابتدائے تعلیمِ فنا میں شہرتِ عنقا کو مٹا دیا تھا جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو ترقیاتِ انسانی کو سمجھ نہیں سکتے۔

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

فرماتے ہیں میں اپنے پرسوز مضامین کی گرمی کا بیان کہاں جا کر کروں میں نے سوچا تھا شہر کو چھوڑ کر جنگل میں بیان کروں گا۔ رسیدگی کا خیال آتے ہی جنگل میں آگ لگ گئی۔ مرزا صاحب کا مُدعا اس بیان سے یہ ہے کہ نافہموں کی کثرت دیکھ کر جیسا پرسوز شعر لکھنے کو میرا جی چاہتا ہے لکھ نہیں سکتا اور اپنے تخیل کی پوری پوری بلند پروازیاں دکھا نہیں سکتا یعنی نافہموں کے سامنے اظہار کمال سے ہچکچاتا ہوں۔ جوہر اندیشہ سے جوہر فکر مراد ہے۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ یہ جو تو میرے سینے کے داغوں کی سیر اور روشنی دیکھ کر تعجب کر رہا ہے اور حیرت میں مبتلا ہے میرے دل کے مقابلہ میں ان کی کچھ حقیقت نہ تھی اگر میرا دل میرے پہلو میں ہوتا اور تو اُس کا تماشا دیکھتا تو حقیقت حال سے واقف ہوتا۔ مگر کیا کروں وہ کارفرما ہی مٹ گیا۔ البتہ یہ اُس کا پرتو اور اثر باقی رہ گیا ہے جس کو تو دیکھ کر حیرت و تعجب کر رہا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

فرماتے ہیں شگفتگی خاطر جو روز ازل میں خصوصیت کے ساتھ مجھ کو ملی تھی جس کی بدولت میں زمانہ بھر میں لطیفہ گو اور بذلہ سنج مشہور ہو گیا تھا اب اس کے مقابلہ میں افسردہ خاطری کا تمنائی اور آرزومند ہوں اور اس خواہش کا اصلی سبب طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا ہے یعنی یہ لوگ مجھ سے منافقانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

قیس کا لقب مجنوں ہے۔ مجنوں دیوانہ کو کہتے ہیں۔ دیوانہ اکثر ترک لباس کر دیتا ہے شوق کے معنی یہاں عشق کے لئے گئے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں عشق دنیا کے سروسامان کا دشمن نکلا۔ سامانِ دنیا میں لباس بھی داخل ہے۔ مطلب یہ ہے رنگِ عشق ایسا پختہ واقع ہوا تھا کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی اُس نے عریاں ہی رکھا۔ رنگین تصویر جیسی دستی تصویر کھینچی

جاتی ہے وہ بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ اب ہر رنگ کے معنی ملاحظہ ہوں یعنی عشق میں جنون میں۔ عریانی میں۔ تصویر کے رنگ میں۔ الغرض ہر جگہ میں عشق دشمنِ ننگ و ناموس ہی رہا۔ ظاہر ہے کہ قیس عاشق تھا جنگل میں رہا ترکِ لباس کیا۔ دیوانہ لقب پایا۔ مرزا صاحب کے کمال کو دیکھئے کہ انہوں نے پردۂ تصویر میں بھی اُس کو عریاں ہی دکھایا۔

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پُرافشاں نکلا

تنگدلی اور تنگ چشمی کا استعمال رشک و حسد کے موقع پر ہوتا ہے اور یہاں تنگدلی سے رشک کے عربی معنی مقصود ہیں جس کو عربی میں غبطہ کہتے ہیں اور غبطہ کے معنی جس پر رشک کیا جائے اس کے صفات حاصل کرنے کے ہیں۔ پرافشاندن کے معنی اہلِ ایران کے محاورہ میں ترکِ تعلق کردن کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زخم نے غبطۂ دل کی داد نہ دی یارب جس کے سبب تیر بھی ترکِ تعلق کر کے سینۂ بسمل سے نکل گیا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ رشکِ دل نے تیر کی خلش سے سینہ کو بچا دیا۔ اور وہ اس طرح کہ دل نے سینہ کے رشک سے جس میں یار کا تیر جوک کر بالکل لگا تھا جان دے دی۔ اب تیرِ یار نے دیکھا کہ دلِ عاشق بغیر زخم کے مر گیا میری ضرورت باقی نہ رہی ترکِ تعلق کر کے سینے سے نکل گیا۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھول کی خوشبو۔ دل کی فریاد۔ چراغ کا دھواں۔ یہ سب چیزیں ہوا کے ساتھ پھیلنے والی اور بکھر جانے والی ہیں۔ شاعر ان پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا باعث ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی بحیثیت عاشق ہو کر تیری بزم سے نکلی ہیں اس لئے پریشان ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تجھے دیکھ کر اور تجھ سے جدا ہو کر ممکن ہی نہیں کہ کوئی پریشان نہ ہو۔ یعنی تجھ پر عاشق نہ ہو جائے۔

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مائدہ کہتے ہیں [illegible] کو۔ [illegible] دندان کو کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس مقام

پر دسترخوان کے معنی لئے ہیں۔ فرماتے ہیں میرا دلِ حسرت زدہ لذتِ درد کا دسترخوان تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ یاروں کو اُن کی قابلیت و ذوق کے موافق حصہ میرے دسترخوان پر سے ملا۔ یہاں کچھ کمی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اپنی قابلیت کے موافق لوگ مجھ سے مستفیض ہوئے۔

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند　　سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

فرماتے ہیں میری ہمت اور میرا حوصلہ اس قدر دشوار پسند واقع ہوا ہے کہ فنا کی تعلیم اُس کے واسطے ایک معمولی سا کام سمجھنا چاہئے۔ جیسے کسی مولوی کو۔ الف۔ ب۔ ت پڑھائی جائے۔ کیا مشکل کی بات ہے جس کام کو ایک زمانہ دشوار و مشکل سمجھتا ہے وہ بھی میرے واسطے آسان نکلا اک اور جگہ پر بھی مرزا صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں۔ فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے + کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

[illegible]　دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ　　آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

پھر کا لفظ اس مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ گریہ میں دوبارہ شور و غل پیدا ہوا۔ شور و غل پانی کی وہ آواز جو دریا یا سمندر میں جوش کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں پہلی بار تو میں نے اُس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ نکلنے دیا۔ افسوس ہے اب وہ دریا پھر نکلا اور طوفان کی صورت اس نے پیدا کر لی۔ شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ عشق نے ظاہر ہو جانے کا سامان پیدا کر لیا۔

[illegible]　دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا　　عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

فرماتے ہیں۔ وہ شخص دھمکانے سے مر گیا جو میدانِ جنگ میں پیش نہ آ سکتا تھا (یہ اشارہ ہے [illegible] کی طرف) عشقِ نبرد پیشہ وہ سپاہی جو ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔ ایسے مصاف میں ایک بہادر سپاہی کو بلا رہا ہے اور وہ بہادر سپاہی ہم ہیں۔ ہم نے فرہاد کی طرح عشق کی دھمکی میں آ کر جان نہیں دی۔ بلکہ مردانگی سے ساتھ عشق [illegible] عشق کا منت [illegible] زندگی

بکھر رہے تھے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

فرماتے ہیں مجھے زندگی میں بھی موت یاد تھی اس لئے میں نے اپنے کو فنا ہونے سے پیشتر فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ اہلِ تصوف ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جو موتوا قبل ان تموتوا کے راز سے آشنا ہیں۔ دوسرے مصرعے میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا" یعنی موت کی مردنی چھا جانے سے پہلے میرے منہ پر موت کی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس زمین میں ایسا بلند شعر کہنا مرزا ہی جیسے ماہرِ فن اور مسلم الثبوت استاد کا کام تھا۔

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فرماتے ہیں ابتدائے عشق میں اس وقت جبکہ میں وفاداری کے متعلق نسخوں کی تالیف کر رہا تھا اور ادویۂ وفا کی ایک ایک دوا کا خواص و مزاج قائم کر رہا تھا اور وہ ایسا وقت تھا کہ میرا خیال وفا کی ایک ایک خوبی کو علیحدہ علیحدہ جانچ رہا تھا۔ مجھ پر ستم کا آغاز ہو گیا اور میری وفا کے نسخے نامکمل اور ناتمام رہ گئے۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

شعر کا مطلب یہ ہے۔ جو جوش و خروش اور فارغ البالی کے زمانے میں دل شگفتہ اور حسن رنگین رکھتے تھے۔ ہر وقت وہ بہاریں پیشِ نظر رہتی تھیں جن کے سامنے جلوۂ گل بھی گرد ہو جاتا تھا آج زمانہ کچھ ایسا انقلاب ہو رہا ہے کہ اب دل سے جگر تک ایک دریائے خوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جب دل شگفتہ رکھتے تھے اب با خاطرِ پریشاں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ انقلاب زندگی کی کس قدر سچی اور پر اثر تصویر کھینچی ہے۔

باقی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

فرماتے ہیں عشق پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ آدمی اس سے

نجات پا سکے یعنی جب تک دل پہلو میں تھا اُس وقت تک نہ وہ عشق نے دوسرا رنگ دوسرا پہلو اختیار کر رکھا تھا جب سے دل جاتا رہا دل کے جانے کا درد و غم اُسی طرح پہلو میں رہا۔ مطلب یہ ہے جان بچنے کا کوئی پہلو نہ دل کی موجودگی میں تھا نہ دل کے جانے کے بعد نظر آتا ہے۔

احبابِ چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

قاعدہ ہے کہ دیوانہ آدمی کو پاگل خانہ میں مقید رکھ کر اُس کے جنون کا علاج کیا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ دوست آشنا میری وحشت کا کچھ علاج ہی نہ کر سکے۔ وحشت اور دیوانگی سے باز رکھنے کے لئے مجھ کو قید کیا تھا مگر قید خانہ میں بھی میرا خیال اُسی طرح بیاباں نورد رہا جس طرح میں خود قید ہونے سے پیشتر وحشت کے عالم میں جنگل جنگل پڑا پھرتا تھا۔

یہ نعش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

فرماتے ہیں۔ اسد خستہ جاں جب تک زندہ رہا آزادی کے عالم میں رہا۔ قید علائق سے بالکل آزاد تھا مرنے کے بعد اُس کی لاش کا بے کفن ہونا بتا رہا ہے کہ وہ اب بھی گور و کفن کی قید سے آزاد ہے۔ "حق مغفرت کرے" اِس جملۂ دعائیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔

ب
شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

یہ ساری غزل اُس زمانہ کی ہے جب مرزا صاحب پر فارسیت کا رنگ غالب تھا ردیف کے سوا پورے پورے مصرعے فارسی میں ہیں یہاں تک کہ مطلع کے مصرعۂ ثانی میں ردیف کا پہلو بھی فارسی ہے یعنی اہلِ ایران کے ہاں مرغوب آمد محاورہ ہے۔ مگر معنی کے اعتبار سے یہ ایک ایسا اچھوتا مضمون ہے جس کو آج تک کسی شاعر کے خیال نے مس نہیں کیا۔ فرماتے ہیں شمارِ سبحہ میرے بتِ مشکل پسند کو بہت ہی پسند آیا ہے نہ اس لئے کہ وہ بھی تسبیح پر پڑھنا چاہتا ہے بلکہ اس واسطے کہ ایک جھپٹے میں سو دلوں پر قبضہ حاصل کر لینے کی ترکیب

بن جاتی ہے جس طرح زُہاد و عباد و سودائیوں کی تسبیح کو ہمیشہ گردش میں رکھتے ہیں اسی طرح میرا معشوق جو ایک بُت عیار ہے زاہدوں اور عابدوں کی دیکھا دیکھی سودائیوں کو بھی ہتھیا لیتا ہے تسبیح کے دانوں سے ان کا استعارہ کیا ہے تو نہایت قریب الفہم ورنہ بیجا استعارہ ہے۔

بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

یہاں بیدلی کے معنی بھی ناامیدی کے لئے گئے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں ناامیدی کے فیض سے ہمیشہ کی ناکامیابی آسان ہو گئی ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے جب کوئی آدمی کسی کام سے پوری پوری ناامید ہو جاتا ہے تو اس کام کی کامیابی میں جو کاوش اور کاہش دل کو مشغول کی جاتی ہوتی ہے بہت جلد دور کرتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ مطلب ادا کیا گیا ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشائش کو پسند آیا ہے۔ قاعدہ ہے جو شے کسی کو مرغوب خاطر ہوتی ہے اور پسند آتی ہے تو وہ اس کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے امکان بھر اس کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے۔ جب کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آ گیا تو وہ اسے کیوں کھلنے دیگی اور جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا عقدہ دشوار نا کشا ہے تو امید کا خیال ذہن سے اٹھکر ناامیدی کی صورت میں ہمیشہ کی تسکین خاطر حاصل ہو گئی۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوا کے معنی یہاں شوق کے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ قاتل جو سیر گل کے دیکھنے کا شوق رکھتا ہے تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ جیسے باغ کی جو بہار کے واسطے جاتا ہے وہ باغ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے اور رنگ برنگ کے پھول دیکھنے نہیں جاتا بلکہ وہ تو صرف ان پھولوں کو دیکھنے جاتا ہے جو شاخوں سے جھڑ کر زمین پر گر پڑے ہیں اور ہوا کے جھونکوں سے گرد میں رل رہے ہیں۔ وہ ان جھڑے ہوئے پھولوں کو تماشائے قتل سمجھتا ہے اور ان کے دیکھنے سے فرحت و مسرت حاصل ہوتی۔

[illegible] — [illegible]

مرزا صاحب کا پہلودار بیان اس مقطع میں دو معنی پیدا کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے اور مجھ سے ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے گیا تھا وہ وہاں سے تحفہ میں زخم ہیرے کی کنی۔ داغ جگر لیکر واپس آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود عاشق ہو گیا۔ دوسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ حضرت عشق یہ سامانِ خرابی لیکر جناب اسد اللہ خان صاحب غالب کی ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔

[illegible]

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

فرماتے ہیں دنیا میں جو لوگ وفاداری سے کسی کے دل پر نقش وفا قائم کر دیتے ہیں وہ گویا بیکار کام میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس لئے نقش وفا اہل وفا کے لئے موجب تسلی خاطر اور سبب اطمینانِ طبیعت نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اہل دنیا دستور دنیا کے موافق وفا کے صلے میں جفا و ستم کے مستحق قرار دئے جاتے ہیں مرزا صاحب اپنی تسلی خاطر ان لفظوں سے فرماتے ہیں۔ وفا وہ لفظ ہے جس کے کچھ معنی ہی نہیں ہیں گویا وفاداری دنیا میں بیکار بات ہے۔

سبزۂ خط سے ترے کاکلِ سرکش نہ دبا   یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

مشہور ہے کہ زمرد سے سانپ اندھا ہو جایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں تیرے سبزۂ خط سے زلف کا افعی سرکش اندھا نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ خط نکل آنے پر بھی زلفوں کی دلفریبی اور سرکشی میں کچھ فرق نہ آیا۔ سبزۂ خط کو زمرد سے اور کاکل کو سانپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

فرماتے ہیں مر جانے کے بعد غم وفا سے چھٹکارا ہو جاتا لیکن وہ ستمگر میرے مرنے پر رضامند نہ ہوا۔ نزاکت خیال اس شعر میں یہ پیدا کی گئی ہے کہ موت جو ایک بے اختیاری اور ناگزیر امر ہے اس کو اختیاری اور دوست کی مرضی کا تابع ظاہر کیا گیا ہے گو دوست ستمگر ہے وہ عاشق کے

مرنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی موت میری بدنامی کا باعث قرار پائیگی۔ علاوہ ازیں میرے شغلِ ستم میں فرق آجائیگا۔ ورنہ سب سے زیادہ یہ خیال مانع ہے کہ ایسا وفادار دوسرا عاشق مجھکو کہاں ملے گا۔ لفظی او معنوی خوبیوں کی اس شعر میں کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی   گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ اگر سانس راہ منزلِ پرہیزگاری نہ بن سکا تو کچھ غم نہیں۔ میرا دل گزرگاہ جام وشراب تو بن سکتا ہے یعنی جام وشراب کے خیال ہی میں دل کو مست رکھوں گا۔ گر زہد و تقویٰ سے طبیعت کو خوش نہیں کر سکا۔ سرمنزل اور پرہیزگاری کو برابر تصور کیا گیا ہے

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی   گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

مطلب یہ ہے کہ اگر تو نے وصل کا وعدہ نہ کیا تو بھی میری خوشی کا باعث ہے اس سبب سے کہ میرے کان کبھی تسلی کی آواز سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ میرا مقصود وعدۂ وصل ہی تھا لیکن اس لئے کہ میں کبھی شرمندۂ احسان نہ ہوا تھا اپنی ناکامیابی سے خوش ہوں۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ محرومیِ قسمت ہمارے حصہ میں آگئی ہے۔ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہی نہیں ہوتا یہاں تک ہماری قسمت کو ہم سے ضد ہے کہ ہم نے دنیا کے غموں سے تنگ آکر یہ چاہا تھا کہ ہم مر ہی جائیں تو یہ بھی نہ ہوا۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ   ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

حریف بمعنی مدمقابل۔ فرماتے ہیں حضرت عیسےٰ نے ابھی پورا قُم باذن اللہ نہ کہا تھا۔ صرف ہونٹوں کو خفیف سی جنبش ہوئی تھی کہ غالب کا کام تمام ہو گیا۔ یعنی وہ اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ حضرت عیسیٰ کے ہونٹوں کی حرکت کو بھی برداشت نہ کر سکا۔

غزل   ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

طاقِ نسیاں اُس طاق کو کہتے ہیں جس میں کچھ رکھکر بھول جائیں۔ طاقِ نسیاں کا گلدستہ

وہ گلدستہ ہے جس کو طاق نسیاں میں رکھکر بھول گئے ہوں۔ بیخودوں کی بہشت کو طاق نسیاں کے گلدستے سے تشبیہ دینی بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو آجتک کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزری - مطلب یہ ہے کہ زاہد جس باغ جنت کی اس قدر مدح کرتا ہے وہ ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا وہ گلدستہ ہے جس کو ہم نے دل سے اُتار دیا اور بھلا دیا ۔

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

خون کے قطرہ کو مونگے کے دانے سے جو تسبیح میں ڈالا جاتا ہے تشبیہ دی ہے۔ فرماتے ہیں - مژگان یار کی کاوش نے قطرۂ خوں آنسو بنا دیا ہے جنہوں نے مسلسل لڑی دار جمع ہو کر تسبیح مرجاں کی صورت اختیار کرلی ہے۔ مضمون شعر ندرت سے خالی نہیں ہے ۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت رعب۔ نیستان نے کا جنگل۔ نے بانسری کو کہتے ہیں۔ نے نواز بھی محاورہ ہے اور بانسری بجانی بھی بولا جاتا ہے۔ دانتوں میں تنکا لینا اظہار انکسار کرنا۔ ہندوستان میں بھی اس کا عمل درآمد ہے اور خس بدنداں گرفتن فارسی محاورہ بھی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں قاتل کا رعب داب بھی میرے نالوں کو نہ روک سکا۔ اُس کے خوف سے اظہار عجز کے لئے جو تنکا میں نے دانتوں میں دبایا وہ نے بنکر خود بخود بجنے لگا اور اُس سے نالہ کی آواز پیدا ہو گئی ۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

فرماتے ہیں۔ اگر مجھکو زمانہ نے مہلت دی تو میں تم کو سیر دکھاؤنگا میرا ہر ایک داغ دل سرو چراغاں کا بیج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ عشق ابھی دل میں پیدا ہوا ہے وہ گویا تخم ہے سرو چراغاں کا۔ اگر زمانہ کا کوئی انقلاب پیش نہ آیا تو وہ میرے دل سے تھوڑے دنوں میں سرو چراغاں پیدا ہو جائیگا۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

شبنمستاں مرکب ہے شبنم اور ستاں سے۔ شبنم اوس کو کہتے ہیں۔ ستاں وہ مقام جہاں اوس پڑی ہو۔ آئینہ خانہ وہ مکان جس میں دیواروں پر چاروں طرف آئینہ کے ٹکڑے نصب

گئے ہوں۔ یہ شعر ہم ذرہ پر تشبیہ کہہ سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ تیرے جلوہ نے شیش محل کا وہ حال کر دیا ہے جو آفتاب کی گرمی شبنم کا کر دیتی ہے جس طرح شبنم کے قطرے آفتاب کی گرمی سے بکھر جاتے ہیں اسی طرح تیرے جلوے کی گرمی سے آئینے پانی ہو کر بہہ گئے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی   ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تعمیر عمارت، مکان بنانا۔ ہیولیٰ۔ عنصر۔ ہیولا۔ مادہ۔ خونِ گرم۔ سرگرمی۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جسم فانی ہے۔ یعنی میرا وجود میری فنا کی دلیل ہے جس طرح دہقان کی سرگرمی خود اُسکے کھلیان پر بجلی کا کام دیتی ہے اُسی طرح میرے جسم میں فنا ہونے کی قابلیت پوشیدہ رکھدی گئی۔ دوسرا مصرع پہلے مصرعے کی شرح تصور کیا جائے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر   مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

سبزہ سے مراد سبزہ بیگانہ ہے۔ اور سبزہ بیگانہ اُس گھاس کو کہتے ہیں جو برسات کے موسم میں بے موقع مقام پر پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مکان کے ویران ہونے کی یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر گھاس اُگ رہی ہے۔ دربان کا کام بیگانہ آدمی گھر کے اندر نہ آنے دینے کا تھا اب وہ سبزہ بیگانہ کو کھود کھود کر گھر سے باہر نکالتا ہے۔ ویرانی کو خطاب کرکے کہتے اے ویرانی تو یہ سیر تو دیکھ لطف سے خالی نہیں ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں   چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میری خاموشی میں چھپی ہوئی لاکھوں آرزوئیں ہیں۔ گویا میں بے زبان بجھا ہوا چراغ ہوں۔ گورِ غریباں کا۔ چراغ کی لو کو آدمی کی زبان سے تشبیہ دی ہے اور بجھے ہوئے چراغ سے مراد بے زبان آدمی ہے۔ یہ تشبیہ خوں گشتہ آرزوؤں سے مناسبت رکھتی ہے۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے   دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

فرماتے ہیں۔ ابھی تک تھوڑا سا خیالِ یار کا عکس باقی ہے۔ اگرچہ میری افسردہ خاطری نے خیالِ یار کو دل سے نکال دیا ہے لیکن اس ذرا سے پرتو میں بھی اس بلا کا نور ہے کہ میرے دلِ افسردہ

حجرۂ زندانِ یوسف کا گماں ہوتا ہے۔ حجرہ چھوٹی کوٹھری کو کہتے ہیں۔ دل افسردگی سے تنگ آکر حجرہ بن گیا ہے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

تبسم ہائے پنہاں وہ تبسم جس کا تر ہونٹوں پر برائے نام ظاہر ہو۔ فرماتے ہیں خواب میں آکر تبسم پنہاں کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ کسی مقام پر غیر کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں اور میرے جلانے کے واسطے خواب میں آکر چوری سے مسکراتے ہیں۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

فرماتے ہیں کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا یعنی کن کن لوگوں کو بے گناہ قتل کیا ہوگا۔ تیری مژگاں کا آنسوؤں سے تر ہونا قیامت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے اب اُن بے گناہوں کی یاد تجھکو رُلا رہی ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

فرماتے ہیں۔ جادۂ راہِ فنا دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ ہے۔ تمام اوراقِ عالم فنا ہوکر اسی ایک ڈورے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس رشتہ میں تمام اوراقِ عالم بندھے ہوئے ہیں میں اس رشتہ کو بھولا نہیں ہوں یعنی جادۂ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

بہت نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یک بیابان ماندگی۔ بہت تھک جانا۔ ذوق سے مراد یہاں ذوقِ صحرا نوردی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں خواہ کیسا ہی تھک جاؤں میرا شوقِ صحرا نوردی کم نہ ہوگا۔ جس طرح موجِ آب آگے بڑھنے کی غرض سے اُبھرتی ہے۔ اسی طرح میرا نقشِ قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

مطلب یہ ہے۔ پہلے مجھے چمن سے محبت تھی۔ اب نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ بوئے گل جو پیشتر مسرت اور خوشی پیدا کرتی تھی۔ اب اس سے میرا ناک میں دم ہے۔ زمانے کے انقلاب سے محبت نے نفرت کی صورت پیدا کر لی ہے۔

قطعہ
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مطلب یہ ہے کہ سر تا پا مبتلائے عشق بھی ہوں اور اپنی جان کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔ میری مثال ایک آتش پرست کی سی ہے۔ آگ کی پرستش بھی کرتا ہوں اور خرمن کے جل جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ ناگزیرِ الفتِ ہستی کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنے کو عزیز رکھنے پر مجبور ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے میری خلقت میں یہ بات ودیعت رکھ دی ہے کہ اپنی جان کو عزیز رکھوں۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

فرماتے ہیں اے ساقی شراب پلانے میں جس قدر تیرا حوصلہ بڑھا ہوا ہے اسی قدر شراب پینے میں میں بھی عالی ظرف واقع ہوا ہوں یعنی تو اگر دریائے مے ہے تو میں ساحل کی انگڑائی ہوں۔ قاعدہ ہے کہ شراب خوار کو نشہ کے آثار پر انگڑائیاں آنے لگتی ہیں۔ ساحل یعنی دریا کا کنارہ باوجود دریا قریب ہونے کے ہمیشہ تشنہ لب رہا کرتا ہے۔ اس مثال سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ساقی جس قدر دریا دلی سے شراب پلا رہا ہے اسی قدر میں بھی عالی ظرف ہونے کی وجہ سے شراب کا پیاسا ہوں۔

غزل
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فرماتے ہیں راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے۔ ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے اور بج رہے ہیں اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں بے مثل شعر لکھا ہے۔

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

فرماتے ہیں۔ میرا اڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبحِ بہارِ نظارہ ہے اور وہ یہی وقت

تو بے جب اُس کے گلہائے ناز کھلا کرتے ہیں۔ اس لیے معشوق سے خطاب کر کے فرماتے ہیں صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے پھول کھلانے میں مصروف ناز و انداز ہو۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز   میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مژہ ہائے دراز سے یہاں دل میں اُتر جانے والی اور گھر کر لینے والی پلکیں مراد ہیں فرماتے ہیں۔ تو اور غیر کی طرف یہ تیز تیز نگاہیں۔ میں اور دل میں گھر کر لینے والی پلکوں کی تکلیف۔ مطلب یہ ہے تو جو لطف و عنایت کی نگاہیں غیر پر کرتا ہے مجھ کو رشک و حسد پیدا ہوتا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرِ عشق رشک کی برچھیاں میرے دل میں چبھوتا ہے۔

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں   طعمہ ہے ایک ہی نفسِ جانگداز کا

فرماتے ہیں میں جو اپنی آہ کو ضبط کر رہا ہوں۔ اس میں میں نے اپنا فائدہ سمجھ رکھا ہے ورنہ میرا جسم زار میرے ایک ہی نفس جانگداز میں گھل کر آتشِ عشق کی خوراک بن جائے یعنی جس طرح شمع پگھل کر بہہ جاتی ہے۔ میری آہ مجھ کو فنا کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے   ہر گوشۂ بساط ہے۔ سر شیشہ باز کا

شیشہ باز ایک قسم کا بھانمتی ہوتا ہے جو تماشا کرتے وقت شیشے یا بوتل کو اُچھال کر سر و دوش پر روکتا ہے اور ناچنے میں جسم کے ہر حصہ پر اُس کو لے آتا ہے۔ فرماتے ہیں بہار کا موسم آنے سے شراب میں ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ جہاں جہاں فرش کے کونوں پر شراب کے بھرے ہوئے شیشے رکھے ہیں۔ اپنے اپنے مقاموں پر وہ اسی طرح اُچھل رہے ہیں۔ جس طرح بازیگر کے سر و دوش پر جنبش دینے سے شیشہ اُچھلتا ہے، اور پھر اُسی مقام پر قائم ہو جاتا ہے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز   ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

فرماتے ہیں۔ یار کی گرہ بندِ قبا مجھ سے آدھی کھل کر رہ گئی پوری نہ کھل سکی۔ اس جرم

یعنی ہمارے دل میں حسرت کاوش کا تقاضا رہا ہے اور ناخن پر ابھی تک گرہ بند قبا کا قرض باقی ہے مطلب یہ ہے ہم چاہتے ہیں دل کو ان ناخنوں سے کہ جس سے بند قبا پورا نہ کھل سکا تھا کرید کر زخمی کرلیں۔ اس سے زیادہ ان کی کاہلی کا بدلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسدؔ　　　سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

تاراج کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب غنیم کی فوج فتحیاب ہو کر شہر میں داخل ہوتی ہے اور مال اسباب وغیرہ لوٹنے پر دست درازی کرتی ہے۔ اور ساتھ کے ساتھ مکانوں کو بھی ڈھاتی مسمار کرتی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کاوش غم ہجراں نے اے اسد دل پر فتحیاب ہو کر اس کو لوٹ لیا اور برباد کر دیا۔ سینہ میں جو کچھ راز عشق یار و حقیقت کے خزانے چھپے ہوئے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے۔

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا　　　رکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا　　　زن

قلعۂ معلی میں بعض بعض موقعوں پر متواتر مشاعرے ہوا کرتے تھے بالخصوص بہادر شاہ ظل سبحانی بادشاہ کے عہد میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اسی کے متعلق فرماتے ہیں۔ بزم سخن شاہنشاہ میں مشاعروں کا دور دورہ پھر شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ وہ موسم آگیا جس میں جشن و عرسے جاری ہو گئے گویا دفتر سخن کھل گیا۔ دوسرے مصرع میں اس خوشگوار موسم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی اس کان گوہر کے دروازہ کو ہمیشہ کھلا رکھنا۔

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا　　　اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

اس مطلع میں پہلے مضمون کو دوسرے لفظوں میں دہرایا ہے۔ فرماتے ہیں رات ہو گئی بزم سخن منعقد ہونے کا وقت آگیا چمکنے والے ستاروں کا منظر کھل گیا۔ چمکنے والے ستارے سے یہاں اشعار مراد ہیں۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں "اس تکلف سے وہ منظر کھلا ہے کہ گویا بتکدہ کا در کھل گیا یعنی وہ انجم رخشندہ جو اشعار کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے آراستہ پیراستہ ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے ڈھلے ہوئے بت سامنے رکھدئے ہیں۔ جو صنعت

بول رہے ہیں۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

دشنہ چھری کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں ہوں تو دیوانہ لیکن دشمن دوست نما کا فریب نہیں کھاؤں گا۔ آستین میں چھری چھپا کر لایا ہے، اور ہتھیلی میں کھلا ہوا نشتر لے رکھا ہے۔ بظاہر فصد لینی چاہتا ہے جو دیوانہ کا علاج ہے اور دل میں قتل کا ارادہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری دوست باطن میں دشمن ہوا کرتے ہیں۔

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

اس ردیف کو معمولہ کہتے ہیں۔ یہاں کھلنے کے معنی بے تکلف ہو جانے کے ہیں۔ فرماتے ہیں اُس کی پیچیدہ باتیں میں نہیں سمجھ سکتا اور اس کے پوشیدہ راز میں نہیں پا سکتا لیکن میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھ سے وہ پری پیکر بے تکلف تو ہو گیا۔

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

فرماتے ہیں میں خیالِ حُسنِ یار میں ایسا محو ہو گیا ہوں کہ اب اُس کو حسنِ عمل خیال کرتا ہوں، اور اس خیال کرنے کی وجہ یہ واقع ہوئی ہے کہ خلد کی ایک کھڑکی میری قبر کے اندر کھل گئی ہے۔ مطلب یہ ہے معشوقِ حقیقی کے تصورِ کامل نے مجھکو عبادت کا کام دیا ہے اور اسی کے ذریعہ سے میری بخشش ہو گئی ہے بخشش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جنت کا دروازہ قبر میں کھول دیا جائے۔

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منھ پر کھلا

اس شعر کا یہ ٹکڑا "کہ دیکھا ہی نہیں" مرزا صاحب کے حصہ کا ہے۔ معشوقِ حقیقی کا حُسن بے نقاب کس نے دیکھا ہے۔ شعر کی تشریح یہ ہے۔ باوجود اس قدر پردوں کے جو ظہورِ تجلیات تک حائل ہو رہا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اُس کی صفت بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ قاعدہ ہے سیاہ زلفیں گورے اور خوبصورت چہرے پر نقاب بھی معلوم ہوا کرتی ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں

نقاب لفظوں سے بھی بہ مذکر ہونا معلوم ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے زمانۂ قدیم کے موافق نقاب کو مذکر باندھا ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اب دلی والے بالاتفاق نقاب کو مؤنث استعمال کرتے ہیں۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

شعر سیدھا اور صاف ہے معشوق کی تلون مزاجی طبیعت کی شوخی بالخصوص بدگمانی کی تصویر سادے لفظوں میں کھینچ کر دکھائی گئی ہے۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

شب غم کی تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے دل سے سوال پیش ہے کیا سبب ہے رات کیوں اندھیری ہے گویا حواس ایسے بگڑ گئے ہیں کہ دماغ میں سمجھنے کی بھی تو طاقت نہیں ہی ہے۔ پھر خود ہی سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ بلاؤں کا نزول ہے یعنی مجھ پر شب فراق میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدۂ اختر اس کے تماشائی ہیں۔ اسلئے تاروں نے اپنا منھ آسمان کی طرف کر لیا ہے۔ اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے آتے ہوئے دیکھ سکتا تو شاید کچھ اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ اب یہ بات تو خیال میں آگئی کہ یہ شب غم ہے اس لئے اندھیری ہے مگر نزولِ بلا سے بچنے کی تدبیر اندھیرا گھُپ ہونے کے سبب سے کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

فرماتے ہیں میں وطن کی تکلیفوں سے بچکر پردیس میں رہتا مگر مسافرت میں بھی حادثوں کی یہ کثرت ہے کہ جو خط نامہ بر وطن سے لاتا ہے وہ کھلا ہوا ہوتا ہے یعنی کسی نہ کسی عزیز کی خبر مرگ درج ہوتی ہے جس صورت میں یہاں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی رسم ہے کہ جس خط میں کسی کی موت کا واقعہ تحریر کیا جاتا ہے اس خط کا ایک کنارہ بھی کتر لیتے ہیں اور لفافہ بھی نیم وا رکھتے ہیں۔

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

یہ مقطع نعتیہ ہے۔ شب معراج کا واقعہ کس خوبصورتی سے کیسے مختصر جملے میں ادا ہو گیا ہے یعنی گنبد بے در کا کھلنا بتا رہا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔

(غزل قطعہ بند)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا   شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو میرے سوزِ دل کی بجلی سے ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا اور جو بھنور اُس میں پڑتا تھا۔ وہ ایک شعلۂ جوّالہ بن گیا تھا۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام   گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

وہاں تو اس کو مینہ برسنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ وصل کا وعدہ کیونکر ایفا ہو سکتا تھا اور یہاں اُس کے انتظار میں یہ حال تھا کہ روتے روتے تکیہ کی روئی گویا پانی کا جھاگ بن گئی تھی۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال   یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

وہاں تو اُس کی خود آرائی بناؤ سنگھار کیلئے موتی پرو رہی تھی اور اس مصروفیت میں وعدہ بھی فراموش ہو گیا تھا۔ یہاں یہ حال تھا کہ انتظار میں روتے روتے یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ آنسوؤں کی کثرت نے تارِ نظر کو بھی گم کر دیا تھا۔ مدعا یہ ہے کہ معشوق چاہتا تھا کہ ظاہری آرائش میں کوئی کسر اور کمی نہ رہ جائے اور عاشق کا شوق اس بات کا متقاضی تھا کہ وصل کی گھڑی جلد آجائے خود آرائی اور بیتابیِ شوق کی تصویر اس سے بہتر لفظوں میں کھنچ نہیں سکتی۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو   یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

وہاں تو اس کثرت سے پھول کھلے ہوئے تھے کہ ان کے عکس سے نہر کے پانی میں چراغ روشن نظر آتے تھے اور یہاں خون کے آنسو ندی کی طرح آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو   واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

فرماتے ہیں۔ میرا سرِ شوریدہ جس میں عشق و محبت کا جوش بھرا ہوا تھا۔ فرقت کی

بیتابی اور بیخوابی سے دیوار ڈھونڈھ رہا تھا (مرزا صاحب دیوار سے سر پھوڑ کر مر جانے کی تکلیف کو فرقت میں جاگنے کی ایذا پر ترجیح دیتے ہیں) دوسرے مصرع میں مقابلہ اپنی حالت کے معشوق کی حالت پر رشک کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہاں وہ فرقِ ناز کمخواب کے تکیوں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ آرام سے سوتا تھا اور میں سر پھوڑنے کی جستجو میں تھا۔

یاں نفَس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرماتے ہیں۔ یہاں ہماری گرم آہیں شمع کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔ سینہ سے سانس کے ساتھ شعلے نکل رہے تھے اور وہ شعلے ہماری بیخودی عشق میں اضافہ کرتے جاتے تھے۔ وہاں فرش پر پھولوں کا بچھونا ہو رہا تھا۔ اس پر صحبت احباب گرم تھی یعنی رقیبوں سے بیٹھے بیٹھے ہنس بول رہے تھے۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اس شعر میں ترتیب بدل دی ہے۔ پہلے مصرع میں معشوق کی حالت دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ زمین سے آسمان تک وہاں خوشی کی سرور کا ایک طوفان بپا تھا (کثرت کیلئے طوفان کا لفظ استعمال کیا ہے) یہاں زمین سے آسمان تک ہمارے جلنے کے لئے آگ بھڑک رہی تھی یعنی حسرت۔ افسوس۔ رشک رقیب۔ جوش محبت اضطراب دل یہ ساری چیزیں ہم کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ اپنی اور معشوق کی حالت کا تقابل مطلع سے مقطع تک جس حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے اس کا لطف اہل مذاق اٹھا سکتے ہیں۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

یہ شعر گریز کا ہے۔ اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ ناگہاں یعنی یکایک اس طرح سے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ دوسری غزل اسی زمین میں کہنی چاہیئے۔ اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا وہ دل

جو کاوشِ ناخن سے لذت یاب ہو چکا تھا۔

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
غزل

سپند۔ کالا دانہ جو اکثر بچوں پر سے نظر اُتارنے کی غرض سے جلا کر اُس کی دھونی دیتے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ رات کو نالۂ دل میں مطلق اثر نہ تھا۔ ہمارا دوست بزمِ غیر میں تھا اور وہ نالہ جو نہایت بیتاب تھا اور اپنے اضطراب کی وجہ سے بار بار زبان پر آ جاتا تھا بزمِ غیر کیلئے کالا دانہ بن گیا تھا یعنی بزمِ غیر کو نظرِ بد سے بچا رہا تھا۔ نالہ کی بے اثری بالکل اچھوتے خیال کے ساتھ نئے الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مطلب یہ ہے۔ سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی نشاط انگیز ہے شاید میرا گھر صدائے آب سے ساز کا ہمسر ہو گیا تھا۔ ساز سے یہاں جلترنگ مراد ہے جو چینی کے سات پیالوں میں پانی بھر کر ایک چھوٹی نے کے ذریعہ سے بجایا جاتا ہے۔

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

سنجاب کا پوستین بنا کر پہنا جاتا ہے۔ اس پوستین کو بھی سنجاب کہتے ہیں۔ خاکی رنگ کا ہوتا ہے فرماتے ہیں میں جس زمانہ میں خاک نشین تھا اُس زمانہ کے غرور و تکبر کا کیا حال بیان کروں، اپنے خیال میں ایسا سمجھتا تھا گویا مسندِ سنجاب پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ قناعت اور گوشہ نشینی بھی بہت کم کبر و غرور سے خالی ہوتی ہے۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

کچھ نہ کی یعنی اچھی بات نہ کی۔ ہماری خواری کر دی۔ جنونِ نارسا سے یہاں مراد عشقِ ناقص ہے فرماتے ہیں عشقِ ناقص نے ہم کو جلوۂ دوست سے فیضیاب نہ ہونے دیا ورنہ یہاں جیسی دنیا میں تو ایک ایک خاک کا ذرہ خورشیدِ عالمتاب بنا ہوا تھا۔ افسوس جبکہ اکتسابِ فیض سے محروم رہے اور تجلیاتِ نورِ الٰہی نہ دیکھ سکے۔

قطعہ

[illegible] آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

فرماتے ہیں۔ یہ آج نئی بات کیا ہے کہ تو اپنے اسیروں سے بے پروا ہو گیا۔ کل تک تو تیرا دل وفا اور محبت کا دروازہ بنا ہوا تھا۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

فرماتے ہیں۔ وہ دن بھی تجھ کو یاد ہے کہ تیرے جال کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں دیدۂ بے خواب بنا ہوا تھا۔ حلقۂ دام کی تشبیہ دیدۂ بے خواب سے (جو نیند نہ آنے کی وجہ سے ہر وقت کھلا رہتا ہے) کس قدر بلیغ واقع ہوئی ہے۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے اُس کے سیلِ گریہ سے گردوں کفِ سیلاب تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو میں نے غالب کو رونے سے روک لیا۔ ورنہ تم تماشا دیکھتے کہ اُس کا سیلِ گریہ آسمان تک پہنچکر آسمان کو ایک پانی کا بُلبلا بنا دیتا۔

غزل ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے۔ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھی۔ اور اس لئے اُس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔ (از یادگارِ غالب)

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

فرماتے ہیں تو نے آئینہ اس حالت میں توڑا ہے کہ جب تو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا اور تیرا عکس اس میں نظر آ رہا تھا تو آئینہ میرا بنا تماشائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت سمجھ کر تجھکو دیکھ رہا تھا میرے دل میں سینکڑوں آرزوئیں ہزاروں تمنائیں لاکھوں خواہشیں جوش مار رہی تھیں تیرے غرورِ حسن نے یہ گوارا نہ کیا کہ تو اپنا ثانی آئینہ میں دیکھے۔ تو نے آئینہ توڑ ڈالا اور اس کے ٹوٹ جانے

سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ گویا آرزوؤں کا ایک آباد شہر تیرے آئینہ توڑ ڈالنے سے برباد ہوگیا۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

فرماتے ہیں میں نے رہگزر معشوق کی آرزو میں جان دی ہے۔ میرے اس بے مثل انجام کا انعام مجھکو یہ ملنا چاہیے کہ لوگ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھریں۔ نزاکت و لطافت معانی اس شعر میں یہ رکھی گئی ہے کہ معشوق کی اس گلی کا پتہ نہیں دیا گیا جس کی آرزو میں جان دی گئی ہے صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرو اور دل میں یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ میری نعش کو معشوق کی گلی میں بھی لے جائیں گے۔ یوں دلی مدعا حاصل ہو جائیگا۔ یہ ندرتِ معانی غالب ہی کے شعر میں پیدا ہوا کرتی ہے۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

فرماتے ہیں۔ دشتِ وفا کا کیا حال مجھ سے پوچھتے ہو میں کیا بیان کروں خیر اتنا بتا دیتا ہوں دشتِ وفا موجِ سراب کی طرح دھوکا دینے والا ہے۔ جس طرح موجِ سراب پانی کا دھوکا دیکر طالبِ آب کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اسی طرح دشتِ وفا میں خیالی امید کے علاوہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی اس کی مثال یہ پیش کی گئی کہ صحرائے وفا کی خاک کا ذرہ جوہرِ تیغ کی مانند آبدار ہے۔ ۔ مدعا یہ ہے کہ وفاداری انجام میں عاشق کی جان لے لیتی ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

فرماتے ہیں۔ ناتجربہ کاری سے اوروں کی طرح ہم بھی غمِ عشق کو کم سمجھا کرتے تھے۔ مگر جب اس بلا میں پھنس گئے تو حقیقتِ حال سے خبردار ہوئے یعنی غمِ عشق کم ہونے پر بھی ساری دنیا کے غم سے کچھ زیادہ ہی نکلا۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا [illegible]

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل چھوتا

خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اُس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا (از یادگارِ غالب)

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

فرماتے ہیں۔ میرا گریہ چاہتا ہے کہ میرا گھر ڈھے جائے۔ گھر کے در و دیوار سے صحرا نمایاں ہوتا ہے یعنی ظاہر ہوتا ہے کہ اب یہ گھر کثرتِ آبِ گریہ سے گر کر بیابان بن جائیگا۔ گریہ کی رعایت سے ٹپکنے کا لفظ بے اختیار مرزا صاحب کے قلمِ گوہر بار سے ٹپک گیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

فرماتے ہیں۔ دیوانگیٔ شوق یعنی کثرتِ شوق نے مجھ کو ایسا خود رفتہ بنا دیا ہے کہ میں بار بار معشوقِ حقیقی کا مشتاقِ جمال ہو کر اپنی خودی سے گزر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہو کر سوچتا رہ جاتا ہوں کہ میں کہاں اور اس کا دیدار کہاں۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

فرماتے ہیں جلوۂ یار بار بار یہی کہتا ہے کہ مجھے دیکھ۔ آئینۂ فولادی کا جوہر مژگاں بنا چاہتا ہے اس لئے کہ آئینہ کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس بیان میں مرزا صاحب نے جو خوبی رکھی ہے وہ آئینہ سے زیادہ روشن ہے۔

عشرتِ قتلگہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

فرماتے ہیں قتلگاہ میں اہلِ تمنا کی خوشی کا حال نہ پوچھ شمشیرِ یار کا عریاں ہونا شہادت طلب لوگوں کے لئے عیدِ نظارہ ہے۔ شمشیر کو ہلال سے تشبیہ دی جاتی ہے، اور رمضان المبارک کا چاند دیکھکر تلوار دیکھا کرتے ہیں یہاں شمشیر کا دیکھنا ہلالِ عید دیکھنے کے مقابل کہا گیا ہے۔ اور یہ معنی شعر کے الفاظ سے بغیر فکر و غور کے نکل آتے ہیں۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا

فرماتے ہیں۔ ہم تو داغ تمنائے نشاط قبر میں لے چلے اب تو ہو اور تنہائی کے عالم میں تجھکو سو سو طرح سے باغ کی مانند پھلنا پھولنا نصیب ہو۔

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

یہ شعر دو لخت ہے اور دو لخت شعر میں اکثر فعل محذوف ہوتا ہے۔ اس خوبی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا کانٹے کی تول تُلا ہونا مرزا ہی جیسے کامل فن کا کام ہے۔ معنی شعر کے یہ ہیں۔ دل کے ایک ایک پارچہ کا زخم تمنا کھانا باعث عشرت و شادمانی ہے اور زخم جگر کا نمکدان میں سرتاپا ڈوبا ہوا ہونا لذتِ عشق حاصل کرنے کی دلیل ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرعہ میں طنزاً بطور استعارہ کے دیر پشیماں کی جگہ زود پشیماں کہا گیا ہے۔ یہ ویسا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں اَنْذِرْھُمْ کی جگہ بَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْم کہا گیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ میرے قتل کے بعد اُس نے جفا و ظلم سے توبہ کر لی۔ ہائے اُس جلد پشیماں ہو جانے والے کا پشیمان ہو جانا یعنی زندگی بھر تو اپنے ظلم سے پشیمان نہ ہوا اور قتل کے بعد جب کام قبضہ اختیار سے باہر ہو گیا تو پشیمان ہوا۔ اس زود پشیماں کے لفظ کا مزا بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ وجدانی کیفیت ہے تحریر میں نہیں آ سکتی۔ اہل مذاق ہی کچھ اس کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ایسے بلند شعر کے بعد ایسا عالی رتبہ مقطع کہنا حضرت غالب ہی کا کام تھا۔ عالم وحشت میں جنون کے ہاتھ سے گریبان دھجیاں ہوتا ہے۔ ہجر میں خود عاشق اپنے گریبان کا ایک ایک تار الگ کرتا ہے۔ وصل میں معشوق کی دست درازیاں گریبان عاشق کے پرزے اُڑاتی ہیں اور پھر وہ گریبان کا کپڑا کتنا ہے صرف چار گرہ۔ اس تخصیص کو تو دیکھئے۔

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

فرماتے ہیں۔ رات کو شوق ساقی نے طول کھینچ کر خمار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خمار نشہ کے

آثار کی حالت کو کہتے ہیں "رستخیز اندازہ تھا" یعنی قیامت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس طرح قیامت کے دن مردے قبروں سے اُٹھیں گے اسی طرح جو چیز جہاں رکھی ہوئی تھی وہ بلند ہونی شروع ہو گئی یہاں تک کہ شراب کا احاطہ یعنی جس ظرف میں شراب رکھی ہوئی تھی وہ بھی انگڑائی کی طرح اپنے مقام سے اُبھرتا معلوم ہوتا تھا۔ قاعدہ ہے شراب خوار کو نشہ کے آثار کے وقت جماہی اور انگڑائی آتی ہے۔ انگڑائی میں ہاتھ بلند ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں اور یہی شکل رستخیز کی ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری طرح انتظار ساقی میں شیشہ کے اندر شراب کو بھی انگڑائیاں آنے لگی تھیں۔ شراب میں جوش آ جانے کو انگڑائی سے تشبیہ دی ہے۔ جو مرزا صاحب کے تخیل کی بلند پروازی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

فرماتے ہیں۔ ابھی میں نے ایک ہی قدم وحشت میں بڑھایا تھا کہ دفترِ امکان کا سبق میرے سامنے آ گیا اور مجھ کو معلوم ہو گیا کہ جادۂ دشت دو عالم کے اجزا کا شیرازہ تھا یعنی دونوں جہان کی کیفیت مجھ پر منکشف ہو گئی۔

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

یہ مشہور ہے کہ لیلیٰ کئی بار کششِ محبتِ قیس سے مجبور ہو کر سواری محمل دشتِ مجنوں میں گئی ہے اور بخوفِ غمازی ساربان یا بپاس عصمت مجنوں سے مل نہ سکی۔ اس کے قریب ہو کر گزر گئی۔ مرزا صاحب اس قصہ کی طرف کنایۃً اشارہ کرنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ "خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا" یعنی لیلیٰ کا روکنے والا وہاں کوئی دربان نہ تھا پھر کیا سبب مانع ہوا کہ لیلیٰ باوجود کششِ عشق کے مجنوں تک نہ پہنچ سکی۔

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن   دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

فرماتے ہیں جو لوگ حسنِ معشوق کو بناؤ سنگھار سے مستغنی بتاتے ہیں وہ گویا حُسن کے استغنا کو رسوا اور بدنام کرتے ہیں۔ دستِ معشوق مہندی کا منت پذیر ہے اور رخسارِ معشوق غازہ کا گرو

سے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کو حنا کی اور رخسار کو غازہ کی احتیاج ہے اور یہ دونوں چیزیں باعث آرائشِ حسن ہیں۔

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد   یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنے کمالِ شاعری کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں کہ میرے دل کے ٹکڑے یعنی میرے عالی مضامین جو نالۂ دل کی صورت میں بے اختیار میری زبان سے نکل گئے تھے۔ اُن کو میرے جوشِ طبیعت نے اوراقِ دل بنا کر ہوا پہ اُڑا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کرکے دیکھا تو "یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا" یہ اشارہ اُس اُردو دیوان کی طرف ہے۔ اسی مضمون کو فارسی میں بھی ادا کیا ہے۔ وہ یہ ہے ؎

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا   زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا   غزل

فرماتے ہیں۔ دوست میری غمخواری میں کیا کوشش و سعی کرینگے (لفظ کیا) سے سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور اس میں مرزا صاحب نے لطف یہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو سمجھ کر ان سے سوال کیا ہے اور پھر اس سمجھے ہوئے معاملہ کو دوسرے مصرع میں خود ہی ظاہر کر دیا ہے یعنی "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا" اس مطلب کو اس خوبی کے ساتھ بیان کرنا کہ دوست غمخواری میں اس سے زیادہ کیا کوشش کرینگے کہ میرے ناخن کاٹ ڈالیں گے۔ میں زخم کو دیوانگی کی حالت میں جو ناخن سے کریدتا رہتا ہوں اور اچھا نہیں ہونے دیتا۔ ناخن کٹ جانے کے بعد زخم کے جلد اچھا ہو جانے کی امید کی جاتی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے مقابلہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب تک زخم مندمل ہوگا میرے کٹے ہوئے ناخن بھی بڑھ جائینگے۔ اور اُن کی ساری کوشش دم بھر میں بیکار ہو جائیگی۔ اس لئے کہ میں زخم کو پھر گہرا کر لوں گا۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک   ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

معشوق سے خطاب کرکے فرماتے ہیں۔ بندہ پرور آپ کی بے نیازی حد سے گزر گئی۔ کب تلک

یہی حالت رہیگی کہ ہم اپنا حالِ دل عرض کرینگے اور آپ بے پروائی سے "کیا" فرمادینگے یعنی کیا کہا ہم نے نہیں سُنا۔ دوسرا پہلو لفظ "کیا" سے طنز کا نکلتا ہے یعنی جو کچھ تو نے کہا وہ جھوٹ کہا اِس شعر میں "کیا" کا ایک پہلو استفساریہ ہے اور دوسرا پہلو طنزیہ۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدۂ دل فرشِ راہ   کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

اِس شعر سے مرزا صاحب کی شوخیٔ طبع جوان کا خاص مقتضائے طبیعت ہے ظاہر ہوتی ہے یعنی ایک مصرع میں حضرتِ ناصح کی یہ وقعت و عزت ظاہر کیجاتی ہے کہ اُنکی تشریف آوری کے وقت دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں اور دوسرے مصرع میں اُن کی فہمائش کو اِس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکتے ہیں۔ اُن کی ہستی کیا ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

یعنی قتل کرنے میں سب سے بڑا عذر یہی ہوسکتا ہے کہ ہمارے پاس اِس وقت تلوار نہیں ہے اِس عذر کو میں نے پہلے ہی سے مٹا دیا ہے کہ میں خود تلوار باندھکر جاتا ہوں اور کفن بھی ساتھ باندھ لیا ہے۔ کفن ساتھ باندھ لینے سے شعر میں یہ لطف پیدا ہوگیا کہ مجھ سے بڑھکر اور کون سرفروش ہوسکتا ہے کہ میں کفن باندھکر آیا ہوں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی   یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خوبی اِس شعر میں یہ ہے کہ ناصح کو قید کرنیوالا بتایا ہے۔ حالانکہ ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ ترکِ عشق کی نصیحت کیا کرتا ہے۔ بار بار سمجھانے اور مجبور کرکے اپنے پاس بٹھانے کو مرزا صاحب قید کرنے سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ نہیں سکتے۔ ہم ناصح کے سامنے بھی اپنے خیالات میں مستغرق رہتے ہیں۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگینگے کیوں   ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

شعر دو لخت ہے دونوں مصرعے برابر کے واقع ہوئے ہیں۔ مطلب صاف ہے زنجیر سے اسلئے نہیں بھاگ سکتے کہ خانہ زادِ زلف ہیں اور زنداں سے یوں نہیں گھبرا سکتے کہ گرفتارِ وفا ہیں

پہلے ہی سے زنجیرِ زلف اور طوقِ وفا دست و گردن میں آویزاں ہے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا؟

فرماتے ہیں۔ ہماری غذا تو غمِ الفت ہے۔ اور غمِ الفت اُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب انسان کسی پر عاشق ہو جائے۔ دلی میں غمِ الفت کا قحط ہے یعنی یہاں اب ایسے معشوق نہیں ہیں جن سے الفت کی جائے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا ب

مرنے پر اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہماری قسمت میں وصالِ یار لکھا ہی نہیں ہے۔ اور اگر اور بھی زندہ رہتے تو بھی یہی انتظار رہتا جو اب تک رہا۔ انتظار اس لئے رہا کہ دلِ عاشق کبھی وصلِ معشوق سے نا امید ہوتا ہی نہیں۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ تو جو ہم کو یہ الزام دیتا ہے کہ وعدۂ وصل سُنکر تجھکو مر جانا چاہئے تھا یہ ٹھیک ہے۔ مگر ہمارا زندہ رہنا اس وجہ سے ہوا کہ ہم نے تیرے وعدہ کو غلط سمجھا۔ اگر ہمیں اعتبار ہوتا تو ضرور شادی مرگ ہو جاتے۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

فرماتے ہیں۔ تیری نزاکت مانعِ عہد شکنی ہے۔ اس نزاکت پر جو تو نے عہد توڑا تو ہم کو معلوم ہو گیا کہ عہد بودا بندھا تھا۔ اگر مضبوط بندھتا تو تجھ سے نہ ٹوٹ سکتا۔ کس خوبی سے معشوق کو الزامِ عہد شکنی سے بری کیا ہے اور اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تیرِ نیم کش وہ تیر جس کے چھوڑتے وقت کمان پوری نہ کھینچی گئی ہو۔ معشوق تیر جگر میں اُلجھا ہوا دیکھکر شرماتا اور خجل ہوتا ہے۔ اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ کیوں میرا تیر اس کے جگر سے پار نہ ہوا۔ مرزا صاحب اُس کی شرمندگی کو ان لفظوں سے مٹاتے ہیں کہ "تیرے تیرِ نیم کش کو

کوئی میرے دل سے پوچھے "قاعدہ ہے تیر کے زخم میں رہ جانے سے بہ نسبت اسکے پار ہو جانے کے زخمی کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور معشوق اسی واسطے تیر یہ تلوار کا وار کرتا ہے کہ عاشق کو زیادہ ایذا پہنچے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

دوستوں کی شکایت میں فرماتے ہیں۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ ہر دوست ناصح بنکر ترک عشق کی فہمائش کرتا ہے۔ اگر دوستی کا دعوے تھا تو میرے دردِ عشق کا علاج کیا ہوتا اور دفع غم کی تدبیر سوچی ہوتی۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

فرماتے ہیں۔ تم جس کو غم سمجھتے ہو یہ اگر شرار ہوتا تو پتھر کی رگوں سے بھی اس طرح لہو جاری ہو جاتا کہ پھر کبھی نہ تھم سکتا۔ مگر وہ شرر نہیں بلکہ شرر سے زیادہ جلانے والی شے ہے اُس کو انسان ہی برداشت کر سکتا ہے پتھر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس تکلیف کو سہہ سکتا۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اول مصرعہ کا دوسرا حصہ "پہ کہاں بچیں کہ دل ہے" یہ ثابت کرتا ہے کہ دل موردِ آفات اور مخزنِ رنج و آلام پیدا کیا گیا ہے یعنی دل کیلئے غم کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اگر غمِ عشق نہ ہوتا تو غمِ روزگار ہوتا غمِ عشق میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ جانگسل بھی ثابت ہوا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے   مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

فرماتے ہیں۔ شبِ غم کی کیا حقیقت بیان کروں۔ وہ موت سے زیادہ تکلیف دینے والی بلا ہے مرنا جس کو زمانہ میں کوئی انسان پسند نہیں کرتا ساری دنیا جس سے گھبراتی اور ڈرتی ہے اس تکلیفِ شبِ غم کے مقابلہ میں میرے لئے وہ بھی اچھا تھا۔ شبِ غم میں تو ہزاروں بار مجھے مرنا پڑتا ہے موت کی ایذا اٹھاتا ہوں اور پھر نہیں مرتا۔ شبِ غم کو موت پر کئی ہی سے ترجیح دی ہے۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا   نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

فرماتے ہیں ہم مرنے کے بعد ستم بے وجود ہی رہے۔ اگر ہم غرقِ دریا ہو جاتے تو نہ ہمارا جنازہ اُٹھتا نہ مزار کا نشان باقی رہتا۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

معشوقِ حقیقی کی یکتائی کا ثبوت مرزا صاحب نے اُسکے دوچار نہ ہونے سے دیا ہے یعنی اگر یکتا نہ ہوتا اور دوئی کی ذرا سی بھی جھلک ہوتی تو ضرور کہیں نہ کہیں نظر آجاتا۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ دونوں باتیں مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ایک اسلوبِ بیان دوسرے تصوف کا رنگ۔ حضرت اُستادی مولانا حالی مرحوم نے یادگارِ غالب میں اس مقطع پر یہ لطیفہ تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت یہ غزل بادشاہ کو سُنائی تو بادشاہ نے مقطع سُن کر کہا بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے مرزا صاحب نے فرمایا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

غزل

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہاں نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کام کرنے کی اُمنگ جو دلوں میں پیدا ہوگئی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ دنیا میں رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے اگر مرنا نہ ہوتا تو جینے کا کچھ مزا نہ تھا۔ زمانہ کی چہل پہل کا محرک یہی خیال ہے کہ موت سر پہ کھڑی ہوئی ہے جو کچھ کرنا ہے جلد انجام دے لو۔ قاعدہ ہے جس قدر فرصت زیادہ ہوتی ہے آدمی اُتنا ہی تساہل سے کام انجام دیتا ہے بے مثل مطلع لکھا ہے۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

فرماتے ہیں جب دیکھو تم تجاہل کو کام میں لاتے ہو۔ آخر تمہارا دلی منشا کیا ہے یعنی ہر بات پر تم "کیا" کہہ دیتے ہو۔ کوئی بات سنتے اور سمجھتے ہی نہیں ہو۔

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

یعنی رقیب پر تمہاری رعائتیں بے محل دیکھتا ہوں۔ اور جب محبت بھرے الفاظ میں تم سے اس کا گلہ کرتا ہوں تو تم مجھ سے اُلٹی شکایت کرنے لگتے ہو۔ یہ کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

نگاہِ بے محابا۔ بے تکلف اور بے حجاب ہو کر دیکھنا۔ فرماتے ہیں۔ مجھ سے آنکھیں چار کرو۔ میں تمہاری نگاہ کی تاب نہ لاکر تڑپ جاؤں گا۔ تم تغافل سے میرے صبر و استقلال کو کیوں آزماتے ہو۔ میں بے رخی سے گھبرانے اور بے قرار ہونے والا نہیں ہوں۔

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

فرماتے ہیں۔ رقیب کی جھوٹی محبت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے شعلۂ خس دم بھر میں روشنی دیکر بجھ جاتا ہے۔ رقیب کو ناموسِ وفا کا پاس خاک بھی نہیں ہے۔ اسکی محبت چار دن کی چاندنی ہے ہمیشہ قائم نہیں رہے گی۔ عشقِ ناقص کو شعلۂ خس سے تشبیہ دینی ایک نیا ہی اچھوتا خیال ہے جیسا مرزا صاحب کا اکثر کلام۔

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو مستِ الست ہیں۔ ہمارا ہر سانس ایک موجِ بیخودی ہے۔ ہمیں نہ ساقی کی ضرورت نہ شراب کی احتیاج۔ ہم کیوں تغافلِ ساقی کا گلہ کریں۔ دوسرے معنی اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اپنے حال میں مست ہیں ہمیں دنیا کے ہست و نیست کا کیا غم۔

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

فرماتے ہیں۔ ہم تو بوئے یار کے سونگھنے والے ہیں۔ ہمارا دماغ عطرِ پیراہنِ یار کی خوشبو جس پر غیروں نے عطر ملا ہے پسند نہیں کرتا۔ صبا اگر رقیب کے کوچے سے عطرِ پیراہن کی خوشبو لیکر آتی ہے تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بتا رہا ہے کہ صبا کوچہ رقیب سے ہوکر آئی ہے۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

فرماتے ہیں۔ قطرہ جو ایک جزوِ ضعیف دریا کا ہے جب اس کے دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ

میں دریا ہوں اور وہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے تو ہمارا کیا پوچھنا ہے ۔ ہم تو اپنے مبدء کے ساتھ عینیت کا دعویٰ رکھتے ہیں ۔ یعنی ہم تو قطرہ کے مقابلے میں ایک انسان کا جسم ہیں ۔ ہمارا سراپا تو اُسکی ذات کا ایک بڑا حصہ ہے ۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

فرماتے ہیں شہیدانِ نگاہ کا خون بہا لیا جانا دستور کے خلاف ہے ۔ پھر تو کیوں ڈرتا ہے بے خوف ہو کر میری طرف دیکھ اگر میں مر جاؤں گا تو اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ تجھ سے میرے قتل کی باز پرس نہ ہوگی جس خوبی اور ندرت کے ساتھ مرزا صاحب نے اس مضمون کو ادا کیا ہے وہ ظاہر ہے ۔

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن　　　شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

فرماتے ہیں جنسِ وفا جو میرے دل میں تھی وہ گویا قیمتِ دل تھی ۔ یعنی میرا دل اسی وجہ سے قیمتی سمجھا جاتا تھا کہ اُس میں جنسِ وفا تھی تو نے دل کو توڑ کر سکوت غارت کر دیا تو اب تو میری سُن اور مکرر کہتا ہوں کہ میری بات سُن شکستِ دل کی صدا نالہ ہوا کرتا ہے جس سے تو ڈرتا ہے اور سننا نہیں چاہتا ۔ تو خوف نہ کر تو نے دل نہیں توڑا بلکہ قیمتِ دل توڑی ہے ۔ قیمتِ دل کی شکستگی میں کوئی صدا پیدا نہیں ہو سکتی ۔ اس صورت میں تجھے ڈرنا نہ چاہیے ۔

کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ　　　شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

فرماتے ہیں ۔ تو جو ستم یا تغافل یا تکلیفِ فراق سے مجھے تڑپانا اور بے چین کرنا چاہتا ہے میں نے کب تجھ سے جگرداری یعنی بہادری اور مضبوطی کا دعوےٰ کیا ہے ۔ بھلا دلِ عاشق کا صبر ہی کیا ایک ذرا سے ناز و انداز میں تو اُسکو بے صبر بنا سکتا ہے ۔

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں　　　یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

قاتل وعدۂ صبر آزما کی صفت ہے ۔ اور کافر فتنۂ طاقت رُبا کی ۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے وعدۂ صبر آزما کیوں کیا جاتا ہے اور اسی پہلے مصرعہ کا مضمون دوسرے مصرعے میں دوسرے لفظوں کے ساتھ

اُلٹ دیا ہے بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

اس مقطع میں مرزا صاحب نے کیا کو حرفِ علت قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ اے غالبؔ اس کی ہر ایک بات جاں ستاں ہے۔ خواہ عبارت ہو۔ خواہ اشارت و ادا ہو۔ جان لینے میں یہ سب کی سب مساوات کا درجہ رکھتی ہیں۔

غزل

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

درخور۔ فارسی محاورہ ہے یعنی لائق و سزاوار استعمال ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آپ غیر پر تو ظلم و ستم کرتے ہی نہیں قہر و غضب کے لئے ہم ہی مخصوص ہو گئے ہیں۔ پھر اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم سا کوئی دوسرا آپ کا چاہنے والا پیدا نہیں ہوا تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آپ ہمارے قول کو کیوں نہیں تسلیم کر لیتے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

خود بیں و خود پسند یہ دونوں لفظ ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ یعنی دوسرے کو اپنے سے کم سمجھنا۔ مگر یہاں مرزا صاحب نے خود بیں کے معنی خودداری کے لئے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عبادتِ الٰہی میں بھی اپنے کو ایسا لئے دئے رکھتے ہیں کہ اگر ہم کو درِ کعبہ کھلا ہوا نہیں ملتا تو کنڈی کھٹکھٹا کر دروازہ کھلوانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے واپس چلے آتے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ مرزا صاحب زندگی میں خودداری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

یعنی تیرا مدِ مقابل کوئی نہ بن سکا۔ دعوے متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

چشمِ معشوق کو نرگسِ بیمار اور چشمِ بیمار کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میں بھی تیرے عشق کا بیمار ہوں۔ اس لئے مجھے بھی ہمنامی کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔ اگر میں اچھا نہ ہوا تو اس میں برائی کی کیا بات ہے۔ تیری

آنکھ کا ہمنام مشہور ہو جاؤں گا۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا   خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ نالہ جو بے اثری اور نارسائی کی وجہ سے لب تک نہیں آیا ہے میرے سینے کا داغ بن کر رہ گیا ہے یعنی اس نے میرے جوشِ عشق کو دھبہ لگا دیا۔ اسکی تمثیل پیش کرتے ہیں کہ جس قطرہ میں دریا بننے کی قابلیت نہیں ہوتی وہ خاک میں جذب ہو کر رہ جایا کرتا ہے۔

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا   کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ وہ ایذائے محبت جو کسی کو نہ ملی میرے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور وہ فتنۂ قیامت جو کبھی برپا نہ ہوا میرے کام میں مصروف ہے یعنی میرے واسطے تکلیفیں اور مصیبتیں جمع کر رہا ہے۔

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب   حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

فرماتے ہیں جس طرح داستان گو امیر حمزہ کی داستان بیان کرتا ہے اور سننے والے خوشی کے ساتھ سنتے رہتے ہیں عشق کا ذکر ایسا بے اثر نہیں ہے۔ اس کے بیان کرنے والے کے رونگٹے رونگٹے سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ٹپکے خوناب میں استفہام اقراری ہے یعنی ضرور خوناب ٹپکے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل   کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دیدۂ بینا یعنی نگاہِ عارف کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کُل نظر نہ آجائے۔ اس مصرع اولیٰ میں بھی استفہام اقراری ہے۔ جس خوبی کے ساتھ یہ بلیغ مضمون مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے حدِ توصیف سے باہر ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے   دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

مرزا صاحب اپنی عادت کے موافق اس مقطع میں بھی شوخی برت گئے۔ ایک معمولی مضمون کو نرالے پیرائے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ معشوق نے غالب کا امتحانِ عشق لینے کے لئے ایک دن مقرر کیا تھا۔ اس کو یوں بیان فرمایا ہے کہ شہر میں یہ خبر مشہور تھی

[illegible] میری نظر سب کے [illegible] رہ گئے۔ [illegible] مجھے عشق [illegible] جب [illegible]
[illegible] قدرت [illegible] مجنوں [illegible] خبر [illegible] ہوگی۔

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

فرماتے ہیں [illegible] اسد ہم جنوں [illegible] وحشت میں [illegible] سے [illegible]
مرزا [illegible] مجنوں بھی سبقت لے گئے ہیں۔ [illegible] مجنوں [illegible]
[illegible] مجنوں [illegible] آہو [illegible] مرزا صاحب [illegible]
کی حالت کو مجنوں سے کامل تر ظاہر کرتے ہیں [illegible] سر پنجۂ مژگان [illegible] پشت [illegible]
ہے یعنی وحشت کے [illegible] جیسے [illegible] پشت [illegible]
سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔

بہ نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

فرماتے ہیں [illegible] جو [illegible] شرم [illegible]
میرے گناہوں کے [illegible] مجھ پر [illegible]
کے بدلے میں شرم نارسائی کا تحفہ پیش کرتا ہوں [illegible] گناہوں کی [illegible]
کی حسرتیں [illegible] خون ہو گئی ہیں۔ [illegible] پارسائی
کا دعویٰ بھی پیش کرتا ہوں۔

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بمہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حسن تماشا دوست سے [illegible] حسن [illegible] نظر
[illegible] دیکھتے [illegible] دوست [illegible]
[illegible]
دیکھئے [illegible] مضمون [illegible]
ہم [illegible] رسوائی [illegible]

قریب تک کسی نظر کو رسائی حاصل نہیں ہے۔ پھر دعوئ پارسائی کی صداقت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا   چراغِ خانۂ درویش ہو کاسا گدائی کا

معشوقِ حقیقی کی طرف خطاب ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ زکوٰۃِ حسن دے یعنی حسن کا چالیسواں حصہ بھی سال بھر میں اگر مجھکو مل جایا کرے تو آفتاب کی طرح کاسۂ گدائی روشن ہو کر چراغِ خانۂ درویش بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو اپنے عرفان سے آفتاب کی طرح روشن اور منور کرے۔

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر   رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

فرماتے ہیں۔ تو نے ایک مشتاقِ قتل کو بے جرم سمجھکر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اس صورت میں تیری گردن پر بجائے خونِ بے گناہ حق آشنائی رہ گیا۔ (از یادگارِ غالب)

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے   مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

فرماتے ہیں۔ میری تمنا یہ تھی کہ میں تجھ سے ایسی زبان مانگوں جس سے تیری درگاہ میں اپنا عرضِ حال کر سکوں مگر اس درخواست یا دعا سے پہلے میری زبان محوِ سپاس بے زبانی ہو گئی یعنی مجھکو وہ خاص زبان نہ ملنے سے یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری بارگاہ میں شکوۂ بے دست و پائی یعنی بے سروسامانی کا گلا پیش ہی نہ کر سکا اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھکو بجائے زبانِ شکایت کے درجۂ تسلیم و رضا عطا ہو گیا۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے   چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

فرماتے ہیں۔ میرے نفس اور نکہتِ گل میں کچھ فرق نہیں ہے۔ وہی اک بات ہے یعنی ان دونوں کو مساوات کا درجہ حاصل ہے اور اس کا باعث جلوۂ چمن یعنی فصلِ بہار اور جوشِ گل ہے۔ چمن میں جوشِ گل سے نکہتِ گل پیدا ہوتی ہے اور میں چمن کی بہار دیکھ کر رنگیں نوائی کے ساتھ غزل سرائی

شروع کر دیا ہوں۔

دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی　**عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا**

معشوق سے فرماتے ہیں۔ اے بیوفا اب تو تیری بیوفائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے اب تو بیوفائی چھوڑ دے اور اس کا ثبوت یہ دیتے ہیں کہ زمانہ بھر کے معشوق تجھکو طعنے دیتے ہیں۔ پیغارہ کے معنی طعنے اور تشنیع کے ہیں۔ اور معشوق کی صفت بے دہانی ہوتی ہے اس لئے دہن کو عدم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس مطلب کو کہ تیری بیوفائی کا چرچا ایک معشوق سے لیکر دوسرے معشوق تک اور دوسرے سے لیکر ہزارہا معشوق تک پہنچا ہے۔ زنجیر رسوائی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ میں تبدیلی انسان کی ساری عادتیں بدل جاتی ہیں۔ مگر تیری بیوفائی کی عادت عدم تک پہنچکر بھی نہ بدلی۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے　**کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا**

فرماتے ہیں۔ اے غالب تو جو طرح طرح کی شکایتیں اور قسم قسم کے گلے شکوے خط کو طول دے رہا ہے اس سے کیا فائدہ۔ مختصر سا فقرہ لکھدے کہ ستمہائے جدائی اور آزار فراق بیان کرنے کی حسرت دل میں رکھتا ہوں۔ آپ خود تشریف لائیں یا مجھ کو بلا کر میری مصیبت کے واقعات میری زبانی سن لیجئے۔

غزل　**گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائیگا**　**بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائیگا**

فرماتے ہیں۔ اگر شب فرقت کا رنج و غم بیان نہ کیا جائیگا اور ہم دل لگا کر اس کو چھپائیں گے تو بڑی قباحت یہ پیدا ہو جائیگی کہ چاند میں جو داغ ہے وہ میرا مہر دہاں ہو جائیگا یعنی جس طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دیکھتا ہے اسی طرح تمہاری جدائی کی تکلیفوں کا حال لوگوں پر کھل جائیگا کیونکہ میری خموشی زبان بنکر افشائے راز محبت کر دے گی اور پھر تم بدنام ہو جاؤ گے اس سے بہتر یہ ہے کہ میری مصیبت کا حال تم سن لو تاکہ میرا دل غم کے بوجھ سے ہلکا ہو جائے دل کی حسرت نکل جائیگی تو راز چھپا رہے گا۔

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب　**پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائیگا**

فرماتے ہیں۔ اگر یہی قاعدہ قرار پا گیا ہے کہ تمام ہجر کی سختیاں بتوں کو پانی کر دیتی ہیں اور خون کے آنسوؤں سے رلوا دیتی ہیں تو عجب نہیں کہ جانلی سیل بن کر میرے گھر کے در و دیوار کو بہا لے جائے۔

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

جوشِ عشق اور رعبِ حسن کی تصویر ایسے سادے اور صاف لفظوں میں کھینچی ہے کہ قابلِ ستائش ہے۔ مرزا صاحب لب و رخسار کے بوسہ کا شوق بوجہ ادبِ عشق ظاہر نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ پاؤں کا بوسہ تقاضائے دل سے مجبور ہو کر سونے کی حالت میں لے تو لوں مگر خوف اس بات کا ہے کہ مجھ سے بدگماں ہو جائیگا۔ مطلب یہ ہے کہ میری پاک محبت کا یقین اُس کے دل سے مٹ جائیگا اور مجھکو بوالہوس خیال کر لیگا۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ دل کو وفاداریوں کے کام میں صرف کرینگے اور زندگی بھر وفاداری میں ہمارا ساتھ دیگا۔ اس کی خبر نہ تھی کہ یہ پہلے ہی معشوق کے امتحان کی نذر ہو جائیگا۔ اور ایک ہی نگاہ میں ایسا کارکن، کارگزار اور مددگار کام آ جائیگا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

عجیب بلیغ شعر کہا ہے، فرماتے ہیں۔ ایک عالم کے دل میں تیری جگہ ہے۔ ساری دنیا تجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہر کس و ناکس تجھ پر فریفتہ ہے۔ اگر تو ہم سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ ہم پر مہربان ہو جائیگا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ تیری نگاہِ قہر و غضب رُسوائی اور بدنامی کے خوف سے، گر اسی طرح ضبطِ نالہ و آہ کی تعلیم دیتی رہی تو کیا عجب ہے کہ شعلۂ آتش گھاس کے تنکوں میں اسی طرح چھپ جائے جس طرح خون رگوں میں پوشیدہ ہے۔

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشم خونفشاں ہو جائیگا

فرماتے ہیں عشق کے غم و رنج سے میری حالت ایسی زار و نزار ہو گئی ہے کہ جو مجھے دیکھ لے اُسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اگر تو مجھ کو اپنے ساتھ باغ میں لے جائیگا تو گلاب کے تر و تازہ پھول چشم خونفشاں بن کر میرے حال پر خون کے آنسو بہائیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سیر باغ میں بجائے طرب و انبساط تجھکو بے لطفی حاصل ہوگی۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

فرماتے ہیں۔ میں تیرے ظلم بیجا صرف اس توقع پر اُٹھا رہا ہوں کہ حشر کے دن میرا تیرا انصاف خدا کے سامنے ہو جائیگا اور مجھے میری مظلومی کی داد مل جائیگی۔ اگر خدا نخواستہ حشر میں بھی انصاف نہ ہوا تو پھر مجھ پر قیامت گزر جائیگی۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

مثل مشہور ہے۔ نادان کی دوستی جی کا زیان۔ فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ اس دوستی میں کیا فائدہ ہے۔ آخر تو عقلمند ہے اس بات کو اپنے دل میں سوچ کہ نادان کی دوستی میں جان کا ضرر ہوا کرتا ہے۔ لطف اس شعر میں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ دل کو فریب دیکر عشق سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات عاشق کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جان کے خوف سے عشق کو ترک کردے۔

غزل

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ میرا درد عشق دوا سے مست نہ سکا اور میں اچھا نہ ہو سکا۔ میرے لئے یہ کچھ بُری بات نہیں ہوئی۔ اگر میں اچھا ہو جاتا تو میرے دردِ عشق کو دوا کا منت پذیر ہونا پڑتا اور مجھ کو کسی کا احسان اُٹھانا منظور نہ تھا۔ اس لئے اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہوا۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

فرماتے ہیں فیصلہ کے وقت رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو جھگڑا ہمارا تمہارا [illegible]

صرف گلا اور شکایت کرنے کا اس کو تماشہ بنانے سے کیا فائدہ۔ یہ بات ہم کو کسی طرح گوارہ نہیں کہ ہماری شکایت تمہارے منھ سے ہمارے رقیب سُنیں اور تمہاری ہاں میں ہاں ملائیں ۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے اور ایسی کونسی جگہ ہے جہاں جاکر آرزوئے قتل پوری کریں ۔ جب تو ہی خنجر کا امتحان لینے سے ہچکچاتا ہے ۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب   گالیاں کھاکے بے مزا نہ ہوا

شیریں دہنی معشوق کی تعریف پر دعویٰ کس قدر متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تیرے ہونٹھ ایسے شیریں ہیں کہ رقیب جیسا بُوالہوس بھی گالیاں کھاکر پی گیا اور بدمزا نہ ہوا۔ حالانکہ چاشنیٔ عشق سے محروم تھا مگر تلخیٔ دشنام اُس کو بھی گوارا ہوگئی ۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی،   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

شوقِ مہمان نوازی کا یہ جوش کہ خبرِ آمدِ معشوق سُنکر بے اختیار آنکھیں بچھا دینے کو جی چاہتا تھا اور بے سروسامانی کی یہ کیفیت کہ آج گھر میں بوریا بھی نہیں رہا۔ کل تک تو تھا بھی اب اُن کی تشریف آوری کے خیال سے مرزا صاحب دل ہی دل میں شرمائے جاتے ہیں کہ ہائے وہ آئینگے تو میری بے سروسامانی کو دیکھ کر دل میں کیا خیال کرینگے ۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مرزا صاحب نے اس شعر میں عجب شوخی برتی ہے جو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ شعر اور اس کے بعد کا شعر دونوں بیت الغزل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے (از یادگارِ غالب)

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فرماتے ہیں۔ ہم نے زندگی بھر یہ ایک ہی کام کیا ہے کہ جان دیدی لیکن پھر کچھ سوچ کر سمجھے

وہ جان تو اُسی کی دی ہوئی تھی۔ اسی کی امانت اُس کو واپس کر دی۔ اس میں کونسی فخر کی بات ہے۔ حق تو یہ ہے یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ اُس کا حق ہم سے کچھ بھی ادا نہ ہو سکا۔ یہ خیال [illegible] ان الفاظ، اس بلاغت کا کیا کہنا ہے۔

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما کام گر رک گیا روانہ ہوا

فرماتے ہیں زخم اگر دب بھی گیا یعنی اس کو کس کر پٹی باندھ دینے سے مٹ بھی گئی اور لب زخم باہم پیوستہ ہو بھی گئے تو بھی خون بند نہ ہوا۔ مگر اس کے خلاف کام اگر رک گیا تو وہ روانہ ہوا۔ قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح زخم دب جانے سے لہو جاری رہا۔ اسی طرح کام رک جانے پر بھی ہوتا۔ یہ بدنصیبی کا اظہار کس سادگی سے کیا ہے۔ کتنے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

فرماتے ہیں ہم تو سڑک سڑک چلے جاتے تھے معشوق نے ہم سے دل چھین لیا ستم، ستم یہ کہ دل لیتے ہی غائب ہو گیا۔ دلستانی کا قاعدہ یہ ہے کہ ٹھہر کر دم لیتا ہم کو اپنا نام و نشان گھر کا پتہ۔ ملنے کا وقت بتاتا۔ اُس نے تو یہ کچھ بھی نہ کیا دل لیتے ہی چوروں کی طرح بھاگ گیا اب ہمیں کون بتائے کہ یہ رہزنی تھی یا دلستانی۔ اس شعر میں معاملہ بندی نے اور بھی لطف پیدا کر دیا ہے۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا

سنا گیا ہے کہ یہ مشاعرہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے طرح میں غزل نہ لکھی تھی۔ جب نمبر مرزا صاحب کی حد تک پہنچ گیا تو یہ غیر طرح غزل پڑھ دی۔ مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا۔

غزل

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مرزا صاحب تعجب کے لہجے میں فرماتے ہیں شوق کو تنگیِ جا کا گلہ دل میں بھی ہے۔ "بھی" کا لفظ بتا رہا ہے۔ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم اس میں سما جاتے ہیں اور پھر خدا بھی سما جاتا ہے۔ باوجود اس وسعت کے شوق کو جگہ کی تنگی کا گلہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی وسعت

بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں ہے (اب تنگی جا کا ثبوت ملاحظہ ہو) فرماتے ہیں۔ گوہر میں دریا کی روانی محو ہو گئی یعنی کوزے میں دریا سما گیا۔ مگر بیچ جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند ہو گئی۔ دل کو گوہر سے اور شوق کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقطع میں دریا کو کوزے کے اندر بند کر لیا ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ چستی بندش۔ تناسب الفاظ حسنِ بیان میں فرق نہیں آنے پایا۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

فرماتے ہیں۔ یہ تو میں جانتا ہوں اور اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ تو قیامت تک میرے کسی خط کا جواب نہیں لکھے گا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ذوقِ خامہ فرسائی مجھ پر ظلم کرتا ہے اسلئے بار بار تجھ کو خط بھیج رہا ہوں۔ باوجودیکہ امیدِ جواب سے قطع نظر کر چکا ہوں۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

فرماتے ہیں۔ بہار اگر ایسی ہی بے ثبات اور بے بنیاد ہے تو بہار ہی کیا ہے۔ یعنی موسم بہار خزاں کے پاؤں کا رنگِ حنا ہے جو بہت جلد اُڑ جائیگا اور اسکی مثال ایسی ہے جیسے عیش۔ دنیا کے عیش کی مدت بہت ہی قلیل ہوتی ہے اور کلفتِ خاطر زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ دنیا میں عیش و آرام کا زمانہ کم ہے اور رنج و مصیبت کا دور دورہ زیادہ۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

قاعدہ ہے کہ رنج و مصیبت کے وقت عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ ناگوار ہوا کرتی ہے چنانچہ انشاء اللہ خان انشا کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے غمِ فراق کی حالت میں سیرِ باغ کے لئے کیوں گھسیٹے لئے جاتے ہو مجھ کو خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہیں ہے۔ خندۂ گل کو خندۂ بیجا سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ وہ کچھ

سوچ سمجھکر ازراہ تعجب یا تمسخر میں ہنسنا خندۂ بیجا رنج و غم کی حالت میں زیادہ تر ناگوار خاطر ہوتا ہے۔ شعر کی عمدگی میں کلام نہیں ۔

غزل
ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں　　کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میرا رونگٹا رونگٹا چشم بینا بن گیا ہے۔ ذرّے ذرّے میں اسکی تجلیاں دیکھ رہا ہوں پھر بھی مجھکو محرمی حسن کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا یعنی کنہ ذات اور معرفت الٰہی سے محروم ہوں ۔

دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے　　ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

ناز و ادا کو طلب دل کا تقاضا کہنا نئی طرح کی جدت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ادھر سے ابھی ناز و ادا کا بھی آغاز نہ ہوا تھا ہم نے پہلے ہی سے دل نذر کر دیا۔ دوسری لطافت خیال اس شعر میں یہ ہے کہ محض حسن جو سادگی کے عالم میں تھا ہم اس پر عاشق ہو گئے۔ ناز و ادا جس کو زیور حسن سمجھا جاتا ہے فریفتگی کے لئے اسکی بھی ضرورت نہ تھی ۔

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے　　مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

مرزا صاحب معشوق سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو یہ نہ کہہ کہ تیرا گریہ تیری حسرت دل کے برابر ہے نہیں یہ بات ہرگز نہیں ہے میری نگاہ میں دریا کا جمع و خرچ ہے یعنی جس قدر میں نے آنسو بہائے ہیں اس سے بہت زیادہ حسرت گریہ میرے دل میں موجود ہے حسرت دل کے مقابلہ میں ابھی کچھ بھی نہیں رویا ہوں ۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسدؔ　　جفا میں اسکی ہے انداز کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کے خدا یاد آتا ہے اسلئے کہ آسمان جو ظلم و ستم مجھ پر کرتا ہے وہ سب اسی کے حکم سے ہوتے ہیں۔ بغیر حکم الٰہی کے آسمان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ شعر بہت صاف اور خیال نہایت پاکیزہ ہے ۔

غزل
قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا　　خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

خود مرزا صاحب اس مطلع کی شرح اپنے ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ "خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف زیادہ نہیں۔" وہ فرماتے ہیں کہ "قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا اور برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پروئے گئے ہوں۔"

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

فرماتے ہیں۔ معشوق کو میرے عشق کا یقین آگیا ہے اور اس قدر اُس کا اعتبار جم گیا ہے کہ اگر غیر بھی بھولے چوکے سے کبھی آہ و فریاد کرتا ہے تو وہ یعنی معشوق خوفِ بدنامی اور رسوائی سے مجھ پر خفا ہوتا ہے غیر کی طرف اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔

بیت جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

فرماتے ہیں۔ سفر کے وقت جو یار نے اونٹ پہ محمل کس اور باندھا۔ ہماری تپشِ شوق نے ہر ذرۂ خاک پر ایک دل باندھ دیا جو ختم سفر تک یار کے ساتھ ساتھ رہا مطلب یہ ہے کہ دوست کو رخصت کرتے وقت ہمارا شوق یہ چاہتا تھا کہ ہم بھی اُس کے ہمراہ روانہ ہو جائیں اور اُس بیقراری کی حالت میں خاک کے ذروں کو دیکھ کر جو سواری کے وقت زمین سے گرد و غبار بن کر بلند ہوتے تھے ہم سمجھتے تھے کہ ہر ذرہ پہ ایک دل بندھا ہوا ہے ورنہ خاک کے ذرہ میں یہ تڑپ کہاں ہوتی ہے۔

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیِ ناز جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

اہلِ بینش سے یہاں وہ اہلِ تماشہ مراد ہیں جو یار کے آئینہ دیکھتے وقت اِدھر اُدھر موجود ہیں۔ اور حیرت کدہ وہ آئینہ ہے جس میں عکسِ یار شوخی و ناز کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ یہاں آئینہ سے مراد فولادی آئینہ ہے جس میں جوہر ہوا کرتے ہیں۔ جوہرِ فولاد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور سبز رنگ کو ہمیشہ طوطی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ پہلوؤں سے دیکھنے والوں کو ہر ایک رُخ سے جوہرِ آئینہ کی سبزی متحرک نظر آتی ہے اس وجہ سے اُسے طوطیِ بسمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ نہایت لطیف اور بدیع ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جوہرِ آئینۂ فولادی کی

سبزی جو اطراف و جوانب سے متحرک نظر آتی ہے یہ طوطیِ بسمل ہے جس کو شوخیِ رنگ کی چھری سے بسمل کر دیا گیا ہے۔

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

عربدہ کے معنی ہیں خرابی اور جنگجوئی کے ہیں فرماتے ہیں یاس اور امید نے ایک میدانِ جنگ مانگ لیا ہے۔ آپس میں لڑائی ہو رہی ہے کبھی یاس غالب آجاتی ہے کبھی امید۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں۔ عجزِ ہمت نے ایک طلسم باندھا ہے یعنی طلسم بنایا ہے جس میں یاس و امید کی باہم لڑائی ہو رہی ہے۔ یاس چاہتی ہے میں فتح حاصل کروں۔ امید کی کوشش ہے میں شکست دیدوں۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ جو شخص ہمت نہیں رکھتا وہ سائل بن کر امید و بیم میں مبتلا رہتا ہے یعنی سوال کرنے کے بعد جب تک کچھ ملے یا جواب صاف سے امید کا طلسم ٹوٹے۔ یاس و امید میں باہم جھگڑا رہا کرتا ہے۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

فرماتے ہیں ذوقِ سخن کی تشنگی کے مضامین جیسے باندھنے چاہتے تھے ہم سے اے غالب نہ بندھ سکے۔ باوجودیکہ دل کھول کے دریا کو بھی ہم نے ساحل باندھا۔ ساحل کو تمام شعرا تشنہ لب لکھتے چلے آئے ہیں اگرچہ آغوش میں دریا کو رکھتا ہے مگر پھر بھی خشک لب نظر آتا ہے۔ دل کھول کر کوئی کام کرنا کسی کام میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ ذوقِ سخن اس درجہ غالب تھا کہ باوجود بہت کچھ لکھنے کے طبیعت مضامین سے سیر نہ ہوئی۔

۲۱ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

فرماتے ہیں تعجب اور حیرت کی بات ہے مجھ جیسا بادہ خوار جس کو ساری دنیا شراب خوار جانتی ہے بزمِ مے سے اس طرح پیاسا چلا آئے یہ مانا کہ میں نے توبہ کر لی تھی اور اسی پاسِ توبہ سے ساقی سے شراب نہ مانگی۔ مگر ساقی کو کیا ہو گیا تھا کہ اس نے بے طلب کے مجھ کو نہ دی اور زبردستی نہ پلا دی۔ جن لفظوں میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے کچھ [illegible] ہی شعر کا لطف [illegible]

کرسکتے ہیں۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں   وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

اس مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور مطلع میں بھی باندھا ہے وہاں یوں فرماتے ہیں

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی   دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

مرقومہ بالا شعر میں بھی تیر سے مراد تیرِ نظر ہے یعنی وہ زمانہ اب کہاں ہے کہ دل پہلو میں اپنے مقام پر رہتا تھا اور جگر سینے میں اپنی جگہ قیام پذیر تھا۔ اب تو عشق نے دونوں کو ایک ہی تیر میں چھید کر زمین پر ڈال دیا ہے۔

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں   جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

مطلب صرف اتنا ہے کہ جب مدافعتِ مصائب کی قدرت حاصل تھی اس وقت مصیبتیں نہ پڑیں جس وقت اُن کے دفعیہ کی طاقت باقی نہ رہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مضمون کو اس استعارہ میں بیان کیا ہے کہ "جب رشتہ بے گرہ تھا" یعنی کسی مشکل کا سامنا پیش نہ آیا تھا تو "ناخن گرہ کشا تھا" یعنی اسکے دفعیہ کی قدرت تھی۔ مشکل گرہ کا استعارہ ہے اور تدبیر ناخن کا استعارہ۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا   بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا   بحر

فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر کی قسمت ہی میں ویران ہونا لکھا تھا تو لوگ ہم پر رونے کا الزام کیوں رکھتے ہیں جو گھر کثرتِ گریہ سے دریا بن گیا ہے وہی گھر نہ رونے کی حالت میں جنگل بن جاتا۔ غرض یہ ہے کہ بدنصیبی اپنا رنگ دکھائے بغیر کسی طرح نہیں رہتی۔

تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے   کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

اس شعر میں بھی مسطورۂ بالا مطلع کا مضمون دوسری ترکیب اور دوسرے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل کو ہر دم رنج و بلا سہنا لازمی اور ناگزیر ہے یعنی اگر دل تنگ نہ ہوتا واشدِ خاطر کی بدولت اس قدر پریشانی بڑھ جاتی کہ پریشان ہو جاتا۔

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے   کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

فرماتے ہیں عمر بھر عبادت کرنے کے بعد جنت میں باریابی حاصل ہو جاتی۔ رضوان ہم کو نہ روکتا دربار کا پاسبان اس قدر سخت گیر ہے کہ عمر بھر التجائیں کرنے کے بعد بھی خانۂ دوست میں جانے کی اجازت نہیں دیتا کاش دربان رضوان ہوتا (جو بہشت کا دربان ہے) جس سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ وہ عمر بھر عبادت کرنے کے بعد نہ روکتا۔

۱۲ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کس خوبی کے ساتھ نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ جب دنیا پیدا نہ ہوئی تھی اُس وقت صرف خدا ہی خدا تھا۔ اگر اس عالم امکان کو پیدا نہ کیا جاتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا پس میری ہستی نے ظاہر ہو کر مجھ کو ایک دوسرا جسم قرار دیا اور دوسرے جسم نے قرار پا کر مجھ کو برباد کر دیا اگر میں پیدا نہ ہوتا اور میرا وجود نہ ہوتا تو خیال کرنا چاہیے کہ میں کیا ہوتا یعنی خدا ہوتا۔ اس واسطے کہ یہ پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ نہ ہوتا تو بھی خدا ہی خدا ہوتا۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اس شعر میں لفظ بے حس نے ثبوت دعوی کے ساتھ عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں جب ہمارا سر غم و الم کی کثرت سے ایسا بے حس ہو گیا تھا کہ ہر وقت اُس کو زانو پر رکھنا پڑتا تھا تو ایسے سر کے کٹ جانے کا غم و الم بے فائدہ ہے۔ یعنی کثرتِ غم نے سر کو کٹنے سے پہلے بیکار کر دیا تھا بیکار شے کا ضائع ہونا کچھ افسوس کی بات نہیں۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یہاں "کیا" کا لفظ تحیر کے معنی پر استعمال ہوا ہے جس سے انتہا درجہ کی بیدلی اور ناامیدی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دنیا کی بے ثباتی کا خیال کسی کام میں نظر کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ غالب کو مرے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر گیا ہے۔ مگر اب تک ہم کو وہ اور اس کی باتیں یاد آتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہر بات پر یہ کہا کرتا تھا کہ اگر خوش نصیبی سے ایسا بھی ہوتا تو کیا ہوتا یعنی

ع دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ۔

بیت **یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا　　یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا**

فرماتے ہیں اب کے سال بہار باغ میں ایسے زور شور سے آئی ہے کہ ذرہ بھر زمین بھی بیکار نہیں رہی ہے۔ باغ کی روشیں جو کثرت بہار سے سبزہ زار ہو گئی ہیں وہ گویا مرہم زنگار کی بتیاں بن گئی ہیں۔ داغ لالہ کے واسطے (مرہم زنگار ہمیشہ زخم کو کاٹتا اور صاف کرتا ہے) یعنی لالے کا داغ مٹانے کے واسطے مرہم زنگار ہی کا استعمال مناسب سمجھا گیا ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی　　کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

فرماتے ہیں بغیر شرابِ محبت الٰہی کے کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آشوبِ آگہی کی برداشت کر سکے۔ ایاغ کے معنی پیالے کے ہیں اور یہاں پیالے سے مراد وہ گلاس ہے جس پر شراب ناپنے کے لئے خطوط کھینچے ہوئے ہوتے ہیں۔ انگریزی میں جس کو سنم ہیجرڈ اوس ہیجر کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عجز حوصلہ کی وجہ سے ہم نے پیمانۂ شراب پر نشانات بنا دئے ہیں اور اسی سے شراب ناپ کر پیتے ہیں اور مقدار شراب دن بدن بڑھاتے جاتے ہیں۔ آشوبِ آگہی کی طاقت برداشت بقدر خطوط جام رفتہ رفتہ پیدا ہوتی جاتی ہے یعنی ذکر و اشغال کی دن بدن مہارت و مشق زیادہ کرتے جاتے ہیں۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

فرماتے ہیں۔ دیوانے آدمی کی حرکات پر جس طرح عام آدمی ہنستے ہیں اسی طرح بلبل کے شوق نغمہ و فریفتگی پر پھول خندہ زن ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کو عشق کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک قسم کا خلل دماغ ہے۔ انسان نے غلطی سے خلل دماغ کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مصرع ثانی کی بے ساختگی قابل مدح و ستائش ہے۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے　　تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

فرماتے ہیں۔ فکر سخن کا نشہ مجھے آجکل کا نہیں، روزِ ازل سے نشۂ فکرِ سخن ساتھ لیکر آیا ہوں تریاک کے معنی افیون کے بھی ہیں اور چنڈو کے چھینٹے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح چنڈو باز چراغ کی لو کے ذریعے سے افیون کا دھواں نلکی کی وساطت سے حقہ کی طرح کھینچتے ہیں

دریچے ہیں۔ اسی طرح میں دودِ چراغ سے نسخۂ فکرِ سخن کرتا ہوں قاعدہ ہے کہ فکرِ سخن یا مشقِ سخن زیادہ رات کے وقت کی جاتی ہے اور رات کو لکھنے کی غرض سے شمع یا چراغ کا قریب ہونا بھی لازمی ہے طالب علم بھی عموماً رات ہی کو سبق یاد کرتے ہیں۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

اس شعر میں مرزا صاحب نے محسوسات کو تشخیص کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یہاں عشق سے دنیا کی محبت اور بندِ عشق سے اس محبت میں پھنسا ہوا ہونا مراد ہے۔ فرماتے ہیں سو بار دنیا کی فکروں سے ہم آزاد ہوتے ہیں اور دنیا اور اہلِ دنیا سے قطع تعلق کر چکے ہیں مگر اس بات سے مجبور ہیں کہ دل فراغت کا دشمن واقع ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں پھر بغیر شغل و فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

فرماتے ہیں۔ انسان کی آنکھ اسی واسطے پیدا کی گئی ہے کہ ہمیشہ خون کے آنسو بہاتی رہے۔ اگر آنکھ سے خونِ دل نہیں بہتا تو موجِ نگاہ کے بدلے آنکھوں میں خاک اڑنے لگتی ہے یعنی آنکھ کی زیبائش اور رونق خاک میں مل جاتی ہے۔ یہ میکدہ یعنی چشمِ انسان بغیر شراب کے خراب ہوتا ہے۔ تناسبِ لفظی کی کیا بات ہے۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

فرماتے ہیں۔ میرے غنچۂ خاطر کو کھلانے والی تیرے باغِ حسن کی بہار ہے اور یہ باغ سدا بہار اور ہمیشہ شگفتہ رہنے والا ہے۔ میری مستی کا سبب ابرِ بہاری نہیں ہو سکتا معلوم نہیں یہ خمکدہ یعنی ابرِ بہار کس کے مست کرنے اور بیہوش کر دینے کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معمولی شراب خوار ابرِ بہار سے لطف اٹھا سکتے ہیں اور ان کا دماغ فصلِ گل میں چمن کی سیر سے فرحت یاب ہو سکتا ہے۔ میرے شگفتہ خاطر کرنے کے لئے تیرا باغِ حسن اور تیرے حسن کی بہار ہے۔

اڑں وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

فرماتے ہیں۔ معشوق میری چینِ جبیں سے میرے غمِ پنہاں کو سمجھ گیا (غمِ پنہاں کے معنی ہیں

رنجش دلی کے ہیں) پھر اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔ خط کا مضمون پتہ کی بے ربطی سے آپ پر کھل گیا۔ چین جبیں سے استعارہ لفافۂ خط سے اور غم پنہاں کا استعارہ راز مکتوب سے کیا ہے۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

حضرات صوفیہ کے ہاں صفائی قلب کے لئے بہت سے طریقے ذکر کے رکھے گئے ہیں چنانچہ قادریہ خاندان کا یہ طریقہ ہے کہ ناف کے مقام سے سانس کو کھینچ کر سینے تک لاتے ہیں اور دہنی جانب سے گردن کو حرکت دے کر قلب کے اوپر ضرب لگاتے ہیں اور اس خیالی سانس کی کشش کو عربی خط میں لفظ الّا اللہ کی صورت تصور کرتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں میں بھی اپنے آئینۂ دل کی جلا چاک گریبان سے کرتا رہا ہوں۔ انجام کار مجھ کو یہ ثابت ہوا کہ ایک الف سے زیادہ میرے آئینۂ دل کی جلا نہیں ہوئی اور یہ ویسی ہی ایک سیدھی لکیر ہے جو آئینہ فولادی کو صیقل کرتے وقت ابتدا میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ مجھ پر اپنی غلطی ثابت ہو گئی اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ میرا گریبان جس کو میں نے مصقلہ سمجھا تھا (مصقلہ گھوڑے کی نعل کی صورت کا ایک آلۂ آہنی ہوتا ہے جس سے آئینۂ فولادی یا تلوار وغیرہ ہتھیاروں کی صیقل کیا کرتے ہیں) درحقیقت میں مصقلہ نہیں ہے بلکہ گریبان ہے۔ اب میں اُسے بیکار شے سمجھ کر چاک کر رہا ہوں اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ گریبان یہاں مراد گریباں کی کشتی سے ہے جو بالکل مصقلہ سے مشابہت رکھتی ہے۔

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

فرماتے ہیں۔ میری گرفتاری خاطر کا سبب مجھ سے شرح و بسط کے ساتھ یعنی مفصل نہ پوچھو میں اپنا پورا پورا راز کھولنا نہیں چاہتا۔ مجمل حال یہ ہے کہ دل میرا اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ میں اس کو زنداں سمجھتا ہوں۔

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام   رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

فرماتے ہیں میری بدگمانی نے یہ بات منظور نہ کی کہ وہ دیر تک سرگرمِ خرامِ ناز رہے ۔ اور اُسکی وجہ یہ تھی کہ نزاکت کے سبب سے چلنے میں اُسکو جو پسینہ آیا ۔ دیکھتے ہی اُس پسینے کے قطرے جمع ہو گئے میں ہر قطرہ کو یہ سمجھا کہ رقیب نے چشمِ حیراں اُس کے رُخ پہ رکھی ہوئی ہے ۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

عجز کو خس اور تندخوئی کو شعلہ سے تعبیر کیا ہے ۔ مطلب شعر کا یہ ہے ۔ میں نے اپنی عاجزی اور اُسکی بدمزاجی سے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح شعلۂ سوزاں گھاس پھوس کو جلا دیتا ہے ۔ اس کا غصہ میری بربادی اور قتل کا باعث ہوگا ۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

فرماتے ہیں ۔ جب سفرِ عشق میں تکان بہت بڑھ گئی اور کمزوری پیدا ہو گئی تو ضعف نے آرام لینا چاہا ۔ مسافر ہمیشہ تھک جانے کے بعد آرام لینے کے لئے سایہ کی تلاش کیا کرتے ہے ۔ چونکہ میرا سفر سفرِ عشق تھا ۔ یہاں درخت یا دیوار کا سایہ تو مفقود ہی تھا ۔ میں نے اپنے ہی سایہ کو شبستان سمجھ کر آرام لینا چاہا ۔ استعاروں سے قطع نظر کر لینے کے بعد اس شعر میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ جب محرومی اور ناکامی حد سے گزر جاتی ہے تو انسان یاس اور ناامیدی کو اپنا ہمدم قرار دیکر تسکینِ خاطر حاصل کر لیتا ہے ۔

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

فرماتے ہیں ۔ مژۂ یار سے میرا دل مرنے کے وقت تک بھاگتا اور ڈرتا ہی رہا اور نادانی سے بھاگنے کو میں دفعیۂ قضا سمجھ رہا ۔ تعجب ہے کہ پیکانِ قضا کا دفعیہ میں نے اس قدر آسان سمجھ لیا تھا ۔

دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

فرماتے ہیں ۔ اے اسدؔ تم نے اُسکو وفادار جان کر کیوں اپنا دل دیا ۔ بالفرض تمہارا اگر دل کا دینا ہی مقصود تھا تو باوفا کو سمجھ کر دیا ہوتا ۔ بہت بڑی غلطی کی جو کافر کو مسلمان سمجھا یعنی بیوفا کو

تو شرطِ اسلام ہے کافر کو اس سے کیا تعلق۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

فرماتے ہیں۔ مجھے اپنا دیدۂ تر پھر یاد آیا جس کے ذریعہ سے میرے بہت سے حوصلے نکلا کرتے تھے اور آتشِ عشق، آتشِ شوق، آتشِ رشک کچھ کچلا جایا کرتی تھی یعنی کسی قدر تسکین حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں۔ میرے دل و جگر دیدۂ تر کے یاد آجانے سے آرزومندِ فریاد ہو گئے۔ مرزا صاحب نے فارسی محاورہ کے موافق بیاں ہونے کی جگہ آیا استعمال فرمایا ہے [illegible]

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں اُس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا (از یادگارِ غالب)

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ آرزو اور تمنا کی سادگی کو تو دیکھو یعنی پھر نگاہِ یار کی نیرنگیوں کا تماشا یاد آیا۔ مطلب یہ ہے کہ نگاہِ یار نے جو اشارے کئے تھے باتیں کی تھیں اور عاشق اپنی سادگی سے آرزو پوری ہونے کا ذریعہ سمجھا تھا بلکہ اپنی کامیابی کا یقین کامل ہو گیا تھا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا ظاہر ہوا کہ معشوق کی نگاہوں کا وہ ایک فریب تھا مگر اس میں ایک قسم کا لطف حاصل ہو چکا ہے اس لئے وہ پھر یاد آتا ہے۔

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ اے حسرتِ دل میں تجھ سے اپنے قاصر رہنے کا عذر کرتا ہوں میں ضرور

تیری خواہش کے موافق نالہ کرتا لیکن مجبور اس سے ہو گیا کہ مجھکو اپنا جگر یاد آ گیا یعنی میں نالہ کرتا تو جگر شق ہو جاتا مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دل اس بات کی متقاضی تھی کہ نالہ کیا جائے اور اُسکے اثر سے کامیابی حاصل کی جائے مگر ہمارا نالہ ایسا پر زور نالہ تھا کہ اُسکے منہ سے نکلتے ہی جگر شق ہو جاتا۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ زندگی بسر ہونے کے لئے کسی پر عاشق ہونا لازمی امر نہیں۔ بغیر عشق کے بھی آدمی رہ سکتا ہے۔ تیری راہ گزر کا یاد آنا ہمارے لئے مصیبت کا سبب ہو گیا۔ نہ تری راہ گزر جسکی ہم مدت سے سیر کرتے تھے دیکھنے کے لئے جاتے نہ تجھسے دوچار ہوتے۔ نہ ترا عشق پیدا ہوتا۔ نہ اس مصیبت میں پھنستے جس میں اب گرفتار ہیں۔ خوبی اس شعر میں یہ رکھی ہے کہ امور قضا و قدر کو اپنی نادانی کا سبب سمجھ کر اس پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے زمانہ میں راہ گزر کو مذکر بولا اور لکھا جاتا تھا لیکن اب باتفاق اہل دہلی مؤنث استعمال کرتے ہیں

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اس شعر میں مرزا صاحب نے معمولی شوخی برت گئے ہیں جس سے شعر کے دو معنی پیدا ہو گئے ایک یہ کہ جب تیرا گھر ہم کو خلد میں یاد آئیگا اور رضوان سے اُسکا ذکر کرینگے رضوان تیرے گھر پر خلد کو ترجیح دیگا ہم بھلا کیونکر اس بات کو تسلیم کرینگے۔ ضرور آپس میں جھگڑا ہوگا وہ ہمیں جھٹلائیگا ہم اُسے جھٹلائینگے یہانتک کہ لڑائی کی نوبت آ جائیگی۔ دوسرے لطیف معنی یہ نکلتے ہیں کہ جب تیرا گھر خلد میں ہم کو یاد آئیگا تو ہم خلد سے نکل کر بھاگنا چاہیں گے رضوان روکے گا باہم خوب کشتم کشتا ہوگی۔

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں   دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ جگر کی موجودگی کے زمانہ میں جو فریاد کرتے وقت جرأت سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ جرأت اب جگر کے مٹ جانے کے بعد باقی نہ رہی۔ دل مآل اندیشی کی وجہ سے نالہ کرتے ہوئے جھجکتا ہے اور اس کا سبب معشوق کی بدنامی کا خوف ہے اگر جگر سینہ میں ہوتا

تو وہ اس قسم کا پس و پیش نہ کرتا کہ نالہ میں اثر ہوتا یا نہ ہوتا مگر نالہ ضرور کیا جاتا۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال   دل گم گشتہ مگر یاد آیا

فرماتے ہیں۔ تیرے کوچے میں ہمارا دل کھو گیا ہے۔ اس لئے رہ رہ کر تیرے کوچہ کا خیال آتا ہے شاید یہ بات کہ دل گم گشتہ ہم کو بار بار یاد آتا ہے مرزا صاحب نے اس مضمون کو ادا کرنے میں آداب عشق اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ دوست کو دل کی چوری کا الزام نہیں دیتے بلکہ اس کے کوچے میں دل کا گم ہو جانا ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری نزاکت معانی اس شعر میں یہ ہے کہ بے چین کرنے والے معشوق کی یاد ہے۔ مگر اخفائے راز عشق کے لئے دل گم گشتہ کے یاد آنے کا بہانہ کیا جاتا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر میں دو معنی نکلتے ہیں۔ اول یہ کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کے گھر یاد آ جاتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد یہ دوسرے معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

فرماتے ہیں میں نے بچپن کے زمانہ میں لڑکوں کی دیکھا دیکھی مجنوں پہ پتھر اٹھایا تھا مگر فوراً ہی مجھ کو اپنا سر یاد آ گیا یعنی یہ خیال ہوا کہ میرے سر میں بھی تو اسی قسم کا سودائے عشق سمایا ہوا ہے یعنی میرا مزاج تو بچپن سے عاشقانہ تھا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا   آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا   بیت

فرماتے ہیں۔ وعدہ پر آپ تشریف تو لے آئے مگر دیر کر کے آئے اس توقف کی کوئی وجہ ضرور ہوگی شاید یہ وجہ ہو کہ غیر آپ کو یہاں آنے سے روکتا تھا۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا   اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

طنزاً زشتیٔ تقدیر کو خوبیٔ تقدیر کہہ گیا ہے۔ فرماتے ہیں مجھ سے مجھے اپنی تباہی کا گلہ بے جا ہے اس میں عذر یہ کہ کچھ میری بدنصیبی کی بھی شراکت تھی۔ معشوق کو کثرتِ محبت کی وجہ سے الزام دیتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں　　کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ میں وہی شکار ہوں جو کبھی تیرے گھوڑے کے شکار بند میں باندھ گیا تھا اور تو نے مجھکو حقیر سمجھکر کھول پھینکا تھا تو شاید مجھکو بھول گیا ہو مگر میں ابھی تک اپنے کو تیرا شکار ہی سمجھے جاتا ہوں نخچیر شکار کو کہتے ہیں فتراک اس سوتی رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی زین میں گینڈیوں کے چاروں طرف کونوں پر بندھی ہوئی یا پیوست ہوتا ہے۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

فرماتے ہیں تیرا وحشی تیری زلف کی یاد کو جس میں پہلے قید رہ چکا ہے ابھی تک بھولا نہیں البتہ اس کے ساتھ میں یہ خفیف سا خیال گرانباریِ زنجیر کا بھی تھا۔ اس بیان سے قیدِ زلف کے مقابلے میں قیدِ زنجیر کی سختی کو کم درجہ کا ثابت کرنا منظور تھا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اس شعر میں مرزا صاحب نے اس مضمون کو کہ معشوق نے آن کی آن میں اپنی صورت دکھادی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے اس طرح ادا کیا ہے "بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا" دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے۔ مجھ سے گفتگو بھی کرنی چاہئے تھی۔ میں تقریر سننے کا بھی مشتاق تھا آنکھوں کو تو دیدار سے کچھ تھوڑی بہت تسلی ہو گئی مگر دل کا ارمان نہ نکلا یہ جب ہی نکلتا کہ میرے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر مجھ سے بات چیت کی جاتی۔

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

فرماتے ہیں میں نے اس کو یوسف کہدیا (یعنی غلام بنادیا) بڑی خیر ہوئی کہ وہ مجھ سے اپنی یہ تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں یوسف کہدینے کے جرم میں سز

کے قابل تھا۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

فرماتے ہیں غیر کو دیکھکر میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو جائے اس لئے کہ میں نالے کرتا تھا اور اپنے نالوں سے تاثیر کا طلبگار بھی تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا اثر کچھ ظاہر نہ ہوا تھا اب غیر کو بُری حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فریاد کا اثر ہے۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

فرماتے ہیں پیشہ کچھ عیب کی بات نہیں ہے۔ آپ فرہاد کو کیوں نام رکھتے ہیں۔ یعنی فرہاد بھی ایک عاشق پیشہ گزرا ہے ہم بھی عشق پیشہ ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا۔ اگر فرہاد نے عشق کی مجبوری سے مجبور ہو کر کوہ کنی اختیار کی تو اس میں عیب کی کیا بات ہے۔ کوئی عاشق پہاڑ کاٹتا ہے کوئی فرقت مصیبت کے دن کاٹتا ہے۔ کوئی شیفتہ ہجر کی راتیں کاٹتا ہے۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

فرماتے ہیں ہم تو جان قربان کرنے کے لئے اُس کے سامنے جا کھڑے ہوئے تھے اگر اُس نے ہمارے پاس آنا کسرِ شان سمجھا تھا تو دور ہی سے کوئی تیر کھینچ مارا ہوتا مطلب یہ ہے کہ ہم سے ناچیز عاشق کو بھی اپنے ادا و ناز کا شکار بنانا ضرور تھا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

فرماتے ہیں۔ کراماً کاتبین کی تحریر پر کیوں ہمارے گناہوں کا شمار منحصر رکھا گیا ہے۔ وہ تو فرشتے ہیں ان کو انسانی خواہشات کا کیا احساس ہے جس بات کو چاہا گناہ میں شامل کر لیا۔ لکھنے کے وقت دنیا کے دستور کے موافق ہمارا آدمی یعنی ہمارا کوئی وکیل ضرور ہونا چاہیے تھا۔ صرف فرشتوں کی تحریر پر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے۔

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

ریختہ اردو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اُردو شاعری میں اے غالب تمہیں اُستاد

نہیں ہو۔ کہتے ہیں یعنی مشہور ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی شاعر میر بھی تھا کس خوبی سے فنِ سخن میں اپنے کو میر صاحب کا ہمسر ہونا ثابت کیا ہے۔

زل **لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا　　زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا**

فرماتے ہیں میں لبِ خشک اُن لوگوں کا ہوں جو آرزو اور شوق کی حالت میں بغیر کچھ بھی حاصل کئے دُنیا سے گزر گئے ہیں۔ اس واسطے دل شکستہ اور پریشان خاطروں کی زیارت گاہ بنا ہوں۔ دل آزردگاں سے مُراد گروہِ عشاق ہے۔ جو اکثر محرومی کی حالت میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہمہ نا امیدی ہمہ بدگمانی　　میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

فرماتے ہیں میں سراپا نا امیدی اور بدگمانی کی تصویر بن گیا ہوں میں اُن لوگوں کا دل ہوں جو وفائے معشوق کا فریب کھا چکے ہیں یعنی جن عشاق نے معشوق کو وفادار سمجھ کر طرح طرح کے نقصان اُٹھائے ہیں اور آخر کار حصولِ ناکامی کے بعد نا امیدی حاصل کی ہے۔

ازل **تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا　　اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا**

اس شعر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ آج تک کسی کا بھی دوست تو نہیں بنا ہے اور یہ صرف مجھ ہی پر نہیں بلکہ تو نے اوروں پر مجھ سے زیادہ ظلم کئے ہیں لیکن کسی قدر گہرا مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ جو ظلم مجھ پر کبھی نہ ہوا تھا وہ تو اوروں پر کر رہا ہے۔ اوروں سے یہاں فقط رقیب کی طرف اشارہ ہے یعنی رقیب پر تو نے مجھ سے زیادہ ستم کر کے میرے دل میں حسد کی ایسی آگ لگا دی ہے کہ جس کے مقابلہ میں جور و ستم کچھ حقیقت نہیں رکھتے تیری اس واسطے ثابت ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترکِ جور دشمنی کا اظہار کر رہا ہے۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے چاہِ نخشب سے نکالا تھا یہ چاند دواؤں کے ذریعہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل سکی تھی اور اصلی چاند کے سامنے ناقص الخلقت قرار پایا تھا دو مہینے تک چاہِ نخشب سے نکلتا رہا بعدہٗ مخفی ہو گیا

فرماتے ہیں ماہ نخشب کی طرح ناقص اور بیکار سمجھ کر دست قدرت نے چھوڑ دیا حالانکہ خورشید ابھی روئے یار کے مقابلے میں تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُس کی سمجھ کا قصور ہے۔ دعوے یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اُس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بن جانے پر قانع ہو جاتی تو اُس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا (از یادگار غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم　　میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قد یار کو ہمیشہ فتنۂ حشر یا سرو شمشاد و گلستاں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب تک میں نے قد یار کا انداز اور اُس کی خوش خرامی کا تماشا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا فتنۂ قیامت کا دل سے معتقد نہ ہوا تھا۔

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں　　یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

سادہ دل یا سادہ لوح بیوقوف آدمی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں میں اپنی سادہ دلی سے آزردگی یار کو بھی موجب عیش و مسرت سمجھا ہوں اور دل میں خوش ہوں کہ جب سبق شوق کی ایک مرتبہ لذت نصیب ہو چکی ہے دوبارہ بھی اُسکا لطف حاصل ہوگا یعنی یار سے جب صلح ہو جائیگی تو پھر سبق شوق کو دُہراؤں گا اور وہ باتیں جو ایک مرتبہ دل کو مزا دے چکی ہیں۔ مکرر یعنی دوسری بھی مزا دیں گی۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب اُس سے صلح ہونی ممکن نہیں۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں۔ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا کونہ تک بھی نہیں بھیگا (از یادگار غالب) گناہ کی تکمیل کے بعد حوصلہ گن

کافی تھا اور شوقِ گناہ میں یہ کہنا کہ دریائے معاصی تنک آبی سے خشک ہو گیا بالکل اچھوتا خیال اور نئی جدت ہے۔ سنا گیا ہے کہ استاد ذوق کو مرزا صاحب کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

سمندر ایک جانور بیان کیا جاتا ہے۔ جو نیولے کی قسم کا مگر نیولے سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ میں اس وقت سے اپنے داغ جگر سے تحصیل کر رہا تھا کہ جب آتشکدہ میں سمندر پیدا بھی نہ ہوا تھا یعنی جب سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

رشتۂ شمع سے وہ دھاگا مراد ہے جو موم بتی کے درمیان میں ہوتا ہے اور موم کی وساطت سے روشن ہو کر جلتا رہتا ہے۔ ناموس شرم و حیا۔ کسوت لباس۔ خار در پیراہن بودن فارسی محاورہ ہے مرزا صاحب نے اردو شعر میں نظم کیا ہے۔ فانوس کا ڈھانچ اکثر بانس کی تیلیوں کا بنا کر اس پر باریک کپڑا چڑھا دیتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ رات کو جب وہ شرم کی محفل خلوت میں معشوق بزم فروز تھا اس کے سامنے شمع خجالت سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ اور شمع کے حق میں رشتۂ شمع خارِ پیراہن بن گیا تھا۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ شہادت گاہ عاشق میں جو کوسوں تک مہندی کے درخت پیدا ہوتے ہیں یہ اس خون کے اثر سے ہیں جو وقت قتل بہایا گیا تھا۔ اور حنا کا پیدا ہونا یہ بتا رہا ہے کہ شہید کس قدر حسرتِ پابوس کا خواہش مند تھا زندگی میں تو یار کے قدموں تک رسائی نہ ہوئی مگر اس آرزو میں خاک ہو جانے کے بعد حنا کے لباس میں ظاہر ہو کر قدم بوسی کی تمنا ظاہر کی ہے۔ اگر معشوق مہندی پاؤں میں لگا لیگا تو یہ خواہش پوری ہو جائیگی۔

حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکیبِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

فرماتے ہیں۔ ہم نے عشق و محبت کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہ دیکھا کہ آخر کار حسرت و آرزو کا خون ہو گیا۔ عاشق و معشوق کا دل سے دل اگر مل بھی گیا تو وہ بھی گویا اک لب

افسوس بن کر آخیر میں ہاتھ ملتا ہی نظر آئیگا۔

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

کیموس اصطلاح طب میں ہضم جگر کا نام ہے جس میں غذا ہضم ہو کر خون بن جاتی ہے میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیماری غم کی فارغ البالی کی کیا تعریف بیان کروں۔ اور جو کچھ میں نے کھایا بے کیموس ہوئے وہ خون جگر ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بیماری غم میں میں نے ہمیشہ خونِ دل نوش فرمایا۔ اور خونِ دل کھانا غم و غصہ کھانے کے مقام پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے معنی اس شعر میں یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ بیماری غم میں مجھکو اس قدر فارغ البالی حاصل تھی کہ جو غذا میں کھاتا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ خونِ دل کھا رہا ہوں۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا بیت

میرزا صاحب معشوق سے کہتے ہیں کہ تم تو میری عاشقی پہ طعنہ زن تھے اور میرا مذاق اڑاتے تھے آئینہ دیکھکر اپنی صورت پر خود بھی عاشق ہو گئے۔ اب وہ دل نہ دینے کا غرور کہاں گیا۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عشق اجازت نہیں دیتا کہ معشوق اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کرے اور عاشق دیکھے اس مضمون کو مرزا صاحب نے اس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے اور قاصد کی خطا کو اپنی خطا ظاہر کرنے سے یہی مراد ہے کہ وہ ہم کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ اُس کے ہاتھ سے دوسرے شخص کا قتل ہونا دلِ محبت قبول کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا بیت

فرماتے ہیں جس دل کو نیازمندی عشق کے لیئے پیش کیا جائے وہ دل اب میرے پاس نہیں رہا یعنی ہجر کے صدمے، بیوفائی کے رنج، بے اعتنائی کے قلق اتنے اٹھائے ہیں کہ میں عشق کی خدمت بجا لانے کے قابل نہیں رہا۔ دوسرے مصرع میں فخریہ کہتے ہیں۔ میرا دل درحقیقت

حسن کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل تھا اور پیش بھی کیا گیا تھا اور مجھ کو اس دل پر کسی زمانہ میں ناز بھی تھا مگر اب وہ دل صدمے اٹھاتے اٹھاتے کسی قابل نہیں رہا۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ میں دنیا سے جاتا ہوں حسرتِ ہستی کا داغ لئے ہوئے یعنی تشنہ سے مجبور ہو کر میں نے جان دی ہے۔ میرا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا۔ دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے یعنی میں بجھی ہوئی شمع ہوں محفل کے قابل نہیں رہا قاعدہ ہے کہ جب شمع بجھتی ہے تو بہت دیر تک جھلکتی رہتی ہے اور وہ گویا داغِ حسرتِ ہستی ہے۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ عاشق کی حالتِ زار و نزار دیکھ کر قاتل کو رحم آ گیا اور اس نے قتل پر آمادہ ہو جانے کے بعد قتل کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا۔ اب مجھ کو اپنے مرنے کی اور ہی کچھ تدبیر کرنی چاہیے قاتل کا سہارا تو میری حالتِ زار نے مٹا ہی دیا اور حالتِ زار اس بات کی مقتضی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مر جانا چاہیے۔

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ آئینہ جس طرح عکس قبول کرتا ہے کچھ امتیاز نہیں کرتا بعینہٖ اسی طرح کی کیفیت دلِ عارف اور اہلِ دنیا کی ہے۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پہلو لئے ہوئے ہے۔ اگر حقیقت کی طرف اس شعر کو لے جانا چاہو تو مطلب یہ ہو گا کہ دلِ عارف پر اچھی بری دونوں شئیں منعکس ہوتی ہیں۔ اور اگر اس شعر کے معنی مجازی لے جائیں گے تو یہ مطلب نکلے گا کہ اہلِ دنیا کو اچھے برے کلام کا فرق محسوس نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ناقص و کامل کا فرق سمجھتے نہیں

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ شوقِ خود نمائی نے نقابِ حسن کے بند کھول دئے ہیں یعنی ذرہ ذرہ میں تجلی

قطرہ قطرہ مظہر تجلیات الٰہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ناظر کی ظاہری آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ سوائے نظر کے کوئی حجاب درمیان میں باقی نہیں ہے چشمِ باطن وا ہو جائے تو حجاب ظاہری اُٹھ سکتے ہیں۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں رنج و آلام دنیا میں مبتلا رہا لیکن تیری یاد کسی وقت کسی حالت میں میرے دل سے نہیں ہٹی اور میں کبھی تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔ یہ اور اس سے اوپر کا شعر خاص تصوف کے رنگ میں ہیں۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں　　حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

فرماتے ہیں۔ اب دل سے باغِ وفا کی آرزو بھی مٹ گئی۔ حوصلہ پست ہو گیا۔ ہمت نے جواب دیدیا اور اس کا سبب یہ ہے کہ وفا کے بعد وفا کا صلہ حسرت و افسوس کے سوائے کچھ نہیں پایا۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مطلع کے مصرعِ ثانی پر دوبارہ مصرع لگایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ بیدادِ عشق سے میں نہیں ڈرتا اور یہ گریز خوف کے سبب نہیں ہے بلکہ اے اسد ظلم اُٹھانے والا دل جو میرے پہلو میں تھا اور جس پر مجھکو ناز تھا وہ دل باقی نہیں رہا۔ اب بیداد کون اُٹھائے۔

[illegible]

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فرماتے ہیں عشق نے تو میرے دل میں یہ وہم پیدا کر دیا ہے کہ ہائے غیر سے وہ محبت و خلوص کے ساتھ ملتا ہے اور عقل ساری عمر کے تجربہ کے بعد یہ کہتی ہے کہ بھلا وہ بے مہر جس کی خلقت میں محبت رکھی ہی نہیں گئی کس کا آشنا ہو سکتا ہے۔

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے　　گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

فرماتے ہیں۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ میخانۂ مکر و فریب کے ایک ایک ساغر کا حکم رکھتا

ہے اور یہ ساری نیرنگ سازی دنیا میں آسمان کے اشارہ سے ہو رہی ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ مجنوں کو دیکھیے تو جنون کی حالت میں اس کی باگ ڈور لیلیٰ ہی کے اشارہ سے ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

فرماتے ہیں۔ ارباب عجز یعنی انسان خاکی کا سرمایۂ ناز عشق ہے جس کے سبب ایک ذرۂ ناچیز صحرا بن جاتا ہے اور قطرۂ بے حقیقت دریا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان خاکی جو ایک بے اعتبار ہستی رکھتا ہے عشق الٰہی تک ترقی بہم پہنچا کر جس طرح ذرہ صحرا میں اور قطرہ دریا میں مل کر عین صحرا اور عین دریا کہلانے کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان ذات باری تعالیٰ تک عشق کی بدولت رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فرماتے ہیں۔ رشک اور بدگمانی دونوں بے لطف کر دینے والی باتیں ہیں۔ باہم ہم دونوں کو ان دونوں باتوں سے قطع نظر کر لینی چاہیے۔ اس لیے کہ زانو میرا رفیق ہے۔ میں ہمیشہ سر بزانو رہتا ہوں اور آئینہ تمہارا آشنا ہے۔ اس سے تم ہر وقت مشغول رہتے ہو۔ بہتر یہ ہے نہ تم شکایت کرو نہ میں برا مانوں۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عاقبت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مجھے اس وحشی دل سے پالا پڑا ہے جو ایک آفت کا ٹکڑا ہے اور عاقبت کا دشمن ہے یعنی آرام سے مجھکو اپنے گھر میں بیٹھنے ہی نہیں دیتا۔ عشق کے سودے میں آوارہ کر کے گلی گلی کوچہ کوچہ لیے پھرتا ہے۔

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرماتے ہیں۔ اے اسد کوہکن نے جو کوہ بے ستون کو تراشا اس سے اس کی یہ غرض تھی کہ ایک تصویر سایہ دار شیریں کی بنا لوں وہ نادان یہ نہ سمجھا کہ کہیں پتھر سے سر مار کر بھی معشوق پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا عشق کامل نہ تھا۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا ۔ بیت

فرماتے ہیں میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی۔ تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہ بھی سنکر میرا رقیب بن گیا۔ اس واسطے کہ اول تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ جیسے جادو بیاں کی زبان سے۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی اور پھر بیان اپنا یہ مرزا صاحب کی خصوصیات میں سے ہے (از یادگارِ غالب)

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب　　آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

فرماتے ہیں۔ اگر اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان منظور نہ ہوتا تو وہ بزم غیر میں شراب مقدار سے زیادہ کیوں پیتے۔ اس کے بعد حسرت سے یہ فرماتے ہیں کہ یا رب اُن کو اپنی عالی ظرفی کا امتحان آج ہی منظور رہا۔ کاش یہ امتحان میری بزم میں ہوا ہوتا تو میں اُنکی زیادہ بیخودی سے لطف وصل زیادہ حاصل کر سکتا۔ دوسرا رشک کا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ میری موجودگی میں کیوں اُن کو اپنا امتحان منظور ہوا۔ بدقسمتی سے میرے واسطے یہ نظارہ نہایت دلخراش اور ضبط آزما تھا۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

مطلب یہ ہے۔ ہم اپنی حقیقت و ماہیت سے بالکل بے خبر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مکان عرش اعلیٰ پر واقع ہوا ہے۔ کاش ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا کہ ہم عرش پر منظر بنا کر اپنے مقام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے لیکن افسوس یہ ہے کہ مکان ایسی بلندی پر واقع ہوا ہے جس سے بلند تر اور کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے　　بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے ہم اُس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کرینگے کہ ہمارا اور یہ آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے (از یادگار غالب)

درد دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلادوں　　انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

فرماتے ہیں خط میں اپنا دردِ دل کب تک لکھتا رہوں یہ کمبخت تو ختم ہی نہیں ہوتا اور اس طولانی تحریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلیاں زخمی ہو گئیں اور قلم سے خون ٹپکنے لگا۔ بہتر یہ ہے کہ میں خود اُن کے پاس چلا جاؤں۔ اپنی زخمی انگلیاں اور اپنا خونچکاں خامہ اُن کو دکھا دوں۔ امید تو یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں دیکھ کر وہ خود اپنے دل میں میرے دردِ دل یعنی میری مصیبتوں کو سمجھ لیں گے۔

ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا

فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنا سنگِ آستاں اس لئے بدلا ہے کہ میرے سجدوں نے اُسے خراب یا ناپاک کر دیا تھا۔ مگر آپ نے ایسا کیوں کیا وہ تو خود ہی کثرتِ سجود سے گھس جاتا۔ اُس وقت نیا پتھر اُس کی جگہ لگا دیا جاتا۔

دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دشمن کو

فرماتے ہیں۔ ہم دشمن کی زبان سے دوست کی شکایت اُگلوا لیتے ہیں اور پھر خود بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور یہ اس غرض سے ہے کہ وہ کہیں ہماری چغلی یار سے جا کر نہ کرے گویا ہم نے شکایتِ یار میں اُس احمق کو اپنا ہمزبان بنا لیا ہے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

یہ بات مشہور ہے کہ آسمان اہلِ کمال کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ میرزا صاحب اپنی کسرِ نفسی سے فرماتے ہیں۔ ہم ایسے کہاں کے عقلمند اور فنِ سخن میں یکتائے روزگار تھے۔ اے غالب ہمارا دشمن تو آسمان بے سبب ہو گیا ہے اور یہ بات اور بڑھا دی ہے کہ بے سبب آسمان دشمن ہوا نہیں کرتا۔ آسمان کی دشمنی کے سبب دانائی اور یکتائی ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی دانائی اور ہنرمندی جس خوبی سے ظاہر کی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

غزل

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

میرزا صاحب نے یہ شعر اپنے حُسنِ کلام کی تعریف میں لکھا ہے یعنی میرے کلام کا فیض عام ہے اور اس سے مفت نفع حاصل ہو سکتا ہے اور وہ صرف اس غرض سے ہے کہ خریدار کی آنکھ پہ میرا

احسان رہے یعنی بصارت سخن فہمی اس سرمہ سے حاصل ہوتی ہے۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم   تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہوگی تو ہم ضبطِ نالہ کریں گے اور اس کا اثر ضرور ہے کہ تجھ تک پہنچے گا۔ نالہ دل سے نکلتا ہے اور ضبط کی حالت میں وہ دل ہی میں دھوئیں کی طرح گھٹیگا۔ مثل مشہور ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے تیرے دل تک اسکا اثر پہنچیگا اور انجام کار تیرے چہرے سے وہ اثر ظاہر ہوگا۔

بہت

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں   بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

فرماتے ہیں اہل دنیا راز حقیقت سے خبردار نہیں ہیں۔ ہر شخص کی طبیعت میں فخر و ناز کا ایک مادہ ہے جو سب کے دلوں میں یہ وہم پیدا کر دیتا ہے کہ ہم نے یہ کام اچھا کیا اور ہماری تدبیر سے یہ کام بن پڑا۔ حالانکہ جو کچھ ہے سب اُس کی طرف سے ہے۔ بغیر حکم الہیٰ کے یہاں کچھ نہیں ہوتا لطفِ الہٰی کو بادِ صبا سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ   صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

بزمِ قدح۔ بزمِ شراب۔ صیدِ ز دام جستہ۔ وہ شکار جو جال میں پھنس کر نکل گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بزمِ مے نوشی سے عیش و عشرت کی تمنا رکھنی ایک ایسا شکار ہے جس پر قبضہ نہیں رہ سکتا۔ عیش و عشرت کو دنیا میں ثبات حاصل نہیں ہے۔ نازک خیالی اس شعر میں یہ ہے کہ شراب خواری سے تھوڑی دیر کے لئے جو رنگ چہرے پر آ جاتا ہے وہ نشہ اُتر جانے کے بعد قائم نہیں رہتا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

فرماتے ہیں۔ گناہ کا عذر کرنا ایک آسان بات ہے۔ گر ہم عذرِ گناہ بدتر از گناہ جانتے ہیں اس لئے عذرِ گناہ بھی نہیں کر سکتے۔ مگر ہماری ندامت اور شرمندگی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اگر رحمت اس کو عذرِ گناہ کی جگہ قبول کر لے تو کیا بعید ہے۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے   پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

فرماتے ہیں۔ شوقِ شہادت میں قتلگاہ کو اس خوشی کے ساتھ جاتا ہوں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولھا سہرا باندھے ہوئے چلا جاتا ہے۔ میں نے گویا خیالی زخموں سے نگاہ کے دامن کو بھر لیا ہے۔

جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

فرماتے ہیں۔ اسدؔ تیری نگاہِ لطف کے شوق و آرزو میں اپنی جان دینی چاہتا ہے اور پروانہ کو اپنا وکیل بنا کر تیری بزم میں داد چاہنے آیا ہے۔ جان دینے کا تماشہ پروانہ شمع پر جلکر تجھ کو دکھا دیگا۔ اسی طرح تو ایک نگاہِ گرم سے اس کی یعنی اسدؔ کی جان لے لے۔

غزل

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

فرماتے ہیں۔ وہ جور سے باز آگئے ہیں مگر ایسے ظالم ہیں کہ جور سے کیا باز آئینگے یعنی ہرگز ہرگز ستم نہ چھوڑینگے۔ اس لئے کہ جور سے باز آکر یہ فرماتے ہیں کہ اب ہم شرمندگیِ ستم کی وجہ سے تجھ کو منھ نہیں دکھا سکتے۔ عاشق سے چھپنا اس کے سامنے نہ آنا بھی تو ایک طرح کا ظلم و ستم ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس شعر میں شانِ توکل دکھا کر فرماتے ہیں کہ سات آسمان دن رات ہمارے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے لئے جو کچھ حکمِ الٰہی ہے اس کے سامان خود بخود مہیا ہو جائینگے ہم کیوں گھبرائیں اور پریشان ہوں۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی۔ اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو۔ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے اور نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ہم اس کو دوستی سمجھتے لیکن جب نہ دوستی ہو نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں۔ قطعِ نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ جیسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جنکا

ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب تفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا ہے
(از یادگار غالب)

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

خط کا جواب حاصل کرنے کا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ نامہ بر کے ساتھ ساتھ چلے جاتے ہیں اور اس شوق میں ایسے محو ہیں کہ یہ بھی یاد نہیں رہا کیوں نامہ بر کے ساتھ ہو لئے ہیں دوسرے مصرع میں تعجب سے ارشاد ہوتا ہے یارب اپنے خط کو ہم خود کیا پہنچائیں یہ تو ایک شرمناک بات ہے۔ اس بیان میں جو لطف ہے وہ محتاج شرح نہیں۔

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

موج خوں سے یہاں ایذا و تکلیف مراد ہے۔ فرماتے ہیں ہمیں خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے مگر اب آستانِ یار پر آ جمے ہیں اور دھونی دیدی ہے تو یہاں سے اُٹھکر کیا جائیں گے اب تو مر ہی کے اُٹھیں گے۔

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہوگی۔ اب دیکھیے مرنے کے بعد کیا حالت دکھاتے ہیں جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔ (از یادگار غالب)

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اس مقطع میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں اور دونوں لطف سے خالی نہیں ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ دریافت کرتے ہیں غالب کون شخص ہے اور کیسا آدمی ہے۔ مشورہ طلب یہ بات ہے کیا ہم صاف صاف یہ کہدیں کہ وہ تمہارا عاشق اور دلدادہ ہے۔ اس میں کچھ قباحت تو نہ ہوگی دوسرے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں یعنی تجاہل عارفانہ کرتے ہیں۔ اب ہم کو کوئی صلاح بتلائے کہ ہم اس کا جواب اُن کو کیا دیں۔

غزل

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

فرماتے ہیں۔ لطافت میں جب تک کثافت شامل نہ ہو جائے جلوہ نمائی کی قابلیت پیدا نہیں کر سکتی۔ مصرع ثانی اس بات کو ثابت کرتا ہے یعنی بادِ بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعے سے ظاہر ہوا کرتا ہے گویا چمن بھی سبزی کے اعتبار سے آئینۂ بادِ بہاری کا زنگار ہوا کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ کثافتِ زنگارِ چمن لطافتِ جلوۂ بادِ بہاری کے باعث سے ہے۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے کو بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی موجود ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا۔ یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔ (از یادگارِ غالب)

غزل

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائیگا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہو جائیں گے گویا قطرہ دریا میں غرق ہو جائیگا اور یہی اس کا مقصود ہے۔ پس درد کا حد سے گزر جانا ہی اس کی دوا ہو جانا ہے۔

(از یادگارِ غالب)

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ میرا نوشتۂ قسمت قفلِ ابجد کی طرح واقع ہوا تھا۔ قفلِ ابجد اس کو کہتے ہیں جس کے حلقوں پر حروفِ ابجد کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کا بنانے والا حروفِ مفردہ سے ایک فقرہ ترتیب دے لیتا ہے۔ کھولتے وقت جب وہ فقرہ مرتب ہو جاتا ہے تو قفل کھل جایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرا نوشتۂ قسمت یہی تھا کہ جب تجھ سے ربطِ دلی پیدا ہو جائے تو جدائی حاصل ہو۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ دل کی تکلیف رفع کرنے کے واسطے اس قدر تدبیروں کی کشمکش ہوئی کہ دل کا کام تمام ہو گیا۔ دوسرے مصرع میں اس کی مثال پیش کرتے ہیں یعنی جس طرح گھستے گھستے گرہ کا

ہے نہ ڈورا باقی رہتا ہے۔ میرے دل کو اس کے علاج نے تمام کر دیا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اس شعر کا لطف وجدانی ہے۔ بیان میں نہیں آ سکتا۔ فرماتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پر طرح طرح کے لطف اور قسم قسم کی عنایتیں ہوتی تھیں۔ اب ایک یہ وقت ہے کہ ہم پر جفا بھی نہیں کرتے۔ بیزاری، خفگی، نفرت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ ستم کرنا بھی ناگوارِ خاطر ہے۔ اللہ اللہ اس قدر اربابِ وفا کا دشمن ہو جانا۔

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مسئلۂ استحالۂ عناصر کے اب تک ہم قائل نہ تھے مگر جب دیکھ لیا کہ ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے ہمارا گریہ دمِ سرد سے بدل گیا تو امتحان کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ پانی ٹھنڈی ہوا سے بدل جایا کرتا ہے۔

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ بھلا کہیں گوشت سے ناخن بھی جدا ہوا کرتا ہے۔ ہم اپنے دل سے تیری فندق بند انگلیوں کا خیال کیونکر مٹا سکتے ہیں۔ مٹ ہی نہیں سکتا یعنی یہ امر ناممکن الوقوع ہے۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی غمِ فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ (از یادگارِ غالب)

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس   کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ اگر پھولوں کی خوشبو کو تیرے کوچہ میں پہنچنے کی ہوس و آرزو نہیں ہے تو کیسے یہ بادِ صبا کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتی پھرتی ہے۔

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

آئینۂ فولادی پر برسات کی ہوا سے زنگ آ جاتا ہے۔ میرزا صاحب مثال کے طور پر فرماتے

ہیں کہ صرف باغ و صحرا ہی میں موسم بہار کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ آئینۂ فولاد بھی اس سے متاثر ہوتا ہے مطلب یہ ہے موسم بہار کی ہوا سے فرحت و انبساط حاصل کرنی چاہیئے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ   چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

فرماتے ہیں۔ اے غالب باغ میں رنگ برنگ کے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھکر یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ چشم حقیقت بیں کو ہر رنگ میں وا ہو جانا چاہیئے۔ یعنی ہر طرح کے سیر و تماشے سے اچھا برا نتیجہ اخذ کرنا چاہیئے۔

ردیف بائے موحّدہ

غزل   پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب   دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ وہ وقت آگیا ہے کہ موج شراب اُڑنے کے لئے اپنے بازو کھولے اور بطِ مے کو تیراکی کا شوق رکھنے والا دل موج شراب عطا کرے۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتا ہے تو سنگ مرمر کے حوضوں میں اس کو بھر دیا جاتا ہے۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن کے بعد اُسکا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت نوعمر لڑکے ان حوضوں میں اُتر کر پاؤں سے روندتے ہیں اس کے بعد مٹی کی منہ بند صراحیاں اس میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بطِ مے اس صراحی کو کہتے ہیں۔ مسامات کے ذریعہ سے عرق انگور چھنکر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔ شراب ناب خاص اس شراب کو کہتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ پھر بہار آگئی ہے اور شراب کی خوشبو ہوا پر پھر اُڑنے لگی ہے پھر صُراحیاں بطوں کی طرح سے حوضوں میں تیرتی پھرتی ہیں۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

اربابِ چمن۔ درختانِ چمن۔ فرماتے ہیں۔ تاک کے سایہ میں ہوا اس قدر نشاط انگیز ہے گویا موجِ شراب بن گئی ہے۔ درختوں کا جھومنا ہوا کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ سیہ مستی نشہ کی وجہ سے ٹہنیاں جھوم رہی ہیں۔

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ اعتدال سے شراب پینے والوں کا ذکر نہیں ہے وہ تو تعریف سے مستثنیٰ ہیں وہ لوگ جو شراب بے انتہا پیتے ہیں اور دماغ اُن کا کثرتِ نشہ سے معطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی اُن کو بادشاہی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کا نشہ بیہوش کر دینے کے بعد بھی بالِ ہما کا حکم رکھتا ہے مشہور ہے کہ جس شخص کے سر پر ہما کا سایہ پڑ جاتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

فرماتے ہیں کہ برسات کے زمانہ میں اُفتادہ زمینوں پر بھی سبزہ پیدا ہو جایا کرتا ہے کیا عجب ہے کہ بادِ بہاری موجِ ہستی کو موجِ شراب بنا دے۔ مطلب یہ ہے۔ بہار کا موسم طبیعتوں میں جوش و ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

چار موج اُٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ جوشِ طرب ایک دریائے طوفان خیز ہے جس میں یہ چار موجیں یعنی موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب بلند ہوا کرتی ہیں۔

جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ بارش سے درختوں میں جس طرح قوتِ نمو پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح موجِ شراب سے شراب خواروں کے دلوں میں اُمنگ اور جوش پیدا ہو جایا کرتا ہے یعنی شراب ایک قسم کی قوتِ نامیہ ہے جو انسان کے دل میں نشو و نما کے ساتھ فخر و ناز کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ انگور کی بیلوں میں مادۂ شراب اسی طرح دوڑ رہا ہے جس طرح رگوں میں خون دورہ کرتا ہے اور خون کے دورہ سے جیسے انسان کا چہرہ گل رنگ ہو جاتا ہے ویسے ہی انگور کی بیلوں میں موجِ شراب سے سبزی و شادابی پیدا ہو گئی ہے گویا سبزی و شادابی کا پیدا ہونا پرواز ہے۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

فرماتے ہیں۔ رنگ برنگ کے پھولوں نے کھل کر خیالی رستوں پر چراغاں کی بہار پیدا کر دی

ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ شعور میں موج شراب جلوہ نما ہے۔

نشہ کے پردے میں ہے محو تماشائے دماغ   بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب

فرماتے ہیں۔ موج شراب نشہ کے پردے میں محو تماشائے دماغ ہے اور یہ اس واسطے ہے کہ نشو و نمائی کا شوق رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خیال ترقی کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے اسی طرح شراب کا نشہ دماغ میں پہنچکر بڑھتا رہتا ہے۔

ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل   موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موج شراب

فرماتے ہیں۔ کیفیت فصل بہاری اور کیفیت موج شراب نے زمانہ بھر میں طوفان مچا رکھا ہے یعنی فصل بہاری نے سبزہ و گل بے انتہا پیدا کر دئے ہیں اور نشۂ شراب نے نشاط و طرب بے حد مہیا کر دی ہے گویا دنیا میں ان دونوں چیزوں کا طوفان آگیا ہے۔

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسم گل   رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب۔

فرماتے ہیں موسم گل کا جوش بتا رہا ہے کہ ہنگامۂ ہستی کی گرم بازاری خاص میرے ہی دم سے دنیا میں قائم ہے۔ گویا میں ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طرح موج شراب دعوے کر رہی ہے کہ میں قطرہ کو دریا تک پہنچانے کے لئے خضر رہ کا حکم رکھتی ہوں یعنی جس طرح قطرہ فنا ہو کر دریا میں جا ملتا ہے اسی طرح نشاء شراب روح کو بیخودی کے عالم میں اس کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ   پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ جلوۂ گل دیکھکر میرے ہوش اڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کے ساتھ ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ جب موج شراب ہوا پر اڑنے لگے یعنی جگہ جگہ شراب کی بھٹیاں بن جائیں۔

ردیف (ت)

غزل   **افسوس کہ دندان کا کیا رزق فلک نے   جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انگشت**

دیدان جمع دود بالکسر یعنی کرم فرماتے ہیں جن لوگوں کی اُنگلیاں موتیوں کے چھلّوں کے قابل تھیں ان کو آسمان نے مرنے کے بعد دیدان کا رزق بنا دیا ہے یعنی افسوس ہے چھوٹے چھوٹے کیڑے اُن نازک نازک اُنگلیوں کو قبر میں نوش فرما رہے ہیں جو موتیوں کے چھلّوں میں سجی تھیں۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

قاعدہ ہے کہ بوقتِ سفر یاد تازہ رکھنے کے لئے نشانی کے طور پر اکثر چھلّا دیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے مجھکو وقتِ سفر چلانے کے لئے بجائے چھلّے کے خالی اُنگلی دکھا دی اور یہ بات میرے لئے چھلّے کے داغ سے زیادہ ہو گئی۔ میں یہی نشانی اس کی یاد رکھوں گا کہ اُس نے مجھے نشانی کا چھلّا بھی نہ دیا۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم   تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

سخنِ گرم۔ اشعارِ نغز۔ فرماتے ہیں۔ اس مستی میں ایسے لطیف اور پاکیزہ اشعار لکھتا ہوں کہ میرے کلام میں مخالف عیب نکال ہی نہیں سکتے۔ حرف پر اُنگلی رکھنی عیب جوئی کرنے کو کہتے ہیں۔

[illegible]

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت   پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

مرنا ہے یعنی موت لازمی اور ناگزیر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص قیامت تک بھی زندہ رہا تو پھر کیا۔ مرنا لازمی ہے۔ قیامت کے دن مرے گا۔ قیامت کے دن مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے کہ روزِ قیامت زندہ ہونے کا دن ہے۔ اس دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہ ہو گا۔

جگر کو مرے عشقِ خوننابہ مشرب   لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

عشقِ خوننابہ مشرب۔ وہ عشق جس کے مذہب میں خون کھانا جائز ہو فرماتے ہیں عشق کی خوراک خون ہے میرے جگر کا خون پی کر عشق نے پرورش پائی ہے۔ اسی وجہ سے میرے جگر کو خوننابہ مشرب خداوندِ نعمت تحریر کرتا ہے۔

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں   مبارک مبارک سلامت سلامت

فرماتے ہیں۔ برخلاف دشمن شہیدِ وفا ہوں۔ مبارک ہو۔ اور شہیدِ وفا ہوں یعنی شہادت

پینے سے زندۂ جاوید ہو گیا ہوں اس لئے سلامت رہوں گا۔

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

فرماتے ہیں۔ اگر مشاہدۂ ذاتِ باری تعالیٰ نہ ہو اور کُنہ ذات کا ادراک حاصل نہ ہو سکا تو وجود اشیاء کی رنگ برنگ صورتیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے ہونے کا کامل یقین تو حاصل ہو گیا۔ ہمارا یہ یقین ہی سلامت رہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا کوئی ہے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

فرماتے ہیں میرے احباب میری بالیں پر اس کو اس وقت لائے کہ جب میں نزع کی کشمکش میں مبتلا تھا جس طرح چراغ ٹمٹما کر گل ہو جاتا ہے اسی طرح آنکھیں کھولتے ہی کھولتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں مطلب یہ ہے کہ یاروں نے بے وقت کوشش کی اور دوست نے بے موقع عنایت فرمائی۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست ازل

فرماتے ہیں۔ رخساروں پر سبزہ آغاز ہو جانے سے گرمیٔ حسن کی سرد بازاری ہو گئی معلوم ہوتا ہے کہ خطِ رخسارِ دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا جس کے پیدا ہوتے ہی حسن کے بازار میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ سارے خریدار رخصت ہو گئے۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

فرماتے ہیں۔ اے انجام کار نہ سوچنے والے دل اپنے شوقِ دیدار کو ضبط کر کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ طور پر حضرت موسیٰ کا ذرا سی دیدار کی جھلک دیکھ کر کیا حال ہو گیا تھا۔ جلوۂ دیدارِ دوست کی تاب کون لا سکتا ہے؟

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

فرماتے ہیں۔ حیرت کی خانہ ویرانی کو ملاحظہ کیجیے یعنی ہم حیرت میں مبتلا ہو کر اپنے گھر کو بھول گئے ہیں اور وہ گھر بغیر ہمارے ویران ہو گیا ہے ہم نے دوست کی رفتار کا تماشا دیکھا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ نقشِ قدم کی طرح بیخود و مدہوش ہو کر زمین پر گر پڑے ہیں اور یقین ہے تھوڑی دیر

میں مٹ جائیں گے۔

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

فرماتے ہیں۔ میں دوست پر مبتلا ہو کر مدت سے عشق کے آزار کا بیمار تھا۔ نیم جاں تو پہلے ہی سے تھا اب رشکِ دشمن کے ظلم نے رہا سہا بھی ہلاک کر دیا پہلے میں بیمارِ دوست تھا اب کشتۂ دشمن بن گیا افسوس کہ میرا انجام اچھا نہ ہوا۔

چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم عشق میں خون کے آنسو رو رہے ہیں مگر صرف اس وجہ سے کہ اس بیدرد کا دل ہمیں خون کے آنسو سے روتا ہوا دیکھ کر شاد ہے اس لئے ہم بھی کہتے ہیں چشمِ ما روشن یعنی اب ہم بھی اپنے دیدۂ پرخوں سے خوش ہیں۔ اس واسطے کہ ہمارا دیدۂ پرخوں ساغرِ سرشارِ دوست بن گیا ہے مطلب یہ ہے جس طرح شراب پیکر سرور حاصل ہوتا ہے اسی طرح اس بیدرد کا دل ہم کو خون کے آنسو روتا ہوا دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ اور اس کے خوش ہونے سے ہم بھی شاد ہیں۔

غیر کیوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست قطعہ

اس قطعہ میں کس خوبی کے ساتھ میرزا صاحب نے دشمن کے منافقانہ برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی جتایا ہے کہ دشمن کا اظہارِ التفات اس کی اپنی غرض پر مبنی ہونے کے علاوہ کمالِ تحریش بلکہ آتشِ رشک کا بھڑکانے والا ہے۔

تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

فرماتے ہیں۔ مذکورۂ بالا التفاتِ دشمن اس غرض سے بھی ہے کہ میں یہ بات سمجھ لوں کہ اسکی رسائی ان تک ہے اس لئے مجھ کو پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست کا فریب بھی دیتا ہے۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

فرماتے ہیں اسکی [illegible] جو میں اپنے ضعفِ دماغ کی شکایت کرتا ہوں یعنی یہ کہتا

جوں کہ تیری فضول گوئیوں سے میرا سر پھرا جاتا ہے تو وہ مکار زلف عنبر بو دوست کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ اس سے اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خوشبوئے زلف یار دماغ کی کمزوری کا علاج ہے۔ پھر تم کیوں میرے ساتھ باتیں کرنے سے ضعف دماغ کی شکایت کرتے ہو۔

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

فرماتے ہیں میرے چپکے چپکے رونے کا علاج شوخی گفتار دوست کا بیان سمجھ کر اسکی یعنی دوست کی باتوں کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاس لذت آزار دوست

آپ فرماتے ہیں کہ دشمن کی ستم آمیز مہربانیوں کی شکایت کی جائے یا ظلم دوست کی شکر گزاری بیان ہو۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست

فرماتے ہیں۔ اے غالب یہ غزل اپنی مجھ کو دل سے پسند ہے۔ اس واسطے کہ اسکی ردیف میں لفظ دوست بار بار آیا ہے جو لفظ ختم شعر پر قافیوں کے بعد بار بار آتا ہو اسکو ردیف کہتے ہیں۔

ردیف جیم

غزل گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

حلقۂ بیرون در سے دروازہ کی محراب مراد ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں گلشن میں بہار آگئی ہے جس لئے دوسرا بندوبست کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حلقۂ بیرون در یعنی محراب در قمری کا طوق بنگئی ہے آج جو شخص چمن کی سیر کو باغ میں آئیگا وہ قمری کی طرح گرفتار چمن ہو جائیگا۔ قاعدہ ہے بہار کے موسم میں جوش جنوں ہوا کرتا ہے آجکل باغ کی ہوا اور سیر چمن جنوں خیز ہے۔

آتا ہے یک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

فرماتے ہیں۔ آج میری ہر آہ کے ساتھ یک میرے دل کا ٹکڑا ہمراہ آتا ہے۔ تار نفس کی کمند نے تو شکار کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج میری آہ میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور اس کا اثر خود میرے

دل پر ہو رہا ہے۔ اس لئے مجھ کو اپنی آہوں سے کامیابی کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل　　سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے آج

فرماتے ہیں۔ اے عافیت یعنی آرام و راحت سے زندگی بسر کرنے کے زمانے میرے پاس سے دور ہو جا اور اے انتظام تو بھی اس گھر سے رفو چکر ہو۔ میرا سیلاب گریہ یعنی میرے اشکوں کا طوفان اب میرے گھر کو گرانے والا ہے۔ آج کے بعد میری زندگی کے دن مصائب و تکالیف میں گزرینگے تم دونوں میرے ساتھ کیوں ایذا سہتے ہو۔

تو ہم مریض عشق کے بیماردار ہیں　　اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

فرماتے ہیں معشوق مریض عشق پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تیرا کوئی بیماردار نہیں ہے جو وقت پر دوا پلائے اور پرہیزی غذائیں کھلائے بے تدبیری اور بد پرہیزی سے مرض بڑھتا جاتا ہے میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم مریض عشق کے بیماردار بنتے ہیں اور اس کی دوا وغیرہ کی نگرانی ہمارے ذمہ ہے لیکن پہلے یہ بات طے ہو جانی چاہیے کہ مریض عشق اگر اچھا نہ ہوا یعنی دوائے وصل سے بھی اس کا مرض عشق زائل نہ ہوا تو مسیحا یعنی معشوق کی کیا سزا تجویز کی جائے میرزا صاحب کا عندیہ یہ ہے کہ مریض عشق کسی طرح صحت یاب ہو ہی نہیں سکتا۔

ردیف جیم فارسی

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

فرماتے ہیں۔ انسان کو امید و آرزو ناکامیابی کی حالت میں بھی ترک نہ کرنی چاہیے اگر شراب نہیں ہے تو بھی ساغر کا انتظار کھینچنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کامیابی کی توقع کسی حالت میں نہ چھوٹنی چاہیے۔ انتظار کھینچنا اور شراب کھینچنی دو محاورے ہیں۔

کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ　　برنگ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

فرماتے ہیں۔ میرے آئینہ کمال کی گرمی و سعی کا حال مجھ سے نہ پوچھ۔ اہل نظر کی تلاش و جستجو میں اتنی صعوبتیں اور تکلیفیں میں نے اٹھائی ہیں کہ اب میرے آئینہ کمال کا جوہر یعنی آنکھیں

میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ قدردان کمال کے نہ ملنے سے مایوس ہو کر صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا ہی مجھ کو مل جائے جو جوہر کمال کو میرے آئینۂ کمال سے کانٹے کی طرح کھینچ لے۔

مجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل　　کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

فرماتے ہیں بستر پر لیٹے لیٹے معشوق کا انتظار کھینچنا یا نیند کا انتظار کھینچنا کھنچی ہوئی راحت جیسی ہے۔ وعدۂ یار کا یہ اشارہ نہیں ہے کہ عاشق پلنگ پر لیٹا ہوا بستر کے ناز اٹھائے۔ اگر معشوق وعدہ پر نہیں آیا ہے تو نہ آنے کی وجہ دریافت کرنے میں کوشش کی جائے۔ بالکل ناامیدی کی صورت میں بادیہ گردی صحرا نوردی جامہ دری نالہ کشی بہت سے کام ایسے ہیں کہ جن میں صرف ہو کر عاشق وقت گزار سکتا ہے۔ اور اگر صرف نیند کے انتظار میں آدمی پڑا کروٹیں بدل رہا ہے تو اس کے لئے بھی بہت شغل ممکن ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے ہر قسم کے آدمی کے واسطے راحت طلبی ممنوع سمجھی جاتی ہے۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس　　بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

فرماتے ہیں۔ نرگس ٹکٹکی باندھے ہوئے بنگاہ حسرت تیرا منھ تک رہی ہے اور میرے سامنے تجھ کو کسی کا دیکھنا اظہار رقابت ہے۔ لیکن یہ میری رقیب یعنی نرگس چشم کی بھی اندھی ہے اور قلب کی بھی اندھی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر تجھ کو شراب پینی چاہئے۔

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز　　نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

فرماتے ہیں۔ ناز و ادا جو تجھ کو اللہ تعالیٰ نے بخشے ہیں وہ گویا اس کی امانت ہے۔ اس امانت کا حق نیم غمزہ سے ادا کرو اگر پورا غمزہ ہو جائیگا تو فوراً عاشق کی جان نکل جائیگی۔ اس لئے تجھ کو لازم ہے کہ نیم غمزہ سے کام لے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر زخم جگر میں وار کرنے کے بعد خنجر چھوڑ دیا جائے تو بسمل فوراً جاں بحق ہو جائیگا اور اگر وار کرنے کے بعد خنجر زخم میں سے کھینچ لیا جائے گا تو مجروح کے مرنے میں ضرور دیر لگے گی اور شاید جانبر بھی ہو جائے۔ اس لئے نیم غمزہ سے کام لینا بہتر ہے۔ دوسری صنعت الفاظ اس شعر میں یہ بھی رکھی گئی ہے کہ نیام کا الف نکل جانے کے بعد نیم رہ جاتا ہے۔ اور نیم غمزہ ہی سے کام لینے کو عاشق کہتا بھی ہے۔

میرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں   بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

فرماتے ہیں میرے پیالہ میں صہبائے عشق چھپی ہوئی ہے جس میں آتشِ سیال سے زیادہ گرمی ہے۔ اس کی مناسبت سے کباب بھی دلِ سمندر کا ہونا چاہئے (سمندر ایک جانور ہوتا ہے جو آتشکدہ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ سے باہر آکر فوراً مرجاتا ہے) کہتے ہیں سمندر کے سینہ میں سے کبابِ دلِ سمندر کھینچ لے۔

ردیف واو

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد   بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد بہت

فرماتے ہیں حسن کو ناز و انداز کی کشمکش سے میرے مرجانے کے بعد رہائی ہوگئی۔ بارے اہلِ جفا و اہلِ ستم یعنی تمام معشوق آرام سے ہوگئے۔ جب تک میں زندہ تھا تو ہر حسین مجھ کو اپنا فریفتہ بنانے کے واسطے اظہارِ غمزہ و ناز میں پھنسا رہتا تھا۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا   ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ اب کوئی آدمی منصبِ عشق کے قابل باقی نہ رہا یہ عہدہ خالی ہوگیا اور اسی کے ساتھ میں ناز و ادائے معشوقاں بیکار و معطل ہوگئے۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے   شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ شمع کے بجھتے وقت جو شعلۂ آتش دھواں بنکر ظاہر ہوتا ہے وہ درحقیقت دھواں نہیں ہوتا بلکہ شمعِ کشتہ کے سوگ میں شعلہ سیہ پوش ہوجاتا ہے۔ اسی طرح عشق کا شعلہ میرے مرجانے کے غم میں سیہ پوش ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں سوز و گدازِ عشق کا مرتبہ رکھتا تھا۔

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی   ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

فرماتے ہیں خاکِ قبر میں ہمارا دل خون ہوگیا ہے۔ اس غم میں کہ معشوقوں کے ناخن ہمارے مرجانے کے بعد حنا کے محتاج ہوگئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نازنین ہمارے خون کی مہندی ہاتھوں میں لگاتے تھے اس لئے کہ حنا میں ہمارے خون کا سا شوخ رنگ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے مرجانے کے بعد

انھیں مہندی لگانی پڑی۔

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ جوہرِ ظلم بیداد کے ظاہر کرنے کا موقع باقی نہ رہا یعنی میں مر گیا اس لئے نگہِ ناز میرے بعد سُرمے سے خفا رہنے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ سے قدردانِ حسن کے مر جانے کے بعد حسینوں کو بناؤ سنگھار سے نفرت ہو گئی۔

ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ ان دیوانوں کے گریبانوں سے جو ہمیشہ گریبانوں کو چاک رکھتے ہیں چاک گریبان جُدا ہوتا ہے یعنی میرے مر جانے کے بعد چاک کسی گریبان کے پاس آکے بھی نہ پھٹکیگا اس سے پہلے گلے ملکر گریبانوں سے جُدا ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کاملوں سے زمانہ خالی ہو جائیگا۔ پھر کوئی میرا سا عاشقِ کامل پیدا نہ ہوگا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں۔ مئے مرد افگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ میرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو دو مکرر پڑھو۔ پہلے ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟ یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ ہمیں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کرو گے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائینگے (از یادگارِ غالب)

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی　　کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

فرماتے ہیں میں اس غم سے مرتا ہوں کہ میرے مرجانے کے ساتھ ہی مہر و وفا کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ اور پھر اتنا بھی کوئی نہیں ہے کہ مہر و وفا کی تعزیت میرے بعد کریگا۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب　　کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

فرماتے ہیں۔ اے غالب مجھ کو عشق کی تنہائی اور بیکسی پر رونا آتا ہے میرے مرجانے کے بعد کون اس کا میزبان بنے گا اور یہ سیلاب بلا یعنی عشق کس کے گھر جائیگا۔

ردیف ر

[illegible] بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار　　نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

فرماتے ہیں یہ در و دیوار جو حائل نظر ہیں اور نگاہ کو معشوق تک پہنچنے نہیں دیتے ہیں ان کے حاجب بن جانے سے ہمارا کچھ حرج نہیں ہے۔ ہماری نگاہ شوق تصور میں یار تک پہنچنے لگی ہے اور مشق تصور کا سبب بھی در و دیوار کا حجاب ہے گویا یہ حائل ہو کر نگاہ شوق کے بال و پر بن گئے ہیں یعنی انہی کی وجہ سے چشم تصور میں یہ قوت پیدا ہو گئی ہے۔

وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ　　کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

فرماتے ہیں میرے جوش گریہ نے ترقی کر کے گھر کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار گر کر دروازہ بن گئی ہے اور دروازہ ملبہ پڑ کر دیوار بن گیا ہے

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار　　گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ یہ سایہ در و دیوار نہیں ہے جو در و دیوار سے تھوڑے فاصلہ پر نظر آ رہا ہے بلکہ یار کے قدم رنجہ کرنے کی خوشخبری سن کر خود در و دیوار مہمان کے استقبال کے واسطے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانی مے جلوہ　　کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے شراب جلوہ کو تو نے اس قدر سستا کر دیا ہے کہ تیرے

دیکھ کے در و دیوار بھی تیری شراب دیدار سے مست ہو گئے ہیں۔

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ — کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ اگر تجھکو انتظار کا سودا سلف خریدنا منظور ہے تو آ اور تماشہ دیکھ کہ عالم انتظار میں میری نگاہ میں در و دیوار اس طرح سجی ہوئی ہیں جیسے دکانداروں کے ہاں بیچنے کا سامان دکانوں میں سجا ہوا ہوتا ہے۔ متاع نظر کی خریداری اگر تجھکو منظور ہو تو چلا آ۔

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے — ہوئے فدا در و دیوار پہ در و دیوار

فرماتے ہیں۔ وہ میرے ہمسایہ میں آ کر آباد ہو گیا تو میرے در و دیوار کا سایہ اس کے در و دیوار پہ قربان ہونے لگا۔

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھکر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ تیرے فراق میں ہمارے گھر کی آبادی ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے (آنکھ میں کسی چیز کے کھٹکنے کا لازمی نتیجہ آنسو کا جاری ہو جاتا ہے) ہم اپنے در و دیوار کو دیکھکر ہمیشہ تیری یاد میں رویا کرتے ہیں۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے — کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

فرماتے ہیں میں نے جب کبھی دل کھول کر رونے کا ارادہ کیا ہے تو فوراً در و دیوار میرے قدموں پر گر پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرے رونے میں ایسا اثر ہے کہ تکمیل ارادہ سے پہلے تاثیر ظاہر ہو جاتی ہے۔

نہ پوچھ بیخودیٔ عیش مقدم سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

فرماتے ہیں۔ سیلاب آنے کے وقت بیخودیٔ عیش کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ گویا در و دیوار کو حال آجاتا ہے اور وہ مصروف رقص ہو جاتے ہیں۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں — حریف راز محبت مگر در و دیوار

افشاء راز کی نسبت فارسی کا مقولہ مشہور ہے کہ "دیوار ہم گوش دارد"۔ میرزا صاحب اس مقولہ

کی مخالفت میں فرماتے ہیں کہ اپنا راز محبت اے غالب زمانہ میں کسی سے نہ کہہ سوائے در و دیوار کے یعنی اگر تو اپنا راز محبت چھپا نہیں سکتا اور کسی کے سامنے کہنا ضروری سمجھتا ہے تو بجائے انسان کے در و دیوار سے کہہ۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ راز محبت کبھی منہ سے نکالنا نہ چاہئے۔

بیت
گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جائیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

مرزا صاحب نے اس مقطع میں نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب کبھی معشوق سے یہ شکایت کی ہے کہ تو کبھی میرے گھر نہیں آتا تو اس نے جواب میں شوخی سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں تمہارا گھر نہیں جانتا۔ ورنہ ضرور آتا۔ اب مرزا اپنا قدیمی گھر چھوڑ کر معشوق کے دروازہ پر آ پڑے ہیں اور اس سے یہ کہتے ہیں کہ میں نے تیرے دروازہ پر بغیر تجھ سے اجازت لئے گھر بنا لیا ہے لیکن اب بھی تو میرے گھر کو بغیر میرے کہے ہوئے نہیں جان سکتا۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کہتے ہیں کا اشارہ معشوق کی طرف ہے یعنی وہ کہتے ہیں اور اس وقت کہتے ہیں کہ جب مجھے اپنی طاقت گویائی نہ رہی کہ میں اپنا حال دل مفصل اور مشرح بیان کرسکوں میں کسی کا مدعا دلی بیان کئے بغیر کیونکر سمجھ سکتا ہوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جب مجھ میں حال بیان کرنے کی قوت نہ رہی تو وہ ستم ظریف شوخی سے مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تو اپنے دل کی بات بیان تو کرتا ہی نہیں۔ میں بغیر کہے تیرا مدعا دلی کس طرح سمجھ سکوں۔

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

فرماتے ہیں میں ایسے معشوق ستم شعار پر عاشق ہوا ہوں جس کے نام کے ساتھ ہر شخص ستمگر کا لفظ ضرور استعمال کرتا ہے۔ ایسے ظالم سے کس طرح مدعا براری ہوسکیگی۔ لیوے کا لفظ بہت قدیمی زبان کا ہے۔ مرزا صاحب کو یہ اردو دیوان لکھے ہوئے تقریباً ایک سو بارہ برس گزرے اب یہ اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ متروک ہو گئے۔ آخر عمر میں مرزا صاحب نے بھی ایسے صدہا الفاظ ترک کر دیئے تھے۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم　　　سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

فرماتے ہیں میرے دل میں کسی کی طرف سے بغض و عداوت نہیں ہے۔ میں ایک صاف باطن آدمی ہوں سب سے صاف ملتا ہوں۔ اگر کسی کی طرف سے میرے دل میں کچھ بُرائی ہوتی تو فوراً اس کو ظاہر کر دیتا۔ گو اس کے اظہار میں میری جان پر ہی بن جاتی تو میں ہرگز کچھ پروا نہ کرتا۔ سچ یہ ہے کہ میرزا صاحب اپنی زندگی میں حسن اخلاق کا ایک نمونہ تھے۔ شعر کی خوبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا　　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

چھوڑے کا لفظ دونوں مصرعوں میں اس بے تکلفی کے ساتھ باندھا حسن بیان پر دال ہے۔ معنی شعر کے بالکل صاف ہیں۔ جو شخص کسی بت کافر کو پوجے گا خلق خدا ضرور اُس کو کافر کہیگی۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

فرماتے ہیں۔ دشنہ و خنجر سے میری مراد ناز و غمزہ ہے۔ یعنی محسوسات سے تشبیہ دیے بغیر ہر کس و ناکس مطلب سمجھ نہیں سکتا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس شعر میں بھی مسطورۂ بالا شعر کا مضمون دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مصرع ثانی میں بات کا لفظ محذوف کر کے حسنِ بیان کو دوبالا کر دیا ہے یعنی بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات　　　سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

یہ شعر مرزا صاحب کے حسبِ حال ہے (آخر میں ثقلِ سماعت بہت بڑھ گیا تھا) نئی قسم کی شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں بہرا ہوں جب تک بلند آواز سے دو تین مرتبہ کوئی بات کہی نہ جائے میں سُن نہیں سکتا۔ اس موقع پر آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ یہ موقع تو دُگنا التفات فرمانے کا ہے نہ کہ آزردہ ہونے کا۔

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض　　　ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

صنعتِ معنوی کے علاوہ اس مقطع میں بہت بڑی خوبی یہ رکھی گئی ہے کہ سب کچھ عرض حال کر لینے کے بعد بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں کہا۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھکر   جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

کمالِ رشک کا اظہار اس خوبی سے کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ رخِ یار کی چمک دمک دیکھکر مجھکو جل جانا چاہئے تھا۔ کیوں نہ میں جل گیا۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر جلا جاتا ہوں۔ یعنی رشک و حسد نے میرے دل میں آگ لگا دی ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے   سرگرم نالہائے شرربار دیکھکر

فرماتے ہیں جس ارادت سے آتش پرست آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی ذوق و شوق سے میں آہِ شرربار کرنے میں سرگرم رہتا ہوں میری یہ حالت دیکھکر اہلِ جہاں مجھکو آتش پرست کہتے ہیں۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا   رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ تم نے جفا کو عام کر دیا کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اور تمہارے اس فعل نے عشق کی آبرو کو بٹا لگا دیا یعنی موردِ جفا ہمیشہ عاشق کی ذات ہوا کرتی ہے۔ تم رقیب پر بھی جفا کرتے ہو۔ رقیب کے دل میں تمہارا عشق نہیں ہے۔ اس پر تمہاری جفائیں دیکھکر میں کہہ سکتا ہوں کہ تم بے سبب آزار ہو اور یہی بات میرے کھنچ جانے کا سبب ہے۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے   مرتا ہوں اُسکے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہو کر سامنے سے آ رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ قریب آ کر ضرور مجھکو قتل کریگا لیکن اس کے دستِ ناز میں تلوار کو دیکھکر میں جوشِ رشک سے مرتا ہوں (پہلی ندرت تو اس شعر میں یہ ہے کہ ہنگامِ قتل عاشق کے دل میں بجائے خوشی یا خوف کے رشک پیدا ہو گیا ہے) ہنوز قاتل کے قریب آنے اور تلوار کے وار کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی ہے یہاں پہلے ہی سے آثارِ موت شروع ہو گئے ہیں۔ دوسری خوبی لفظِ رشک نے یہ پیدا کر دی ہے کہ وہ ہاتھ جس میں معشوق نے قتل کرنے کو چھوٹی سی تلوار لے رکھی ہے کیا اس قابل نہ تھا کہ

عاشق کی گردن میں حائل ہوتا یا دل پہ تسکین رکھنے کی غرض سے رکھا جاتا۔ ان دونوں باتوں کو چھوڑیے کم سے کم وہ نازک ہاتھ دست عاشق میں تو ہوتا) یہاں رشک کی دلیل یہ بھی پیدا ہوگئی ہے کہ تلوار اس کے دستِ نازک میں کھنچکر بری بن گئی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزی ہے موج مے تری رفتار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ شیشہ کی گردن پر خلق خدا کا خون ثابت ہوگیا ہے اس لئے خوف سے موج مے تیری رفتار کو دیکھکر کانپ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشہ کے عالم میں تیری رفتار زیادہ مستانہ ہوگئی ہے اور اس کو دیکھکر ایک زمانہ قتل ہو رہا ہے اگر تو شراب نہ پیتا تو بہت سے آدمیوں کا خون نہ ہوتا شراب کا نشہ لوگوں کے قتل کا سبب ہوا ہے۔ پس گردنِ مینا پر خون ثابت ہوگیا۔ نہ تو شراب پیتا نہ لوگ تیری مستانہ چال پر جان قربان کرتے۔

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس ہم کو ظلم کا خواہشمند دیکھکر اس ستمگار نے جفا ترک کر دی مطلب یہ ہے عاشق کی بڑی خواہش بھی معشوق پوری نہیں کرتا۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی جنسِ سخن کے ساتھ خریدار کے ہاتھ خود بھی بک جاتے ہیں لیکن طبع خریدار کی کسوٹی کو پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ کسوٹی کھوٹا کھرا شعر پرکھنے والی ہے بھی یا نہیں مطلب یہ ہے ہم اپنے قدردانِ سخن کو بھی پہلے آزما لیتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ کس حد تک ہمارا شعر سمجھ سکتا ہے اسکے بعد ہم خود اس کے قدردان بن جاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ میرزا کا کلام سمجھنے کو ایک غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے۔ ان کے معمولی سے شعر کی تہ میں بھی ایک ایسی بات چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ بہت ہی دشواری سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ زنار اور تسبیح میں ایک ہی ڈورا ہے یعنی نگاہ عارف میں یہ دونوں رشتے ہیں

منزلِ مقصود تک پہنچنے کے رشتۂ زنار کو بسبب صاف ہونے کے راہ ہموار سے تعبیر کیا ہے اور تسبیح کو اُس کے دانوں کے اُتار چڑھاؤ کے خیال سے نشیب و فراز کا رستہ قرار دیا ہے جس میں منزل تک پہنچنے کے لئے سو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھکر

فرماتے ہیں۔ ان آبلوں سے بہت گھبرا گیا تھا مگر جنگل کو کانٹوں سے بھرا ہوا دیکھکر دل کو خوشی پیدا ہو گئی۔ مطلب یہ ہے جب انسان کے دل کو عشق کی چٹک لگی ہوئی ہوتی ہے تو کیسی ہی تکلیفوں کا سامنا ہو ہمت نہیں ہارتا۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

معشوق کی صفات میں سے ایک صفت خوش گلوئی اور خوش بیانی بھی ہے خوش بیانی کی صفت طوطی میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ طوطی کی خوشنوائی مشہور ہے رشک کا مادہ جتنا عاشق میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ معشوق میں بھی ہوا کرتا ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مجھ سے ایسا بدگمان ہے کہ میں اگر آئینہ بھی دیکھتا ہوں تو اس میں زنگار کی سبزی کو دیکھکر میرا معشوق عکس طوطی سمجھتا ہے اور اس کو اس بات کا رشک پیدا ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرا عاشق طوطی کی خوشنوائی سے اپنا دل بہلاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کو میرا عشق جاتا رہیگا۔ اس لئے وہ اپنی بدگمانی سے زنگارِ آئینہ پر رشک کرتا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ میرزا فرماتے ہیں۔ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور۔ اس لئے کہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اس کے موافق اُس کو شراب دی جاتی ہے۔ پس کوہِ طور جو منجملہ جمادات کے ہے وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال ہے۔ تخیل کی جو اس میں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال

ہے (از یادگارِ غالب) یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں ایک نشتر ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا   یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

مرزا صاحب نے مصرع اولیٰ میں دو تین لفظوں سے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سر پھوڑنے کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ سر پھوڑنے کا موقع اور وقت گزر گیا مگر اس کی دیوار کو دیکھکر اب تک وہ تماشا آنکھوں کے روبرو پھر جاتا ہے۔ در و دیوار دیکھنے والوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

غزل

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر   میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

فرماتے ہیں۔ "آفتاب ایک قطرۂ ناچیز کے جذب کرنے میں وہ سرگرمیاں دکھا رہا ہے کہ اس کے دیکھنے سے میرا دل کانپا جاتا ہے۔ قطرہ اور قطرہ بھی وہ قطرہ جو نوکِ خار پر ٹھہر گیا ہے بہت ہی ناپائدار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے لئے جب ایسی سرگرمی کی ضرورت ہے تو دنیا کے بڑے بڑے کام تو بہت ہی دشواری اور محنت سے سرانجام پاتے ہونگے۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی   سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فرماتے ہیں۔ زندان میں حسنِ یوسف کے لئے آرائش کا سامان پیدا ہو گیا یعنی حضرت یعقوب کی سفیدی چشم قیدخانہ کے در و دیوار پر پھر رہی ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت یوسف کے تصور میں روتے روتے حضرت یعقوب کی آنکھوں کے کور ہو جانے کی طرف۔

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے   کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فرماتے ہیں میں نے اس زمانے میں فنا کی تعلیم پائی ہے جب مجنوں طفلِ مکتب تھا اور مکتب کی دیواروں پر حرف سرزد بچوں کی طرح لکیریں کھینچ کر لکھا کرتا تھا۔ لام الف ملکر لا ہو جاتا ہے اور لا نفی کا صیغہ ہے لا الٰہ سے حضرت صوفیہ کے ہاں نفی و اثبات کی ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں درسِ فنا میں قیس عامری پر سبقت رکھتا ہوں۔ اسلئے کہ مجھکو فنا کی تعلیم روزِ ازل میں ملی تھی۔

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے   بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

فرماتے ہیں۔ مجھ کو مرہم کے نسخے ڈھونڈنے تلاش کرنے بنانے لوگوں سے مانگنے سے فارغ البالی حاصل ہوجاتی۔ اگر دل کے زخم آپس میں نمکدان پر صلح کر لیتے۔ مطلب یہ ہے کہ تمنا اور صبر انسان کو تلاش اور جستجو کی تکلیفوں سے چھڑا دیا کرتا ہے۔

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا　　کہ پشت چشم سے جسکے نہ ہووے مہر عنواں پر

میرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں بہت بڑے مضمون کو بیان فرمایا ہے جسکی وسعت کے سامنے بڑے سے بڑا دفتر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا فرماتے ہیں۔ اقلیم عشق میں کوئی دفتر کی کتاب اغماض وناز اور انداز معشوقانہ سے خالی نہیں ہے اور ناز معشوقانہ ہمیشہ عاشق کے برخلاف حکم جاری فرماتا رہا ہے۔ فرہاد سر پھوڑ کر شیریں کے عشق میں مر گیا اور وصل نصیب نہ ہوا۔ قیس دیوانہ ہوکر جنگل میں جا پڑا۔ مگر لیلی نے وصل سے انکار ہی کیا۔ ایسے ہزاروں واقعات دنیا میں گزرے ہیں۔ میرزا کا دعوٰے یہ ہے کہ عاشق صادق ہمیشہ ناکام و نامراد ہی ہوا کرتا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی عاشق پیدا نہیں ہوا کہ جس سے معشوق نے اغماض وانکار نہ برتا ہو اور پشت چشم سے انکار پر مہر نہ کی ہو۔

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا　　کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

مرزا صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ مجھ کو اب تیرے سامنے ابر شفق آلود دیکھ کر یاد آگیا ہے کہ تیری جدائی میں اسی طرح گلستاں پر آگ برستی تھی۔ یعنی جب کبھی فرقت کے زمانہ میں باغ کی سیر کو جانے کا اتفاق ہوا ہے اور غنچہ و گل پر نظر پڑی ہے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ آگ برس رہی ہے سرخی رنگ کی مناسبت سے گل کو آگ سے تشبیہ دینی اور ہجر میں باغ کی سیر کا ناگوار گزرنا جس خوبی سے بیان کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا　　قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

فرماتے ہیں۔ تیرے شہیدان ناز کے ڈھیر پر سو بار قیامت آچکی ہے یعنی جب تیز ہوا چلی ہے ان کی خاک اڑ کر پریشان ہوگئی ہے اگر وقت معین پر قیامت آئی بھی تو تیرے شہیدان ناز کو

بکھر کر بھاگے گی۔ ان کی خاک باقی کہاں ہے وہ تو پہلے ہی برباد ہو چکی ہے۔

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مجبوری، مظلومی اور بیکسی کی تصویر لفظوں میں اس سے بہتر نہیں کھنچ سکتی۔ فرماتے ہیں۔ اے غالب ناصح کی سخت زبانی اور بیرحمی کی کیوں شکایت کرتا ہے اور کس لئے اس سے لڑتا ہے خاموش ہو رہ۔ صبر کر اس کے مقابلہ میں ہمارا بھی تو زور گریبان پر چلتا ہے جب زیادہ تنگ اور مجبور ہو جاتے ہیں تو ہم اس اندوہ و غم کی حالت میں اپنا گریبان پھاڑ لیتے ہیں۔ ناصح کی زبان چلتی ہے۔ وہ ہمیں برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے ہاتھ چلتے ہیں۔ ہم مظلوم اپنا گریبان پھاڑ لیتے ہیں۔ بے مثل مقطع لکھا ہے۔

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

فرماتے ہیں۔ ان کی کوئی بات بناوٹ اور فریب سے خالی نہیں ہوتی محبت کے پردے میں بھی دشمنی کا اظہار ہوا کرتا ہے اس لئے میں ہمیشہ ان سے ہوشیار اور بدگمان رہتا ہوں۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس شعر کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ یا رب جب میری زبان میں بلاغت اور صاف لفظوں میں اپنی وضع کے خلاف مدعا ادا ہی نہیں ہو سکتا اور وہ تو اپنے بھولے پن کے سبب میرے مطلب کو سمجھ نہیں سکتے یا جان بوجھ کر انجان بن جاتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان کو ہی دوسرا دل عطا فرمائے۔ اگر مجھ کو اور زبان نہیں ملتی۔ دوسرے معنی بقول حضرت مولانا حالی مرحوم و مغفور یہ ہیں کہ میرزا صاحب در پردہ ان لوگوں کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جو میرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہا کرتے تھے۔

ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

میرزا صاحب تیر و کمان کی پرانی تشبیہوں کو پیش پا افتادہ سمجھ کر نیا پہلو اختیار کرتے ہیں فرماتے ہیں۔ کمان ابرو سے اس کی نگہ ناز کو کوئی تعلق نہیں ہے یعنی نگہ ناز تیر تو ضرور ہے مگر کسی اور

ابرو نہیں ہے۔ یہ نگہِ ناز کا تیر دلی ارادہ کی کمان سے نشانہ پر لگا کرتا ہے۔ اسی واسطے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ خوشی کا پہلو اختیار کر کے عاشق کو تڑپاتا ہے کہیں غصہ کے پیکان سے قتل کرتا ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اٹھیں گے   لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور

فرماتے ہیں، تمہارے عشق میں ہر شخص جان و دل سے تنگ آ گیا ہے۔ بازاروں میں کم قیمت پر سودا مل جاتا ہے۔ ہم جان و دل اور خرید لائیں گے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ہم کے لفظ پر ہے۔ یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِّ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ۔ سب سے بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔ (از یادگار غالب)

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا   ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور

فرماتے ہیں خونِ جگر جوش کی حالت میں ہے کاش ایسا ہوتا کہ مجھ کو دیدۂ خوننابہ فشاں بہت سے مل گئے ہوتے تو ممکن تھا کہ میں دل کھول کر یعنی دل کی خواہش کے موافق روتا۔ اور خونِ جگر کے دریا بہا دیتا۔ جوشِ خونِ جگر کے عالم میں صرف دو آنکھوں سے کیا خاک رو سکتا ہوں۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے   جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

فرماتے ہیں معشوق کا یہ کہنا کہ ہاں 'اور وار کر'۔ ہاں ایک اور ہاتھ چھوڑ۔ ہاں ایک اور زخم لگا مجھ کو اس قدر پسند ہے کہ اپنی جان جانے کا مطلق غم نہیں۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا   ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

فرماتے ہیں۔ میرے دل و جگر میں پوشیدہ ہزاروں داغ ہیں۔ میں ان داغوں میں سے ہر روز صبح کے وقت ایک نیا داغ لوگوں کو دکھا دیتا ہوں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خورشید جہاں تاب معمولی طور پہ افقِ مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

لیتا۔ نہ اگر دل تمہیں دیتا۔ کوئی دم چین   کرتا۔ جو نہ مرتا کوئی دن۔ آہ و فغاں اور

میرزا صاحب سے معشوق نے یہ سوال کیا ہے۔ تو کوئی دم چین سے نہیں بیٹھتا اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ تو ہمیشہ فریاد ہی کرتا رہے۔ اس کے جواب میں میرزا کہتے ہیں کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرجاتا تو کوئی دن آہ و فغاں اور کرتا رہتا۔ باوجود تاکید لفظی کے (جس کو فارسی والوں نے جائز قرار دیا ہے) دونوں مصرعے عجیب پر لطف اور معنی خیز واقع ہوئے ہیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے   رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے۔ نہ آہ و نالہ۔ مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع ہے۔ فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اُسی قدر راہ دیتی ہے خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت موثر اور درد انگیز ہوتا ہے (از یادگار غالب)

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے   کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

فرماتے ہیں۔ دنیا میں اور شاعر بھی بہت اچھے اچھے ہیں لیکن یہ بات مسلم ہے۔ سب لوگ اتفاق کے ساتھ کہتے ہیں کہ میرزا غالب کا انداز بیاں سب سے جداگانہ ہے (یہ بات میرزا صاحب کی خصوصیات سے ہے؛

غزل

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر   تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

فرماتے ہیں جس طرح آئینے کا زیادہ معطل پڑے رہنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے اسی طرح ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم کر اُسکو بد رنگ اور میلا کر دیتی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے جو آدمی زیادہ مشہور اور کام کے سمجھے جاتے ہیں وہی زیادہ مورد آفات و بلا ہوتے ہیں۔

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی   ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

فرماتے ہیں۔ میری وحشت مزاجی سامان عیش و جاہ سے بھی نہ مٹ سکی اور اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ زمردی پیالہ بھی میری نگاہ میں چیتے کا داغ بنگیا۔ مطلب یہ ہے دنیا میں

خوش و خرم رہنا دولتمندی کے سبب نہیں ہوا کرتا ہے یہ خدا کی دین ہے جس کو وہ چاہتا ہے تنگی اور مفلسی میں بھی دل شاد رکھتا ہے۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فرماتے ہیں۔ میں اپنی عریانی کا منت پذیر ہوں کہ اس نے میرے جنون کی مدد کی ہے اسلئے چاک گریبان کا حق یعنی احسان میری گردن پہ ہو گیا ہے۔ اگر گریبان چاک نہ ہوتا تو میں جنون کی کچھ مدد نہ کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ آثار جنوں بغیر چاک گریباں کے ثابت نہیں ہوا کرتے۔

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

فرماتے ہیں جس طرح جلے ہوئے کاغذ میں ستارے سے چمکنے لگتے ہیں اسی طرح شعبدۂ باز بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل کے بازوؤں پہ باندھ دیے ہیں۔ ایک تڑپ کے ساتھ ہزاروں نقطہ ہائے روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بھی بالکل واقعات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہو گا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔ (از یادگار غالب)

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فرماتے ہیں۔ ہم کو اس بے سبب رنج آشنا دشمن سے کام پڑا ہے جو آفتاب کی شعاع کو دیکھ کر نظر کی تہمت چشم روزن پہ رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے شعاع مہر جو روزن دیوار سے آتی ہے اس کو دیکھ کر میرا معشوق مجھ سے لڑتا ہے کہ تو نے روزن دیوار سے مجھ کو جھانکا تھا۔ یہ شعاع مہر نہ تھی بلکہ تیری نظر تھی۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

فرماتے ہیں۔ فانی اللہ ہو کر فروغ معرفت حاصل کرنا چاہئے۔ اس کی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ جس طرح گھاس وغیرہ جھاڑ میں جھونکنے کے بعد شعلہ شمع روشن ہو جاتی ہے اسی طرح فانی اللہ ہو کر حقیقت عرفان ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

فرماتے ہیں۔ اسد کے حال پر تعجب آتا ہے کہ وہ ایسے انداز کا بسمل ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خود قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشق ناز اسی طرح جاری رکھ اور لوگوں کو قتل کرتا رہ۔ خون دو عالم میری گردن پر ہوگا۔ تجھ سے اس کی بازپرس نہ ہوگی۔

ستمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

فرماتے ہیں۔ میں جو تیرے ستم اٹھا رہا ہوں ایک مصلحت سے اٹھا رہا ہوں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ تجھ پر حسین عاشق ہیں۔ اگر تو مجھے نہیں ملتا تو ان میں سے یعنی حسینوں میں سے کوئی نہ کوئی تجھ سا رقیب ضرور مجھے مل جائیگا۔

غزل

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور   تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ ساری غزل زین العابدین خان المتخلص بہ عارف کے نوحہ میں ہے۔ عارف میرزا صاحب کی سالی کے بیٹے یعنی ان کی بیوی کے بھانجے تھے۔ زین العابدین خان عارف سے میرزا صاحب کو نہایت درجہ کا تعلق تھا کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر و معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ باوجود پرگوئی کے نہایت خوش گو تھے۔ ان کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو میرزا صاحب نے ان کے مرنے پر یہ غزل سوز و حسرت سے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ ہی تم کو مرنا تھا۔ مگر تم مجھ سے پہلے مر گئے اور تم نے راہ عدم تنہا طے کی تو اب اور کچھ دن تنہا رہو۔

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا   ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ اگر تیرا سنگ در نہ گھسے گا تو میرا سر ضرور مٹ جائیگا تیرے در پہ میری

ناصیہ فرسائی ہمیشہ کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ چند دن کے لئے ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو جائیگی۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں　　مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

فرماتے ہیں تمہیں دنیا میں آئے ہوئے زمانہ ہی کیا گزرا ہے گویا کل ہی تو آئے تھے اور آج ہی یہ کہہ رہے ہو کہ جاؤں۔ میں نے مانا کہ ہمیشہ یہاں نہ رہو گے لیکن کوئی دن تو اور ٹھہرو مرنے میں ایسی جلدی کیوں کرتے ہو۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تمہاری رخصت کا وقت ہمارے لئے قیامت کا سامنا ہے۔ تم یہ کیا کہتے ہو کہ اب ہم قیامت کے دن ملیں گے۔ کیا قیامت کا کوئی دوسرا دن بھی ہے۔ بہت ہی بلیغ شعر کہا ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

میرزا صاحب نے مسطورۂ بالا اشعار میں عارف مرحوم کو مخاطب کیا ہے۔ اس شعر میں ہاں کا لفظ فلک کو مخاطب کرنے سے پہلے بطور یاددہانی استعمال ہوا ہے۔ اس ہاں کو اقرار سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی یہ ہاں نہیں کی ضد نہیں ہے۔ آسمان سے یہ شکایت کرنی منظور تھی کہ مرنے والا ابھی نوجوان تھا عمر طبعی کو نہ پہنچا تھا۔ اگر وہ اور کچھ دن زندہ رہتا تو اس میں تیرا کیا نقصان تھا۔

تم ماہ شب چاردہم تھے مرے گھر کے　　پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تم تو میرے گھر کے لئے چودھویں رات کے چاند کا حکم رکھتے تھے۔ تم سے میرے گھر میں اُجالا رہتا تھا۔ اگر میری یہ بات غلط ہے تو پھر وہ نقشہ گھر کا تمہارے بعد کیوں نہ رہا۔ چاروں طرف اندھیر کیوں چھا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بدر کامل رفتہ رفتہ کم ہو کر چھپا کرتا ہے تم دفعتاً میری آنکھوں سے غائب ہو گئے۔ یہ کیا ستم ہوا۔

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

فرماتے ہیں۔ تم لین دین کے اتنے تو کھرے نہ تھے کہ ملک الموت کے تقاضے پہ فوراً ہی تم نے

اپنی جان دیدی اسے اور کچھ دن تقاضا کرنے دیتے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی   بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نیر سے مراد یہاں نواب ضیاءالدین احمد خان بہادر المتخلص بہ نیر و رخشاں رئیس لوہارو ہیں جو عارف مرحوم کو مرزا صاحب سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے باقی شعر صاف ہے۔

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش   کرنا تھا جوانمرگ گزارا کوئی دن اور

فرماتے ہیں جس طرح اب تک تم نے عمر کا حصہ زمانہ کی خوشی اور رنج میں گزارا تھا اسی طرح اور کچھ دن دنیا میں بسر کرنے تھے جوانی کے عالم میں کیوں مر گئے۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب   قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فرماتے ہیں تم لوگ نادان ہو جو یہ کہتے ہو کہ عارف سے جوانمرگ کا داغ اٹھا کر اے غالب تم کیوں زندہ ہو مر کیوں نہیں جاتے۔ میں اس لئے نہیں مرتا کہ میری قسمت میں ابھی کچھ دن مرنے کی آرزو میں جاں، جب رہنا لکھا ہوا ہے۔

ردیف ن

غزل   فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر   ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

اس شعر میں چاک کفن کو صبح سے اور داغ عشق کو آفتاب صبح سے تشبیہ دی ہے مطلب یہ ہے کہ میں مر جانے کے بعد بھی مصائب عشق سے فارغ البال نہیں ہوں۔

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر   ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز

فرماتے ہیں جس طرح مفلس لوگ دولت اپنی برباد کر کے فخریہ اپنے اسراف کا بیان کیا کرتے ہیں اس طرح میں اپنے داغ عشق کو کھو کر اس کا ذکر کیا کرتا ہوں۔

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں   خمیازہ کھینچے ہے بت بیدادفن ہنوز

فرماتے ہیں میخانۂ جگر میں یہاں شراب عشق کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں خاک اڑ رہی ہے یعنی سب خون صرف ہو چکا۔ مگر میرے خون کا پیاسا معشوق ابھی تک انگڑائیاں لئے جاتا ہے

گزشتہ نہیں ہوا اور رہا۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز   دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز   غزل

میرزا صاحب نے اس مطلع میں بالکل ایک نئی شوخی برتی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی فرماتے ہیں کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا۔ ناچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو
(اقتباس از یادگارِ غالب)

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود   ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

فرماتے ہیں وجود ماسوے اللہ میں بیکار کیوں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے معلوم ہوا ابھی تک تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصوف ناتمام اور ناقص ہے۔

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں   کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز

فرماتے ہیں یہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وصالِ یار جلوۂ حسن کے نئے نئے تماشے دکھایا کرتا ہے لیکن ہم یہ دماغ کہاں سے لائیں کہ بیٹھے ہوئے آئینۂ انتظار کو صیقل کیا کریں۔ مطلب یہ ہے کہ تماشائے جلوۂ حسن کی تمنا کرلی تو آسان ہے۔ مگر انتظار کی سختیاں کھینچنی بہت کٹھن بات ہے۔

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست   گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

فرماتے ہیں۔ عاشق کی خاک کا ایک ایک ذرہ آفتاب پرست ہے۔ خاک ہو جانے کے بعد بھی جلوۂ ناز کی آرزو نہ مٹی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کے ذرے آفتاب کی شعاعوں کے مقابل ہو کر چمکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح خاکِ عاشق کے ذرات آفتابِ حسنِ یار سے کسبِ ضیا کرتے ہیں۔

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب   جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

فرماتے ہیں اے غالب میخانۂ جنوں کی وسعت کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ مختصر بتائے دیتا ہوں کہ یہ آسمان کا پیالہ وہاں ایسا ہے جیسے کوڑا پھینکنے کا برتن ہوتا ہے۔

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک   گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

میرزا صاحب نے اس شعر میں ابرِ کرم کی شان کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کریموں کو بذل ایثار سے کسی حالت میں دست بردار نہ ہونا چاہیے بلکہ کرم و بخشش کا شیوہ ابرِ گہربار سے سیکھنا چاہیے باوجودیکہ ابرِ گہربار آبلہ پا ہوتا ہے (پانی کے قطروں کی رعایت سے جو بادل میں ہوتے ہیں یہ کہا گیا ہے) پھر بھی فیض رسانی کیلئے جنگل جنگل اور شہر شہر مینہ برساتا ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت   نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

فرماتے ہیں میری گرمیِ رفتار کا اثر ابھی تک میرے نقشِ پا میں اس قدر باقی ہے کہ صفحۂ دشت کاغذِ آتش زدہ بن گیا ہے۔

قطعہ   کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں۔ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنی تو عین ایمان ہے پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے (از ذکرِ غالب)

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے   ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

فرماتے ہیں تیرے تیر کا پیکان بظاہر تو میرے دل سے نکل گیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ ابھی دل سے نہیں نکلا یعنی اس کی جگہ تیری محبت دل میں اسی پیکان کی طرح کھٹک رہی ہے جو چوٹ کر کے لگ گیا تھا اور جو دل سے نکال لیا ہے۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب   واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

میرزا صاحب کا یہ مقطع بھی عارف مرحوم کی موت کے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں غالب اس سختی کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ واقعہ تو سخت ہے اور جان عزیز ہے یعنی واقعہ کی سختی تو یہ کہتی ہے کہ جان دیدینی چاہئے اور جان ایک ایسی عزیز شے ہے کہ انسان کسی حال میں اس کا دینا گوارا نہیں کرتا۔

غزل   نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

فرماتے ہیں میری پیدا کردہ صدا گلِ نغمہ اور پردۂ ساز سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ میں تو اک سراپا درد ہوں۔ میری آواز تو گویا میرے دل کے ٹوٹنے کی صدا ہے۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

فرماتے ہیں۔ تجھے تو صرف آرائش کی غرض سے کاکلوں میں پیچ و خم ڈالنے سے کام ہے اور مجھ کو اس آرائش سے طرح طرح کے خوف اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں یعنی میں سمجھتا ہوں کہ دیکھئے اب کتنے نئے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

فرماتے ہیں۔ ہمارے یہ تمکین کے دعوے ہماری سادہ دلی کے فریب ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے سینہ میں تو ہزاروں رازِ دل گداز بھرے ہوئے ہیں ہم سے کب تک ان کا ضبط ہوگا۔ اور ہم کیونکر ان رازوں کو چھپا سکیں گے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن طشت از بام ہو ہی جائیں گے۔

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

فرماتے ہیں۔ دنیا کی محبت نے مجھکو اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ اگر میں چاہوں تو ان تعلقات سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا کرے کہ وہ بھی دن مجھے نصیب ہو جائے کہ بجائے حسرتِ ناز کھینچنے کے اس ستمگر سے میں بھی ناز کروں۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

فرماتے ہیں۔ ایک خون کا قطرہ بھی میرے دل میں ایسا نہیں ہے جس سے پنجۂ مژگاں نے گلبازی نہ کی ہو۔ گلبازی ایک قسم کا کھیل ہے جو گلاب یا گیندے کے پھولوں سے کھیلا جاتا ہے جیسا کہ کسی کا شعر ہے:۔ رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا ✻ ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اُٹھاتا مطلب یہ ہے کہ خونِ دل تمام و کمال پلکوں سے ٹپک گیا۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

فرماتے ہیں تیرا غمزہ سراسر ناز کا کام دیتا ہے۔ اور تیرا ظلم سر بسر انداز کا۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

فرماتے ہیں۔ تو آگیا عید میں مجھے دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا میرا سجدہ کی تجھ کو مبارک ہو۔

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب نواز

اس شعر میں کچھ غضب نہ ہوا کے جملہ نے عجیب پرلطف معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ اہلِ زبان مہربانی کے موقع پر طنزاً اس کا استعمال کرتے ہیں۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا وہ رند شاہد باز

فرماتے ہیں۔ اسد اللہ خان تمام ہوا یعنی مر گیا۔ ہائے افسوس وہ رند شاہد باز کیا عیش آدمی تھا۔

ردیف (س)

غزل مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

پرند جانور پکڑنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جال لگا کر اس کے قریب قفس میں اسی قسم کے ایک طائر کو بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ طائر گرفتار کی آواز پر اس کے ہم جنس طائر آ کر جمع ہو جاتے ہیں جال پر دانہ بچھا ہوا دیکھ کر کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ صیاد جال کھینچ لیتا ہے۔

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

فرماتے ہیں باوجودیکہ ہم نے لہو کی ندی ایک ایک کانٹے کے پاس لطف خلش اٹھانے کے لئے اپنے تلووں سے بہا دی۔ لیکن جگر تشنۂ آزار کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور تکلیف اٹھانے سے اسکا جی نہ بھرا۔ ملک الشعرا میر تقی میر فرماتے ہیں۔ تسلی ہوا دل بیتاب ۔ نہ تھا چشم تر خون ناب

مندھ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

تے کی ردیف میں بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا جا چکا ہے اور وہ یہ ہے:-

مندھ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

اس شعر میں مرزا صاحب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ضعف و نقاہت کے سبب حالت انتظار میں جب آنکھیں کھلے رہنے سے معذور ہو گئیں۔ اس وقت تم اپنے عاشق بیمار کے پاس آئے۔ اب ہم جی بھر کر تم کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے　　دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

فرماتے ہیں۔ غمخوار کے طعنوں اور ملامت و فہمائش نے کند خنجر سے مجھ کو قتل کر ڈالا۔ میں کیوں سسک سسک کر جان دیتا۔ اگر اسکے پاس اس زبان کے بدلے ایک تیز چھری ہوتی۔

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل　　نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

فرماتے ہیں۔ اے دل شیر کے منھ کا لقمہ بن جانا اس سے بہت بہتر ہے کہ کسی معشوق دل آزار سے دل لگایا جائے۔

دیکھکر تجھکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے　　خودبخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

فرماتے ہیں۔ تجھے دیکھکر چمن کی قوتِ نامیہ اس قدر ترقی کرجاتی ہے کہ پھول خودبخود بڑھکر تیری دستار تک پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دیدار سے سب کے دلوں میں ولولۂ شوق پیدا ہوجاتا ہے۔

مرگیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے　　بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

فرماتے ہیں۔ ہائے افسوس اپنا سر پھوڑ کر غالب وحشی مرگیا۔ مگر ہم کو اب تک وہ اس کا تیری دیوار کے پاس شوقِ دیدار میں آکر بیٹھنا یاد آتا ہے۔ کیا بے نظیر مقطع لکھا ہے۔

ردیف (ش)

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے　　لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فرماتے ہیں۔ آئینۂ فولادی اگر تیرے سبزۂ خط سے تر و تازگی نہ حاصل کرتا رہے اور اس میں طراوت نہ پہنچتی رہے تو تیرے شعلۂ رخسار کا عکس خانۂ آئینہ میں ضرور آگ لگادے۔

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق　　نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

فرماتے ہیں۔ فروغِ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوجاتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں کہ شمع کا کانٹا کبھی نہ نکلے اگر آگ اس کو نہ نکالے۔ شمع کے ڈورے کو خارِ شمع کہتے ہیں اور اس خار کا نکالنے والا شعلۂ شمع کو بتایا ہے۔ بالکل نیا خیال ہے اور بڑی خوبی کیساتھ ادا کیا ہے۔

ردیف (ع)

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع　　چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

یہ مطلع ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔ تارِ شعاع میرزا غالب نے اس خط کو لکھا ہے جو غروبِ آفتاب کے بعد و طلوعِ آفتاب سے پہلے ایک خطِ ابیض آسمان پر دکھائی دیتا ہے اہلِ رصد کی اصطلاح میں اس کو قوس الشمس کہتے ہیں مطلب شعر کا یہ ہے کہ وقتِ شام آفتاب سفر کرنے کو آمادہ ہے اور آسمان ماہِ نو کو آغوشِ وداع بنا کر رخصتی معانقے کیلئے تیار ہے۔

غزل

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع　　ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

فرماتے ہیں معشوق کے چہرۂ انور سے شمع کو رشک پیدا ہو گیا ہے۔ شمع رشک میں جل رہی ہے دوسرے مصرعے میں فرماتے ہیں کہ آتشِ گل جو معشوق کے چہرہ میں ہے یعنی سرخی رنگِ رخسار، وہ شمع کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتی ہے۔ فارسی میں بجھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ کہتے ہیں اس لئے شمع روشن کو میرزا صاحب نے زندہ فرض کیا ہے۔ اکثر شعرا یہی لکھتے ہیں۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی　　یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ اہلِ زباں کی زبان میں خاموشی کو موت کہتے ہیں۔ بزم میں یہ بات زبانیِ شمع سے روشن ہوئی یعنی ظاہر ہوئی ہے یا معلوم ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس کو شمع کشتہ کہتے ہیں اور جب جلتی رہتی ہے تو شعلہ کو زبانِ شمع سے تعبیر کرتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اہلِ زبان کا خاموش رہنا اہلِ زباں کی موت سمجھا جاتا ہے۔

کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام　　بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ شمع نقطہ شعلہ کے اشارہ پر اپنی زندگی کا قصہ تمام کر دیتی ہے یعنی شعلہ کی محبت میں شعلے سے لو لگا کر از سرتاپا فنا ہو جاتی ہے جس طرح عاشقانِ الٰہی اللہ سے لو لگا کر فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں اور اس ہستی موہوم سے گزر جاتے ہیں۔

غم اسکو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ　　ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

فرماتے ہیں۔ اے شعلہ تو جو کانپ رہا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ شمع بہت ناتوان و کمزور

ہوگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو محرومی و ناکامی پروانہ کا اس قدر رنج و غم ہے کہ اپنے کو گھلائے دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعلہ شمع جو ہوا کی وجہ سے حرکت کرتا ہے اس کو میرزا صاحب کی نازک خیالی کمزوری کا سبب بتاتی ہے شعلے سے مخاطب ہونے نے شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

ترے خیال سے روح احتراز کرتی ہے   بجلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

فرماتے ہیں۔ تیرے خیال سے روح عاشق کو ایک جنبش سرور حاصل ہوتی ہے جس طرح ہوا کے چلنے سے شعلۂ شمع کو حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کو تیرے خیال سے مستی سرور پیدا ہو جاتی ہے۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ   شگفتگی ہے شہید گلِ خزاں شمع

فرماتے ہیں۔ داغ غم عشق کی خوشی و سرور کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ وہ ایک فصل بہار کی کیفیت رکھتا ہے جس طرح گل سے شمع بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح عاشق داغ عشق سے شہید ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے داغ عشق میں ایسی بہار پوشیدہ ہے کہ شگفتگی اس پر ہزار جان سے مٹی ہوئی ہے۔

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھکو   نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع

فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمع بھی یار پہ عاشق ہے اور مجھکو اپنا رقیب سمجھتی ہے اسلئے کہ یار کے پاس مجھکو دیکھکر رشک و حسد میں جلی جاتی ہے۔ مجھے شمع کی جانب سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے۔

ردیف (ف)

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش   مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

فرماتے ہیں۔ رقیب کے خوف سے میں بیہوش بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ بیہوش ہو جانے کی حالت میں راز عشق سے خبردار ہو جائیگا۔ افسوس ہے کہ مجھکو اپنے ہوش پر بھی اختیار نہیں۔ انتہائی مجبوری یہ ہے کہ میری خوشی پر یا ارادہ پر رقیب کا ڈر غالب آگیا مطلب یہ ہے کہ جی تو یہی چاہتا ہے اور موقع بھی ایسا ہی ہے کہ بیہوش ہونا ضروری سمجھا گیا ہے مگر افشائے راز کے خیال سے ایسا نہیں کر سکتا۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے   اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

فرماتے ہیں۔ اس بات کے تصور سے دل جلتا ہے کہ ہم باوجود آتش شعلہ بار رکھنے کے ایک بار نہیں جل جاتے۔ جو آگ سینہ میں مشتعل ہے۔ اس کا تو یہی تقاضا ہے کہ ایک ہی دفعہ جل کر خاکستر ہو جاتے۔ لیکن ناتمامی اور نامرادی ایکبار جل جانے سے روکتی ہے۔

ردیف (ک)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک   کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

فرماتے ہیں۔ لڑکے مجھے دیوانہ سمجھکر پتھر مارتے ہیں اور ان پتھروں سے زخم بدن پر ہو جاتے ہیں لیکن لڑکے اتنے بے پروا ہیں کہ زخموں پر نمک نہیں چھڑکتے۔ اگر پتھر میں نمک ہوتا یا یہ پتھر نمک سنگ کے ٹکڑے ہوتے تو بڑا لطف آتا یعنی جسم پر زخم بھی پڑتا اور نمک بھی چھڑک دیا جاتا۔

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل   ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

فرماتے ہیں۔ زخم دل کے لئے باعث نازش گرد راہ یار ہے ورنہ نمک تو دنیا میں بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور بہت ارزاں بکتا ہے لیکن زخم دل پر نمک سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو کے رستے کی خاک زخموں میں بھر کر مزا دیتی ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو   نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے یعنی مجھکو ارزانی رہے نالۂ بلبل کا درد اور تجھ کو مبارک ہو جیو خندۂ گل کا نمک۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج   گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

فرماتے ہیں کس گوہر دریا لطافت نے دریا کی ریتی میں گھوڑے کو کاوا دے ایڑ دیا تھا کہ جسکے ٹاپوں کی گرد موجۂ دریا کے زخموں میں نمک کا کام دے رہی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ میرے معشوق کا گھوڑا موج دریا سے بھی تیز رفتار و سبک عناں تھا جسکے رشک نے موجۂ دریا کے زخموں میں نمک چھڑک دیا۔

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ   یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

فرماتے ہیں۔ میرا معشوق جہاں کہیں نمک کو دیکھتا ہے۔ مجھے یاد کر لیتا ہے یعنی بے اختیار اُس کو میں اور میرا زخمِ جگر یاد آجاتا ہے جس میں وہ نمک بھرا کرتا ہے اور جب میں یاد آتا ہوں تو میرے زخمِ جگر کی تعریف بھی کرتا ہے۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے　　دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

فرماتے ہیں۔ ایسے وقت میں تنِ مجروحِ عاشق کو چھوڑ کر تیرا جانا افسوس کے قابل ہے کہ جبکہ دل تو زخم کا طلبگار ہے اور اعضائے جسم نمک کے خواستگار یعنی نہ ابھی زخموں میں نمک بھرا ہے اور نہ دل میں کوئی زخم لگایا ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد　　زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتا پا نمک

فرماتے ہیں غیر کا منت پذیر ہونا میں پسند نہیں کرتا اور وہ بھی درد کی رعایت سے میرا زخم خندۂ قاتل کی طرح سرتاپا نمک ہے۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں　　زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

فرماتے ہیں۔ اے غالب تو میرا قدیمی دوست و غمخوار ہے ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے تجھے وہ دن بھی یاد ہیں کہ جب میرے زخموں میں سے نمک کے ذرے گر پڑتے تھے تو میں پلکوں سے چنا کرتا تھا۔ اس بیان میں دو خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ میں اتنا ایذا دوست تھا کہ میرے زخم سے جو حصہ نمک کا کم ہو جاتا تھا میں اس کو شوق کے ساتھ چن کر پھر زخم میں بھر لیتا تھا۔ دوسری یہ خوبی ہے کہ نمک زمین پر گرے تو پلکوں سے اُٹھانا چاہئے اس مشہور بات کی طرف اشارہ ہے۔

غزل۔ آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ آہ کو ایک عمر چاہئے کہ اثر پیدا کرے اور جب تک آہ میں اثر پیدا نہ ہوگا اور تیری زلف ہمارے حال پریشاں سے خبردار ہوگی۔ ہم اس وقت تک کب زندہ رہ سکتے ہیں۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے

میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (از یادگار غالب)

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ عاشقی صبر طلب کام ہے اور تمنا جلدی کر رہی ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو کامیاب ہونا چاہیے میں دل کو کیونکر صبر دوں اور ٹھہراؤں جگر۔ مطلب یہ ہے کہ جب جگر خون ہو جائیگا اس وقت آہ میں اثر آئیگا اور کامیابی کی صورت نظر آئیگی۔ عشق ایسی شے نہیں ہے کہ آج ہی آدمی عاشق ہو اور آج ہی معشوق پر اس کا اثر ہو جائے۔

ہمنے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس زمین میں ایسا صاف اور بے مثل شعر نکالنا میرزا ہی جیسے کامل فن کا کام تھا۔ فرماتے ہیں یہ تو ہم نے مانا کہ تم تغافل کو کام میں نہ لاؤ گے اور جلد چلے آؤ گے مگر تم تک خبر پہنچتے پہنچتے تو ہم خاک ہو جائیں گے اس کا کیا علاج ہے۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

فرماتے ہیں جس طرح آفتاب کی گرمی سے شبنم بھاپ بنکر اڑ جاتی ہے میں بھی اسی طرح تیری ایک نظر عنایت میں فنا ہو جاؤنگا۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہستی شبنم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی نہ مجھے اس سے زیادہ قیام وثبات رہ سکتا ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

فرماتے ہیں۔ اے غافل فرقہ انسان۔ ایک نظر سے زیادہ ہستی کا وقفہ نہیں ہے اور اس کی مثال پیش کرتے ہیں کہ گرمی بزم یعنی بزم ہستی کی گرماگرمی ایک رقص شرر ہونے تک ہے جس طرح شرر آتش چمک کر بجھ جاتا ہے اسی طرح انسان دم بھر میں فنا ہو جانے والی ہستی رکھتا ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر میں مرزا صاحب نے انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ملتی شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی

ہے۔ ایسی بدیع و نادر تشبیہات میرزا صاحب کے سوا دوسرے شخص کو سوجھتی ہی نہیں۔

ردیف (گ)

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ　　یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو دعا قبول ہونے کا یقین ہے تو پھر دعائیں مانگ کر کیوں تضیعِ اوقات کرتا ہے۔ بغیر کے معنی یہاں سوا کے ہیں یعنی ایک دلِ بے مدعا کے سوا اور کچھ نہ مانگ جب دلِ بے مدعا عطا ہو گیا پھر کسی چیز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اس دعا سے بڑھ کر اور کوئی دعا ہو ہی نہیں سکتی۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس شعر میں نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے مدعا ہے درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب ان کا شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جیسی کثرت سے میرے گناہ ہیں ان کی گنتی یاد آتی ہے گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی بس جتنے گناہ کیے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں (از یادگارِ غالب)

ردیف (ل)

مہم ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل　　بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

فرماتے ہیں بلبل اس فریب اور دھوکے میں اپنی جان دے دیتی ہے کہ گل میں وفاداری کی صفت کو ثبات و قیام ہے۔ پھولوں کو دیکھو کہ وہ بلبل کی اس غلط فہمی پر خندہ زن ہیں مطلب یہ ہے کہ ہر عاشق کی نگاہ میں ہر معشوق ایک غیر فانی ہستی ہے۔

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

ہوائے گُل: شوقِ گُل۔ فرماتے ہیں۔ آزادیٔ نسیم نسیم سے یہاں بوئے گُل مراد ہے یعنی بوئے گُل کو آزادی مبارک ہو۔ حلقہ ہائے دامِ گُل ٹوٹے پڑے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ پھول کھل گیا اور بوئے گُل قید سے آزاد ہو گئی۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل

ہر شخص موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا یعنی فریفتہ ہو گیا۔ افسوس ہے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل پر۔ مطلب یہ ہے کہ رنگِ گُل درحقیقت گُل کا نالۂ خونچکاں اور فریادِ دلخراش ہے جس کو لوگوں نے غلطی سے موجِ رنگ سمجھ لیا ہے اور اس پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل سر بپائے گُل

فرماتے ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے اس کا کیا کہنا ہے جو شرابخوار معشوق کے قدموں پر سر رکھے ہوئے عرضِ تمنا کر رہا ہو۔ اس شعر میں عاشقِ بدمست کو شاخِ گُل سے اور معشوق کو گُل سے تشبیہ دی ہے۔

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل

فرماتے ہیں بہار نے پھولوں کو چمن میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ تیرے گلے کا ہار ہوں اور تیرے بستر پر تیرے ساتھ رات بھر سوتے رہیں اور میں دیکھ کر جلوں۔ معلوم ہوا کہ نفسِ عطر سائے گُل میرا رقیب ہے۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

فرماتے ہیں۔ اگر میرا شیشہ شراب سے خالی ہوتا ہے اور دل میں کبھی سیرِ شوقِ گُل نہیں ہوتا تو یہ دونوں باتیں مجھ کو بادِ بہاری سے شرمندہ کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ موسمِ بہار میں شراب شیشہ میں ہونی لازمی ہے اور دل میں سیرِ باغ کا شوق ہونا ضروری ہے۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

فرماتے ہیں۔ تیرے رعب جبین غیور کے جلوہ سے میری نگاہ میں لالۂ گل کا رنگ خون ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے چونکہ تیری غیرت یہ نہیں چاہتی کہ میرا عاشق کسی دوسرے معشوق پر فریفتہ ہو اسلئے پھول کی رنگت میری آنکھوں میں خون کا حکم رکھتی ہے۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک   بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

فرماتے ہیں جب کوئی پھول کھلتا ہے تو اور کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردہ میں جلوہ گر ہوا ہے پھول بن کر سلسلہ وار کھلنی شروع ہو جاتی ہیں اور اس سلسلہ کو دیکھکر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک پھول کے پیچھے دوسرا پھول بھاگتا آرہا ہے۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو   جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

فرماتے ہیں۔ اے غالب مجھکو اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو پھول نے اپنا زیب گریباں بنایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شاہد حقیقی کے خیال میں پھول اپنی زیب و زینت کرتے ہیں۔ میں اس سے ہم آغوشی کی تمنا رکھتا ہوں یعنی اس سے وصال کا خواہشمند ہوں۔

ردیف (م)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس   برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

فرماتے ہیں ہم آزاد لوگ ہیں ہم کو غم دنیا دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ماتم خانہ میں بجائے شمع کے بجلی کام دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بجلی ایک آن واحد میں چمک کر چھپ جاتی ہے اسی طرح ہمیں غم کا خیال آکر فوراً مٹ جاتا ہے یعنی اس کا اثر تھوڑی دیر بھی باقی نہیں رہتا۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال   ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم

فرماتے ہیں اب تک جو محفلیں برہم ہو چکی ہیں ان کو گنجفہ باز خیال یاد دلاتا ہے۔ ہم گویا نیرنگ بتخانہ کی ورق گردانی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسینوں کی محفلیں جو برہم ہو چکی ہیں اب تک ہمارے خیال میں ہیں اور ہر وقت خیال میں رہا کرتی ہیں۔ گنجفہ کی ورق گردانی سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح گنجفہ کھیلنے والے پتوں کو بار بار انگلیوں میں پھیلا کر دیکھتے رہتے ہیں وہ تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح گزری ہوئی محافل نشاط کی تصویریں جن کو ہم نیرنگ تجلی سمجھتے ہیں ہمارے پیش نظر رہتی ہیں یہ تشبیہ ایک بالکل نئی تشبیہ ہے جو آجتک کسی کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم

فرماتے ہیں کہ دل پروانہ میں جس تمنا کے شوق شمع روشن ہیں اس قدر ہنگامہ آرائی کی ہے ویسا مستور اور پوشیدہ ہے کہ اس کیلئے پیدائی اور ظہور کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا ہی حال ہماری ہستی کا ہے کہ ہنگامہ بہت کچھ ہے مگر ہستی کا کہیں نشان بھی نہیں ہے یعنی حقیقت میں ہستی اگر ہے وہ ایک ہی ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو
ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم

فرماتے ہیں ہم نے جو جستجو کو ترک کر دیا ہے یہ قناعت کے سبب سے نہیں کیا ہے بلکہ جستجو کی طاقت ہم میں باقی نہیں رہی ہے۔ اس واسطے ہم ہمت مردانہ کی تکیہ گاہ کیلئے وبال بن گئے ہیں مطلب یہ ہے کہ مردوں کا یہی کام ہے کہ ہمت کو اپنا تکیہ گاہ بنائیں۔ لیکن یہاں برعکس معاملہ پیش آیا ہے۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

فرماتے ہیں ہم اپنے سینۂ پُرخوں کو جیل خانہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے سینہ میں لاکھوں تمنائیں عمر بھر کیلئے قید ہو گئی ہیں نہ اب تک کبھی نکلیں نہ آئندہ زندگی بھر ان کے نکلنے کی امید کی جا سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ بہت سی آرزوئیں ہمارے دل میں ایسی ہیں جن کا نکلنا صرف خدا کے فضل پر منحصر ہے۔

بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

میرزا صاحب تعلقات دنیا کی مذمت ان لفظوں میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے دنیا سے دل بستگی ہے تو نالہ کشی اختیار کر۔ اس لئے کہ خانۂ زنجیر میں جو کچھ مال و دولت ہے وہ فقط صدائے شیون فریاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تعلق خاطر کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

قطعہ

مجھکو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑا رہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کس رتبہ کا

آدمی تھا لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو۔ مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی بس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا ہے (از یادگارِ غالب)

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

فرماتے ہیں اس کی گھونگر والی زلفیں میری گھات میں ہیں۔ اے خدا اب میرے دعوئ وارستگی کی شرم تیرے ہاتھ ہے۔ تو میری شرم رکھ لینا۔ مطلب یہ ہے اگر زلفوں میں اسیر ہو گیا تو میرا دعوئ آزادگی و وارستگی باطل ہو جائیگا۔

ردیف (ن)

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

فرماتے ہیں۔ بختِ خفتہ سے ایک رات کی نیند قرض لے تو لوں لیکن اے غالب یہ خوف ہے کہ اس قرضہ کو ادا کہاں سے کرونگا۔ مطلب یہ ہے کہ قسمت تو سو رہی ہے اور میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ اگر اپنے مقدر سے ایک گہری نیند قرض لے لوں تو لے سکتا ہوں لیکن یہ قرضہ ادا کیونکر ہوگا یعنی میں تو دولتِ خواب سے محروم ہی ہوں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ ہمارا باقی نہ رہا اور وہ فراق کی راتیں بھی کٹ گئیں جن کا کاٹنا پہاڑ کاٹنے سے زیادہ دشوار تھا اور وہ وصل کے لطف بھی مٹ گئے جو اب یاد آتے ہیں۔ وہ راتیں وہ دن، وہ مہینے، وہ سال کہاں چلے گئے جس میں فراق و وصال کے رنج و عیش اٹھاتے تھے اور وہ شوق بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ساری غزل مسلسل اسی مضمون میں نظم کی گئی ہے۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ شوق کی شورش اب کس کو ہے اور وہ نظارۂ جمال کا ذوق و شوق اب

کہاں ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

فرماتے ہیں۔ وہ دل جس میں عشق سما گیا تھا وہ اگر مٹ گیا تو مٹ جائے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ دماغ بھی باقی نہ رہا جس میں سودائے خط و خال تھا۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

فرماتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ایک شخص کے تصور سے تھیں اب وہ خیال کی بلند پروازیاں اور رنگینیاں کہاں باقی ہیں۔

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

فرماتے ہیں۔ اب لہو رونا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یعنی عشق کے مصائب کی انتہا ہو چکی اور خونِ دل و جگر تمام و کمال صرف ہو جانے سے نہ دل میں طاقت باقی رہی نہ جگر میں حالت۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فرماتے ہیں۔ ہم سے قمار خانۂ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب وہاں جا کر کیا کریں جب جب گرہ میں مال ہی نہ رہا یعنی نقدِ دل سکۂ داغ و دولتِ صبر کچھ بھی پاس نہ رہا اب داؤں کس مال پر لگائیں اور جوا کس برتے پہ کھیلیں۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

فرماتے ہیں۔ میں تو عشق کا بندہ تھا غمِ عشق سے کام پڑتا تھا۔ ہجر کے مصائب اٹھاتا تھا۔ وصل کی لذتیں لوٹتا تھا۔ مجھ کو غمِ دنیا سے کیا سروکار۔ میں اس وبال کو کیا سمجھتا تھا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

فرماتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ گزر گیا۔ اعتدالِ عناصر کا وقت اب کہاں رہا۔ شباب کی مدت اب ختم ہو گئی۔ قویٰ میں اضمحلال شروع ہو گیا۔

غزل

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

فرماتے ہیں معشوق نے جو ہم سے وفا داری کا برتاؤ برتا ہے تو رقیب اُسکو جفا کہتے ہیں یہ تو قدیم دستور چلا آتا ہے کہ اچھے لوگوں کو دشمن یا حاسد بُرا کہا کرتے ہیں۔

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ آج ہم اپنے دل کی پریشانی کا حال اُن سے کہنے کے ارادہ سے اُن کے پاس جاتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہیے کہ وہاں جاکر کیا کہتے ہیں۔ اس شعر میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں ایک یہ کہ ان کے سامنے پہنچکر ہم کچھ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ یعنی رعبِ حُسن سے ہم میں طاقت گویائی باقی رہتی ہے یا نہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارا حال سنکر دیکھئے اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں۔ مگر زیادہ لطف پہلے ہی معنی میں ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں!

فرماتے ہیں۔ وہ لوگ جو شراب اور گانے کو غم غلط کرنے والے سامان میں شمار کرتے ہیں وہ پُرانے زمانے کے بھولے بھالے آدمی ہیں۔ مے و نغمہ اندوہ رُبا نہیں ہے بلکہ اندوہ افزا ہے اسلئے کہ جب کوئی سامانِ نشاط آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یاد یار تازہ ہو جاتی ہے۔ بجائے غم غلط ہونے کے رنج جانگسل کا سامنا ہو جاتا ہے۔

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

فرماتے ہیں جب مجھے غش سے افاقت حاصل ہوتی ہے تو میرا معشوق میرے دل میں آجاتا ہے؟ اور یہ میرے نالہ کے اثر سے ہوتا ہے مجھے معلوم نہیں اور کس نالہ کو رسا کہتے ہیں اس سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہوگی کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچکر دل میں لے آتا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلہ پر قبلہ نما کا اطلاق کرنا میرزا صاحب کے حصہ کا مضمون ہے۔ میرزا صاحب سے پہلے کسی نے نہیں کہا یہ شعر ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی دیوارِ کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمارا مسجودِ مطلق۔ اور ادراک کی سرحد سے بہت دور ہے

یعنی کعبہ کو دیکھ کر یا بغیر دیکھے بہ سمت کعبہ سجدہ کرنا اس غرض سے نہیں ہے کہ ہم کعبہ کے پتھروں کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس کو سجدہ کرتے ہیں جو جہات سے منزہ ہے۔ البتہ سجدہ کے لئے جہت لازمی ہے۔ اس لئے جہت کعبہ کو معین کر لیا اور وہ جہت مثل قبلہ نما کے ہے۔

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہمارے پاؤں جو رستے کے کانٹوں سے زخمی ہو گئے ہیں۔ اُن پر تجھکو رحم آ گیا ہے۔ اس لئے ہم تیری راہ کے کانٹوں کو کانٹے نہیں کہتے بلکہ مہر گیا کہتے ہیں۔ مہر گیا۔ ایک بوٹی کا نام ہے۔ اس بوٹی کی جڑ انسان کی شکل کی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جو آدمی کے پاس اس جڑ کو رکھتا ہے اس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں یعنی وہ محبت کا اثر رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے راہ کے کانٹوں کو مہر گیا سے تعبیر کرتے ہیں۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

فلسفۂ جدید کے مطابق (مسئلہ دورانِ خون جواب ثابت ہوا ہے) اس شعر میں نظم ہو گیا ہے۔ جس سے حضرت مصنف کی فلسفیانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ شرر سے مراد روحِ حیوانی ہے جو انسان میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں روح کی حرارت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت [illegible] نہیں ہوتی بلکہ ہر سانس کی ہوا سے روح کو مشتعل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اس کی ہر بات پر نام خدا یا ماشاء اللہ چشم بد دور کہا کرتے ہیں گو اس کی نخوت کو ترقی ہمارے اسی قسم کے جملوں سے ہوتی رہتی ہے۔ انجام کو دیکھئے ان [illegible] کی نخوت کا کیا ہوتا ہے یعنی معلوم نہیں یہ اونٹ کس کل بیٹھے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

شیفتہ سے مراد نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ہیں اور وحشت سے مراد غالباً غلام علی خان صاحب وحشت ہیں۔ یہ دونوں [illegible] تھے۔ [illegible]

زیادہ میرزا صاحب کے ماننے والے تھے۔ مومن خاں صاحب کے انتقال کے بعد یہ دونوں صاحب مشورہ سخن میرزا صاحب ہی سے کرتے تھے۔

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں [illegible]

فرماتے ہیں۔ اس پھول کی آبرو کچھ نہیں ہے جو گلشن سے باہر نکل گیا۔ گویا پھول کا بازار میں جا کر بکنا غلام بنکر آبرو کا کھو دینا۔ مگر یہاں یہ مضمون دوسرے معنی پر استعمال ہوا ہے۔ گریبان ننگِ پیرہن ہے جو دامن میں نہیں ہے۔ یعنی جب گریبان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دامن میں آ جائیگا تو پھول بن جائے گا۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ اے گریہ تیرا انجام یہ ہوا کہ میرے جسم میں کوئی حالت ہی باقی نہیں رہی۔ تو نے خون کو آنسوؤں کے رستے بہا کر میرے جسم میں ایک قطرہ بھی لہو کا باقی نہ رکھا اور جس قدر رہ گیا تھا وہ اتنا کم تھا کہ بجائے آنکھ سے ٹپکنے کے چہرہ کا رنگ بنکر اُڑ گیا اور جو لہو چہرہ کا رنگ بنکر اُڑا ہے وہ دامن کے حصہ کا تھا۔ اب دامن بے لہو کے رہ گیا۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس کے شوق دید میں نگاہ آفتاب کے اجزا جمع ہو کر ذرات کی شکل میں ظاہر ہو گئے ہیں۔ یہ روزنِ دیوارِ یار میں خاک کے ذرے نہیں ہیں۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ زندانِ غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ (قاعدہ ہے کہ جس جگہ تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں تھوڑی سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے) اور ایسا اندھیرا ہے۔ روزنِ دیوار میں جو روئی کی گولی بنا کر رکھی ہے وہ سپیدۂ سحری کی طرح سے چمک رہی ہے۔

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے خواہ زن و فرزند کی محبت ہو خواہ مال و دولت کی۔ خواہ ملک و ملت کی خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر انجمن میں یہ نہیں یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اسکی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔ (اسی کو غالب نے بشکل شعر لکھا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانکے لگوانے سے غیر مجھکو علاج کرنے کا طعنہ دیتا ہے۔ وہ نادان یہ نہیں سمجھتا کہ سوئی کے زخم میں بھی وہی تکلیف ہے جو زخم ڈالتے وقت تلوار یا تیر یا کسی اور دھاردار آلہ سے ہوتی ہے۔ لذت کا لفظ تکلیف کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ شعر کی عمدگی میں کیا کلام ہے۔

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم ایک بہارِ ناز کے کشتۂ حسن ہیں۔ مدفن میں بھی اسی بہارِ ناز کے تصور سے جلوۂ گل کا سماں ہمارے پیش نظر ہے۔

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ میرے خون کا ایک ایک قطرہ ناسور کی صورت پیدا کر رہا ہے جس طرح ہیولے پر سے ایک صورت معدوم ہوتی ہے اور دوسری صورت طاری ہوتی ہے۔ اسی طرح خون کی ہر بوند سے لہو کے قطرہ کی صورت فنا ہو کر ناسور کی شکل پیدا ہو جائیگی اور جسم میں جس جس مقام پر لہو کی بوندیں ہیں وہاں ناسور پڑ جائینگے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

فرماتے ہیں۔ ساقی کو شراب پلانے پر بہت غرور تھا لیکن میری قلزم آشامی نے آج اسکے غرور کو ڈھا دیا میں نے اس کثرت سے شراب پی کہ کسی شیشے میں موجِ مے باقی نہ رہی۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی آسائش مرے تن میں نہیں

فرماتے ہیں ضعف مجھ کو ایسا نچوڑ رہا ہے کہ اظہارِ ناتوانی کا موقع بھی نہیں ملتا میرے قد کا جھکنا

ضعف کی علامت ہے۔ مگر ضعف نے مجھ کو چاروں طرف سے بھینچ رکھا ہے۔ اب کسی طرف میرے قد کے جھکنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں بھُوس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح بھوس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ یہی حال میرا ہے کہ وطن میں تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں۔

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں بت

فرماتے ہیں اس کے ناز و انداز کی تعریف جیسی ہونی چاہئے تھی مجھ سے نہ ہو سکی اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر صرف ایک ہی ادا ہو تو میں اُسکو قضا کہکر عہدہ مداحی سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔ وہ تو سراپا ادا ہے کس کس ادا کی تعریف کروں۔

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

فرماتے ہیں۔ تیری زلفوں کے گھونگر چشم ہائے کشادہ بنکر دل کی تاک میں مصروف ہیں اسلئے مجھے مناسب ہے کہ ہر تارِ زلف کو نگہ سرمہ سا سے تعبیر کروں۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

فرماتے ہیں۔ میں ہوں اور ہزاروں لاکھوں جگر خراش نالے ہیں۔ تو ہے اور ایک سُنی اَن سُنی کہ جس کا میں بیان نہیں کر سکتا۔

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

فرماتے ہیں۔ اے ظالم میرے گمان سے مجھ کو منفعل ہونا پڑے ایسا نہ کر۔ خدا نہ کرے کہ میں تجھکو بے وفا کہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میرا گمان تو تجھکو بے وفا کہتا ہے اور میں وفادار کہہ رہا ہوں۔ ایسا نہ کرنا کہ مجھکو اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے یعنی بے وفائی نہ کرنا کہ خدانخواستہ تجھکو بھی بے وفا کہنے کی ضرورت واقع ہو۔

خو مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

فرماتے ہیں تھوڑی سی رنجش کے بعد تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ہمیشہ کیلئے تم سے روٹھ بیٹھا ہوں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مہربان ہو کر جس وقت چاہو مجھکو بلا لو۔ میں گزرا ہوا وقت نہیں ہوں کہ پھر دوبارہ نہ آسکوں۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے   بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فرماتے ہیں ضعف کی حالت میں طعنۂ اغیار کا شکوہ دیتے ہوئے تم کیوں ڈرتے ہو۔ بات کی برداشت مجھ کو ضعف کی حالت میں بھی ہے تمہاری بات کچھ میرا سر نہیں ہے کہ جس کو میں ضعف کی وجہ سے نہیں اٹھا سکتا۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھکو ستمگر ورنہ   کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس سے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لئے نہیں کھا سکتا
(از یادگارِ غالب)

اڈ ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایکدن   ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذرِ مستی ایکدن

فرماتے ہیں۔ شراب خواری کے وقت کسی دن ہم سے بے تکلف ہو جاؤ۔ اگر ایسا نہ کروگے تو ہم تمہیں کسی دن چھیڑیں گے۔

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو   اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی ترقی کے اس قدر فریفتہ نہ ہو۔ اس بلندی کی قسمت میں پستی لکھی ہوئی ہے یعنی ایک دن قیامت آنی ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں   رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کے اس شعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ شیفتہ سے پہلے مرزا صاحب

پر کسی دوکاندار نے قیمتِ شراب کی بابت نالش دائر کردی تھی۔ مقدمہ مفتی صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور کی عدالت میں پیش ہوا۔ جوابِ دعوے میں میرزا صاحب نے یہ شعر فی البدیہ کہکر پڑھ دیا۔ مفتی صاحب نے مدعی کو روپیہ اپنے پاس سے دیدیا اور میرزا صاحب کو عدالت سے رخصت کر دیا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے　　بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

فرماتے ہیں۔ نغمۂ شادی اور نغمۂ غم دنیا میں توام ہیں۔ کبھی غم ہے تو کبھی شادی اور سازِ ہستی کی یہ دونوں صدائیں ہیں۔ سازِ ہستی کے مٹ جانے سے پہلے دونوں کو غنیمت سمجھنا چاہیے مطلب یہ ہے کہ غم کے بعد شادی لازمی ہے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایکدن

فرماتے ہیں۔ اس بے تکلفی کے مذاق میں پہل ہماری طرف سے ہوئی تھی۔

بہت　ہم پہ جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں　　اِک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم پر اُن کو یہ گمان نہیں ہے کہ جفا سے ڈر کر وفا ترک کردیں گے۔ ان کی جفائیں صرف ہمیں چھیڑنے کی غرض سے ہیں۔ ان سے امتحانِ وفا مراد نہیں ہے۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اسکی نگاہِ لطف کا کس منہ سے شکر کیجئے یعنی نگاہِ لطف نے پرسشِ حال تو کرلی ہے مگر زبان سے میرا حال نہیں پوچھا جاتا۔

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز　　نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم کو ستمگر اس لئے عزیز ہے کہ اس کا ستم قوتِ برداشت کے موافق ہوتا ہے۔ ایسا ظلم وہ نہیں کرتا کہ جس سے ہم جاں بلب ہوجائیں یا اپنی جان سے گزر جائیں۔ اس واسطے ہم کہتے ہیں کہ ہم بھی اس ستمگر کو عزیز ہیں۔ اگر عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری جان لے لیتا۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ یعنی ستمگر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی　　آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر بوسۂ دہن دینے میں تم کو یہ عذر ہے کہ میرا دہن معدوم ہے میں بوسہ کیونکر دوں تو نہ دو میں تمہارے اس عذر کو تسلیم کرتا ہوں لیکن گالی تو مجھے دو۔ اس لئے کہ زبان تو تم رکھتے ہو گالی دینے میں کیوں عذر کرتے ہو۔ ہے یہ مثل کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی۔

قطعہ

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمیِ تاب تواں نہیں

باوجودیکہ اس کا قہر و عتاب میری جان کو گھلا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ تاب و طاقت نے مجھ کو جواب دے دیا ہے۔

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

فرماتے ہیں۔ اس پر بھی میری جان نزاری تقاضے کر رہی ہے کہ اور کوئی ظلم و ستم باقی رہ گیا ہو تو اس کو بھی کام میں لے آنا چاہئے۔ میں تو اب بھی یعنی اس صورت میں بھی امان کا خواہشمند نہیں ہوں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر دل دو نیم نہ ہو تو خنجر سے دل کو دو ٹکڑے کر دے اور اگر مژگان خونچکاں نہ ہو تو عشق کی چھری سے دل کو زخمی کر دے تاکہ مژگان خونچکاں ہو جائے اور یہ دونوں نکتے عاشق کو حاصل ہو جائیں۔

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

فرماتے ہیں وہ سینہ ہی کیا ہے جس سینہ میں دلِ سوزاں نہ ہو اور وہ دل ہی کیا ہے جس کا نفس آتش فشاں نہ ہو۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

فرماتے ہیں۔ جنوں نقصان دینے والی چیز نہیں ہے اگر گھر سے نکل جانے کے بعد گھر تباہ ہو جائیگا تو بلا سے ہو جائے گھر زیادہ سے زیادہ سو گز زمین ہوگی۔ اس سو گز زمین کے بدلے تا

پڑا جنگل ہاتھ آتا ہے یہ کیا ہنگا ہے عالمِ وحشت میں سر بصحرا نکل جانا چاہیے۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں　　گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

فرماتے ہیں یہ کیا سوال کرتے ہو کہ تیرا نوشتۂ تقدیر کیا ہے۔ اس سوال سے تو یہ پایا گیا گویا میری جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ میرے ماتھے پہ سجدۂ بت کا گٹا نظر آتا ہے اور یہی میرا نوشتۂ قسمت ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی　　روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں ہم زباں کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتہ کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں (از یادگارِ غالب)

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی　　غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

فرماتے ہیں یہ بات تو مسلّم ہے کہ بوسہ کی قیمت جان ہے لیکن وہ ابھی اس بات کو کیوں ظاہر کرے گا وہ تو ابھی تک غالب کو یہی جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ یہ سمجھ لیگا کہ غالب نیم جاں ہو گیا اس وقت بوسہ کی قیمت میں جان طلب کریگا کہ غالب جان دیکر بوسہ نہ خرید سکے

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں　　ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں　بیت

اسی مطلب کو جو پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے مصرع میں نئے رنگ سے کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دشت نوردی کے مانع کوئی تدبیر نہ ہوئی۔ اس کو اس طرح ادا کرنا کہ پاؤں میں چکر ہے مگر زنجیر نہیں۔ کمال بلاغت ہے۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں　　جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

فرماتے ہیں۔ شوقِ عرفاں مجھکو اس ویرانہ کی طرف کھینچ کر لے چلا ہے جہاں جادہ یعنی پٹیا نگاہِ دیدۂ تصویر کی طرح معدوم ہے۔ گویا اس رستہ پہ قدم رکھکر ہر شخص کو حیرانی پیدا ہو جاتی ہے

مطلب یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کی منزل ایسی کٹھن ہے کہ جہاں انسان سراپا حیرت بن جاتا ہے۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

جادہ یعنی راستہ کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں۔ مگر چونکہ وفا کی راہ سر تا سر تلوار کی دھار پر ہے اٹھتے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے۔ بس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے (رسالہ یادگارِ غالب)

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

فرماتے ہیں ہمیشہ کیلئے نا امیدی کا رنج مجھکو گوارا ہے یعنی میں اس بات سے بہت خوش ہوں اگر میرا نالہ تاثیر کا منت پذیر نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرزا صاحبؒ یاس و نا امیدی کے فریاد کی مدد سے کامیابی حاصل ہونے میں ذلت اور ہتک سمجھتے ہیں۔ اور یہی کامیابی کے متعلق میں بےحد دوست ہونے پر فخر ظاہر کرتے ہیں۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

فرماتے ہیں زخمِ سر جس وقت اچھا ہو جاتا ہے پھر سر میں کھجلی ہونی شروع ہو جاتی ہے پتھر کھانے کا مزا احاطۂ تقریر سے باہر ہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ ہمیشہ اندمالِ زخم کے بعد زخم میں کھجلی ہوتی ہے۔ اس کو میرزا صاحبؒ نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

فرماتے ہیں۔ جب دوست کی عنایت گستاخی و بیباکی کی اجازت دے تو اس وقت ارتکابِ گناہ میں جھجکنے سے زیادہ کوئی گناہ نہیں۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اس مقطع کا مصرعِ ثانی ناسخ کی تصنیف ہے۔ میرزا صاحب نے اس پر مصرع لگا کر اتفاقِ رائے ظاہر کیا ہے۔

مست مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

فرماتے ہیں۔ آنکھ کی پتلی میں یہ نگاہیں نہ سمجھو یعنی نگاہیں نہیں ہیں بلکہ نگاہوں کی جگہ (دلِ چشم میں) یعنی آنکھ کے بیچ میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔ سویدا اس سیاہ نقطہ کا نام ہے جو دل پر ایک خال کی صورت میں ہوتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میری آنکھ کے تل میں یہ نگاہیں نہیں ہیں بلکہ دلِ چشم میں آہیں ہیں یعنی میری آنکھیں اور نگاہیں دونوں حسرت آلود ہیں۔

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہئے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

فرماتے ہیں۔ دیدۂ عاشق کی برسات دیکھنے کے قابل ہے پھول کی طرح سے دیوارِ چمن کھل گئی (شق ہو گئی) جب دیوارِ چمن پھولوں کی طرح سے کھلی ہے تو کثرتِ غنچہ و گل گریۂ عاشق کے اثر سے دیکھنا چاہئے کہ کس حد تک پہنچی ہے۔

الفتِ گل سے غلط ہے دعوئے وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

فرماتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی آزاد و وارستہ مزاج ہو۔ دنیا میں آ کر عشق و محبت کے پھندے سے نہیں نکل سکتا اور اسکی مثال یہ پیش کرتے ہیں کہ سروِ آزاد باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن ہے (ایک قسم کا سرو ہوتا ہے جسکو سروِ آزاد کہتے ہیں)

بیب

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

فرماتے ہیں۔ عاشقی تاثیر سے ناامید نہیں ہے جانبازی بید کا درخت نہیں جو ثمر سے محروم رہے مطلب یہ ہے کہ عشق اگر صادق ہے تو اثر سے محروم رہ نہیں سکتا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

فرماتے ہیں۔ سلطنت ڈھلتی پھرتی چھاؤں کا حکم رکھتی ہے۔ ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جمشید سے ہاتھوں ہاتھ رندوں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ گویا جامِ مے کی طرح ایک سے دوسرے کو پہنچتی ہے۔ خاتمِ جمشید نہیں کہ جو دوسرے کے پاس آ ہی نہیں سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ جمشید کے پاس جامِ جم تھا جس میں شراب پی جاتی تھی۔ اسکے مستحق رندوں کے سوا اور لوگ نہیں

قرار پا سکتے۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

اس شعر میں میرزا صاحب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں کہ تیری تجلی وجودِ عالم کا سبب ہے جس طرح آفتاب کا طلوع باعثِ ظہورِ ذرات ہے۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر جانے کی جگہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے (از یادگارِ غالب)

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے　　غمِ محرومیِ جاوید نہیں

فرماتے ہیں۔ رنگِ طرب کے منقلب ہو جانے کا خوف ہے ورنہ محرومیِ جاوید کا غم نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان زمانۂ اقبالمندی کے بعد کسی سبب سے مفلس و بے زر ہو جاتا ہے تو اس کو بہ نسبت محتاج آدمیوں کے زیادہ صدمہ اور رنج پہنچتا ہے۔ اگر انسان اول ہی سے محتاج ہوتا ہے تو اس کو بے زری کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہلِ ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے (از یادگارِ غالب)

مطلب یہ ہے کہ امید شرطِ زندگی ہے اور جب کوئی امید نہیں ہے تو زندگی سے نا امید ہونا ہی لازمی ہے۔

زل　جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں!　　خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں جس جگہ زمین پر ہم تیرے نقشِ قدم کو دیکھ لیتے ہیں ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بہشتوں کا سامنا ہو گیا۔

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے　　سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

شعرا دہن و کمرِ معشوق کو عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ جو لوگ دہنِ بے نشاں پہ

عاشق ہو گئے ہیں وہ اپنے سودائے دل میں عدم کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہے۔ اسلئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے (از یادگارِ غالب)

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے محوِ آئینہ داری تو ذرا یہ تماشا تو دیکھ کہ ہم تجھ کو کس آرزو کے ساتھ دیکھ رہے ہیں یہ خطاب معشوق کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ تو آئینہ دیکھنے میں ایسا محو ہو گیا ہے کہ ہماری تمنا سے دیکھنے کا بھی تماشا نہیں دیکھتا۔

سراغِ تفِ نالہ داغِ دل ہے   کہ شبرو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اس شعر میں میرزا صاحب نالہ کشی کے وقت کو رات کا وقت قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے نالے کو شبرو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جس طرح رات کے آنے جانے والوں کا نقشِ قدم صبح کو دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں سمت سے کوئی شخص آیا اور فلاں سمت کو چلا گیا۔ اسی طرح داغِ دل سے نالۂ شب کی گرمی و سوز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب   تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم فقیروں کا بھیس بدل کر اہلِ کرم کی خوش نیت کا امتحان لیتے ہیں کچھ خدانخواستہ ہم کو احتیاجِ سوال نہیں ہے۔

غزل **ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں   کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں**

فرماتے ہیں آگ اپنی گرمی کی وجہ سے یار کی عادت سے ملنے لگی ہے یعنی بات بات پہ جلانا غصہ سے آگ بھبوکا بنجانا یہ خاص میرے معشوق کی عادت ہے اور آگ میں بھی یہ خاصیتیں پائی جاتی ہیں اسلئے عذابِ نار میرے واسطے لذت دہ ثابت ہوا ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں   شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

فرماتے ہیں میں اپنی عمر کا ٹھیک اندازہ نہیں بتا سکتا۔ بہت سی ہجر کی راتیں ایسی بسر کر چکا ہوں جن میں کی ایک ایک رات ہزار ہزار برس کے برابر تھی اگر ان سب راتوں کو شمار میں لاؤں اور ان کا حساب لگاؤں تو اتنے برس سے جی رہا ہوں کہ وہ گنتی ہی میں نہیں آسکتے

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

فرماتے ہیں حالت انتظار میں یہ سمجھ کر اب وہ نہ آئیں گے۔ بدقسمتی سے ہماری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ خواب میں تشریف لائے اور اپنے وعدہ پر آنے کا وعدہ کر گئے۔ یعنی یہ کہہ گئے کہ تم انتظار کرو ہم ضرور آئیں گے اور یہ وعدہ اس واسطے انہوں نے کیا کہ ہم کو زندگی بھر پھر دوبارہ نیند نہ آئے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے یعنی وہ کچھ نہیں لکھیں گے اس لئے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں (از یادگار غالب)

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے (از یادگار غالب)

جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

فرماتے ہیں۔ جو شخص وفا کے وجود ہی سے منکر ہو اس پر فریب وفا کیونکر چل سکتا ہے پھر کیوں دوست سے بدگمان ہوں دشمن کے باب میں مطلب شعر کا یہ ہے کہ میرا دوست منکر وفا ہے اس پر غیر کا فریب وفا نہیں چل سکتا میں دشمن کے باب میں دوست سے کیوں بدگمان ہوں کہ یہ فریب وفائے دشمن میں مبتلا ہو گیا ہے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں۔ میں تو وصل میں اس وجہ سے مضطرب ہوں کہ کہیں تمہارا دوسرا ملنے والا یعنی میرا رقیب نہ آجائے۔ تم کو شاید اس وہم کی وجہ سے پیچ و تاب ہے کہ اس کا کوئی دوسرا معشوق میرے علاوہ ہے اور یہ اس سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے اس لئے گھبرایا ہوا ہے۔

میں اور خطِ وصل خدا ساز بات ہے   جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

خطِ وصل وہ خط جس میں وصل کا وعدہ تحریر ہو۔ فرماتے ہیں۔ میری یہ قسمت کہ وہ مجھے خط میں وصل کا وعدہ لکھکر بھیجے۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے میری بات بنادی۔ اس خط پر مجھے جان قربان کردینی چاہئے۔ یہ بات میں جوشِ خوشی میں بھول گیا۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے   ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں   بیت

فرماتے ہیں۔ نقاب کے اندر بھی غصے سے اسکی تیوری چڑھی ہوئی ہے اور اس کا غصہ اس غضب کا ہے کہ اس غصہ کا اثر نقاب پر بھی ہوگیا ہے یعنی تیوری کے مقام پر نقاب میں شکن واقع ہوگئی ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اسکا التفات اور میلانِ طبع پایا جائے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگھار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جس میں حسنِ ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے بہت زیادہ دلفریب اور دل آویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگھار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہوجاتا ہے۔ مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوشنما اور دلربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم کچھ

رہتے ہیں۔ اسکی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چونکہ مولانا نہایت صاف اور صریح الفاظ اشعار کو پسند کرتے تھے اس لئے میرزا کا کلام سن کر اکثر ہنستے تھے اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور تعجب کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے کہا گیا کہ میرزا غالب کا۔ چونکہ وہ میرزا کے شعر کی بھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بیساختہ اُن کے منھ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی فرمایا اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ میرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب یہاں آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا (از یادگار غالب)

وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے — جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

فرماتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے وہ نالہ دل معشوق میں ایک بھانس کے برابر بھی جگہ نہیں پاتا جس نالہ سے آفتاب میں دراڑ آجاتی ہے۔

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے — جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

فرماتے ہیں۔ وہ جادو مدعا طلبی میں معشوق کے دل میں کچھ کام نہیں دیتا جس جادو سے کشتی سراب میں رواں ہوجاتی ہے۔ (سراب یعنی چمکنے والا ریت کا دریا جس پر دور سے پانی کا دھوکا ہوا کرتا ہے)

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

سنا جاتا ہے کہ شراب ابر و باراں کے دن یا شب ماہتاب میں زیادہ لطف دیتی ہے میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے کے بعد بھی ان دونوں موقعوں پر یعنی ابر کے دن اور چاندنی رات میں بے پئے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔

کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوء ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

فرماتے ہیں۔ کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خست نہ کر۔ مشہور ہے کہ جو یہاں

میں شراب پیئے گا وہ آخرت میں شراب طہور ہی سے محروم رہیگا) یہ سمجھنا کہ ساقی کوثر شراب طہور سے نہ دینگے یہ بات ساقی کوثر کی فیاضی پر سوئے ظن ہے یہاں پیا نہیں تو سکتا یعنی وہاں بھی ضرور ملے گی۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند   گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُس کو گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں۔ کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔ (از یادگار غالب)

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع   گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

فرماتے ہیں۔ گانا سن کر جان کیوں جسم سے نکلنے لگتی ہے یعنی ایسی حالت کیوں طاری ہو جاتی ہے کہ جو تڑپا دیتی ہے۔ اگر وہ صدا یعنی شاہد حق کی آواز چنگ و رباب میں سمائی ہوئی ہے تو اس سے جان بخشی کا فعل کیوں نہیں سرزد ہوتا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اس کے اختیار سے باہر ہو جانا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے (از یادگار غالب)

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے   جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوا اللہ مراد ہے جو صوفیہ کے نزدیک بالکل معدوم ہے اس لئے کہ وجود واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجود ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب

میں مبتلا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بُعد ہے۔ (از یادگار غالب)

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں مشاہدہ ہے کس حساب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں۔ شاہد کے معنی ہیں دیکھنے والے کے اور مشہود اس کو کہتے ہیں جس کو دیکھا جائے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں شہود و شاہد و مشہود کی اصل ایک ہی ہے مجھ کو حیرت ہے کہ جب یہ تینوں چیزیں ایک ہیں تو مشاہدہ کس حساب میں داخل ہے۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و پوچ ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا ہے منتہائے بلاغت ہے (از یادگار غالب)

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

فرماتے ہیں۔ شرم ایک ادائے ناز معشوقانہ ہے اگر اپنی ذات سے بھی ہے تو بھی اس کو ادائے معشوقانہ ہی کہا جائیگا لیکن اس کا استعمال ہمیشہ بے حجابی کے موقع پر ہوگا یعنی حجاب کی حالت میں ادائے ناز برتی نہیں جا سکتی اور جس حالت میں اس کا استعمال روا رکھا گیا ہے تو وہ حجاب عین بے حجابی ہے۔ یہ شعر بھی تصوف میں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ حجاب جو نظر آتے ہیں ایسے ہیں کہ جن سے جلوہ ہی نظر آ رہا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

نقاب، استعارہ ہے حجب قدس کا اور آئینہ اس میں علم ما یکون و ما کان کا حکم رکھتا ہے اور آرائش جمال سے فارغ ہونا تعبیر ہے کل یوم ہو فی شان کی۔

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کما قال جس و

ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی (از یادگار غالب)

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

فرماتے ہیں۔ اے غالب ندیم دوست سے دوست کی بو آیا کرتی ہے اس لئے میں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی محبت کو عبادت تصور کرتا ہوں۔

بیت

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

فرماتے ہیں۔ دو عزیز مرنے والوں کا ماتم دار اگر ایک شخص ہو تو مرنے والوں کی کثرت سے ان کے اعزاز میں فرق آتا ہے۔ اس لئے اگر مجھکو مقدور ہو تو ایک نوحہ گر اپنے ساتھ رکھوں یعنی ہائے دل کہکر میں روتا ہوں اور ہائے جگر کہہ کر وہ پیٹتا ہے یا ایک کا مرثیہ میں پڑھوں اور ایک کا نوحہ وہ۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

فرماتے ہیں۔ رشک نے مجھکو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ کسی غیر سے تیرے مکان کا پتہ دریافت کر سکوں اور پتہ نہ ملنے سے اس قدر اضطراب و قلق بڑھ گیا ہے کہ بغیر دریافت کئے رہ نہیں سکتا اسلئے ہر راہگیر سے دریافت کرتا جا رہا ہوں کہ میں کدھر جاؤں۔ ممکن ہے کہ کوئی مجھ جیسا تیرا طالب مجھکو مل جائے اور وہ تیرے مکان سے بھی واقف ہو اور میرا ہم سفر بھی بن جائے۔

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

فرماتے ہیں۔ تیرا راستہ رقیب کے گھر کے آگے سے ہو کر ہے۔ اس لئے مجھ کو ہزار ہزار مرتبہ رقیب کے دروازہ پر ہو کر تیری تلاش میں گزرنا پڑتا ہے۔ کاش میں تیرے گھر کے رستے سے واقف نہ ہوتا۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

فرماتے ہیں تم نے جو میرے ارادۂ قتل پر کمر کسی ہے اور یہ کہکر ڈرا رہے ہو کہ اب میں تجھے قتل کرتا ہوں۔ اس دھمکی سے میری جان ڈرتی ہے کیا میں تمہاری کمر کو جانتا نہیں کہ تم سے وار بھی نہ ہو سکے گا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فرماتے ہیں۔ لو اور سنو میں نے جن کے خوش کرنے کی غرض سے اپنا تمام مال و زر لٹا دیا اب وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ تو بے ننگ و نام ہے ہم تجھ سے نہیں ملتے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالب راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ طالب اوّل اوّل جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اُسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ پھر جب کوئی اس سے بڑھکر نظر آتا ہے تو اُس کا تعاقب کرتا ہے وعلیٰ ہذا۔ اور وجہ اس تذبذب و تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کامل کو پہچان نہیں سکتا (یادگارِ غالب)

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

اس شعر میں خیال نہایت نازک واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ بے وقوف لوگوں نے میری خواہش یعنی طلبِ معشوق کو پرستش قرار دے لیا ہے۔ اسی خیال کے عالم میں دریافت فرماتے ہیں کہ کیا میں بت کو پوجتا ہوں۔ خود بدولت کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس بیداد گر کے سامنے جا کر ہمارا نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

فرماتے ہیں بیخودیِ عشق میں گم ہو کر میں اپنے کو بھول گیا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوچۂ یار میں پہنچ کر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے یعنی میں اپنے آپ سے گزر گیا ہوں اور جو حالت سے پہلے میں نہیں ملتے تو پہنچ کر رستے کو بھی بھول گیا ہوں اب اپنی خبر کو بھی وہاں نہیں پا سکتا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا   سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

فرماتے ہیں۔ میں سارے زمانہ کو اپنی طرح کا ہنر دوست سمجھ رہا ہوں اور اسی غلطی کی وجہ سے متاعِ ہنر کو دلپذیر سمجھتا ہوں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی موجودہ زمانہ میں ہنر کو لوگوں نے متاع کا ضد سمجھ رکھا ہے ۔

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز   دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

سمندِ ناز وہ گھوڑا جو ناز و ادا سے زمین پر قدم رکھے ۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے ۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں   غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں   کسی   بہب

فرماتے ہیں۔ اس کو میرے نام سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے مجھے برا کہنے کی غرض سے بھی میرا نام لیتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ غیر اس بات کا عادی ہے کہ ہمیشہ اس سے میری بدگوئی کرتا رہتا ہے۔ تعجب نہیں کہ اس وجہ سے دشمن میں اور اس میں بگاڑ کی صورت پیدا ہو جائے ۔

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق   مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

فرماتے ہیں۔ باغ میں سیر کے واسطے میرے ساتھ چلنے کا اس نے وعدہ کیا ہے اس وعدہ سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھکو قتل کرے گا۔ میرے یہ نصیب کہاں کہ میں اس کے ہمراہ جا کر تماشائے لالہ و گل دیکھوں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ وہ پھولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا اور ان کو رقیب سمجھکر رشک سے قتل ہو جاؤں گا ۔

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

فرماتے ہیں ہستی کے ساتھ عالم کو اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کمر کو معشوق کے ساتھ۔ گویا ہے اور نہیں ہے ہم کو یہ بات بھی منظور نہیں ہے کہ عالم ہستی کے ساتھ کمر یا کسی طرح بھی منسوب کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ عالم کی ہستی برائے نام بھی نہیں ہے ۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن   ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم بھی وہی قطرہ ہیں جو دریا میں حل کر دیا گیا ہے یعنی فنا فی لذات ہو جانیکا مرتبہ ہم کو بھی حاصل ہے مگر زبان سے ایسا کہنا منصور کی تقلید سمجھا جائیگا اور ہمیں تنگ ظرفی منصور کی تقلید کرنی منظور نہیں ہے۔

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

فرماتے ہیں ہنگامۂ عشق و محبت کی سوزشوں کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہے اور ہمارے تنِ رنجور میں تاب و تواں باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے ہم حسرت کو مخاطب کر کے اظہارِ حسرت و یاس کرتے ہیں

ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں کس عزت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

معشوق کی حاضر جوابی نے اس شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے جو اس سے یہ کہا کہ تم یہاں تو ہم سے نفرت کرتے ہو اور دور دور رہتے ہو۔ ہم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے تم کو مانگ لیں گے۔ یہ سنکر نہایت غرور کے ساتھ اُس شوخ نے ہم سے یہ کہدیا کہ ہم حور نہیں ہیں جو تم کو مل جائیں گے۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

فرماتے ہیں اگر تو مجھ کو لطف کے قابل نہیں سمجھتا تو میں تاکید سے کہتا ہوں کہ مجھ پہ ظلم کر ظلم تغافل تو اُس حالت میں زیبا تھا کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور ہوتا۔

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ جو افشردۂ انگور نہیں

فرماتے ہیں یہ بات تقلیدِ جم کے خلاف ہے کہ ادنےٰ درجہ کی شراب پی جائے وہ شراب بدنصیب ہے جو انگوری نہ ہو یعنی شرابِ ناب ہو ہم لوگ ایسی کم رتبہ شراب کو منہ بھی نہیں لگاتے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

فرماتے ہیں میں ظہوری کے مدمقابل ہوں اور میرا یہ دعویٰ اس دلیل سے ہے کہ وہ ظہوری تھا اور میں خفائی ہوں یعنی وہ مشہور تھا اور میں مشہور نہیں ہوں اور اس تقابل کا یہ نامی سے

دعوے پر دلیل ہے۔

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

فرماتے ہیں۔ میرے نالہ کو شکوۂ بیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی میں ظلم و ستم کی شکایت میں نالہ کشی نہیں کرتا ہوں بلکہ یہ حسن طلب ہے تقاضائے جفا کا مطلب یہ ہے کہ تم یوں تو ہم پر ظلم و ستم نہیں کرتے مگر ہمارے نالوں سے تنگ آکر تو ہم پر جفا کروگے۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

فرماتے ہیں۔ مرتبۂ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ وہ مزدوری کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے یعنی فرہاد نے جو کوہ بے ستون کاٹا وہ اس غرض سے کاٹا کہ عشرت گاہ خسرواں پتھروں سے تعمیر کیا جائیگا۔ یہ ایک مزدور پیشہ کا کام تھا عشق کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے اس لئے ہم کو فرہاد کی نیکنامی میں کلام ہے ہم اس کو دفتر عشاق میں نامزد نہیں کرسکتے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ویران ہونے میں میرا گھر بھی صحرا سے کم نہ تھا مگر اس میں یہ وسعت کہاں تھی جو جنگل میں ہے۔

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

فرماتے ہیں۔ اہل نظر کیلئے طوفانِ حوادث مکتب کا حکم رکھتا ہے۔ موج حوادث کے تماچے سیلیِ اُستاد سے عبرت کا سبق حاصل کرنے کے لئے کم نہیں۔

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اپنی عادت تسلیم و رضا کے سبب سے نالہ و فریاد کرنے سے حذر کرتے ہیں لیکن ہمارا معشوق یہ جانتا ہے کہ ہم کو طاقتِ فریاد نہیں ہے۔ اس سبب سے ہم نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ضبط کی داد بھی ہم کو نہیں ملی۔

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر گل و لالہ چراغانِ رہگذرِ باد نہیں ہیں تو ان کا رنگِ تمکین اس قدر بے ثبات کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے اگر ہوا کے مقام پر چراغ جلا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ تو وہ جلد بجھ جاتا ہے اور گل و لالہ بھی ناپائدار ہوتے ہیں۔ یعنی پھول ایک دو دن سے زیادہ قیام پذیر نہیں ہوتے

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سبدِ گل وہ ٹوکری جس میں گلچیں پھول توڑ کر یا چن کر جمع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں گل کی ٹوکری کے نیچے گلچیں نے بند کیا ہے۔ اے مرغِ گرفتار تجھ کو مبارک ہو کہ گلزار میں صیاد نہیں۔ اگر وہ ظالم ہوتا تو مرغِ چمن کو گل سے اتنا قرب حاصل نہ ہوتا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

فرماتے ہیں۔ نہیں سے گویا اثبات تراوش کرتی ہے (نفی سے مراد یہاں لفظ نہیں ہے اور اثبات سے مراد لفظ ہاں ہے۔ ہاں تانیث ہے۔ اس لئے میرزا صاحب نے اثبات کو بھی تانیث لکھا ہے) تراوش کے معنی یہاں ظاہر ہونے کے لئے ہیں۔ دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں مطلب یہ ہے دہن کو شعرا معدوم لکھتے ہیں اور معشوق کو روزِ ازل ہی بجائے دہن کے نہیں کا لفظ عطا ہوا ہے یعنی ہر بات پر معشوق نہیں کہہ دیتا ہے اور نہیں کہہ دینے سے دہن کا ثبوت ملتا ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

فرماتے ہیں جلوہ گری میں تیرا کوچہ اور بہشت دونوں کا رتبہ مساوی ہے۔ اس کا بھی یہی نقشہ ہے یعنی وہاں خدا کا دیدار ہوگا تو یہاں تیرا دیدار ہوتا ہے لیکن دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ تیرے کوچے کے مقابلے میں آباد کم ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

فرماتے ہیں۔ اے غالب کس منہ سے تم غربت کی شکایت کرتے ہو۔ کیا تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں ہے یعنی مسافرت میں اگر کوئی شخص تمہارا پرسانِ حال نہیں تو وطن میں کون تمہاری بات پوچھتا تھا۔

بہترین
دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہان لیکر خاموش ہو رہا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع ہو گیا۔ بلکہ مجھکو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لئے خاموشی اختیار کی (از یادگار غالب)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مقام سے منازل سلوک و معرفت مراد ہیں۔ فرماتے ہیں حوصلہ طلب کے موافق ہر منزل پر دو چار طلبگار تھک تھک کر ٹھہر گئے۔ تیرا پتہ تو کہیں ملتا ہی نہیں ناچار ہو کر ٹھہر نہ جائیں تو کیا کریں۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

فرماتے ہیں۔ اہل بزم شمع کے ہوا خواہ ہیں۔ یہ اس کا جلتے جلتے فنا ہو جانا کب چاہتے ہیں اس بیان سے اپنے حال کی تمثیل مراد ہے۔ دوسرے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ غم عشق ہی جانگداز ہو تو ہمارے غمخوار ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔

بہتر
ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

فرماتے ہیں۔ غیر کی لاف زنی سے وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ شخص مجھ پر عاشق ہے اور اس کے سارے دعوے سچے اور درست ہیں۔ ہم بے زبان یعنی کم سخن ہیں ہماری محبت کا اسکو یقین نہیں ہے۔

قیامت ہے کہ سن لیلےٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

فرماتے ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ دشت قیس میں لیلیٰ کا بیابانہ چلا آنا سنکر تعجب سے وہ کہتا ہے کہ بھلا ایسا غضب بھی کہیں زمانہ میں ہوتا ہے کہ معشوق شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر عاشق کی پرسش حال کے لئے اس کے مسکن پر پہنچ جائے۔

دل نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

فرماتے ہیں۔ وہ دل کا نازک یعنی بودے دل کا آدمی ہے۔ اے غالب مجھکو اس پر رحم آتا ہے اگر تو امتحان الفت لینے کیلئے آمادہ کریگا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرے جان قربان کر دینے کے بعد اس کا

دل اس صدمہ سے تکلیف اُٹھائے۔

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

فرماتے ہیں کسی پر عاشق ہو کر وہ بھی تنہائی پسند ہو گئے ہم نے اپنی بیکسی اور تنہائی کی داد دنیا ہی میں یاں یعنی ہماری بیکسی کا صبر ان پر پڑ گیا۔ جو حالت ہماری ان کے عشق میں تھی۔ وہ حالت ان کی غیر کی محبت میں ہو گئی۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

سورج کو اس لیے لیا ہے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں۔ رہگزر باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے (از یادگارِ غالب)

غزل
یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہجر میں ہم کو قاصد کا انتظار ہے۔ شاید اس کی طرف سے کوئی حسبِ دلخواہ پیام آئے یا ہمارے پیام کا جواب آ جائے دیوار کو دیکھنے سے یہ مدعا ہے کہ شاید صبا پیام لیکر آئے تو وہ دیوار پر سے آئیگی اور دروازہ کے دیکھنے سے یہ مطلب ہے کہ اگر نامہ بر جواب لیکر آیا تو وہ دروازہ سے آئیگا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوئی ہے دوسرے مصرع میں اس کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہوا (از یادگارِ غالب)

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

زخمِ جگر کی گہرائی اس سے بہتر لفظوں میں ادا ہی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں۔ لوگ حیرت سے میرے زخمِ جگر کی گہرائی دیکھ رہے ہیں اور مجھکو یہ خوف ہے کہیں اس کے دست و بازو کو نظر نہ ہو جائے بے مثل شعر کہا ہے۔

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ ہم اُن جواہرات کو کیا دیکھیں جو تیری ٹوپی پر ٹکے ہوتے ہیں۔ ہم تو لعل و گوہر کے نصیبے کی بلندی کو دیکھتے ہیں کہ ان سنگریزوں اور پانی کے قطروں کو خوش نصیبی سے یہ اوج حاصل ہو گیا ہے۔

غزل

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

فرماتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھ کو قیامت کا یا اس کے آنے کا اعتقاد نہ ہو لیکن ضرور کہوں گا کہ اس کی مصیبتیں شبِ فراق کی تکلیفوں سے زیادہ نہ ہونگی۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے   بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

چاندنی راتیں اور برسات کی گھٹائیں شراب خوار کے واسطے لطف افزا ہیں۔ فرماتے ہیں اگر آج دن کو اودی اودی گھٹائیں اور ٹھنڈی ہوائیں نہیں ہیں تو ہوں شبِ ماہ تو ہے ہم رات کو چاندنی میں بیٹھ کر شراب پئیں گے۔

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں   جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

میرزا صاحب اس شعر میں معشوق کی بے التفاتی اور کم توجہی کی شکایت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی ملاقات کو جاتا ہوں تو وہ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور رخصت ہوتا ہوں تو خیر باد نہیں کہتے دونوں موقعوں پر بے پروائی برتتے ہیں۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں   کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وقت میرا خیال ان کو آجاتا ہے تو اہلِ بزم سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ آج ہماری محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں ہے۔ یعنی حضرت غالب تشریف نہیں لائے جو بات بات پر رشک کی بدولت اہلِ بزم سے اٹکتے اور اُلجھتے تھے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب   گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

عید کے دن محتاج و مساکین کو خیرات زیادہ دی جاتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ دی جاتی ہے فرماتے ہیں میخانہ میں عید کے دن کی کچھ قید نہیں ہے۔ پیرِ مغاں کا فیض روز جاری رہتا ہے

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

پہلے دنیا کا قاعدہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں غم و شادی توام ہوا کرتے ہیں یعنی کبھی غم ہے تو کبھی شادی ہے اور پھر اس بیان پر حسرت ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو تو خدا نے وہ دل دیا ہے جو کبھی شاد ہی نہیں ہوتا یعنی ہمارے لئے تو دنیا میں غم ہی غم ہے۔

تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

اس شعر کا لطف وجدانی ہے۔ بیان میں نہیں آسکتا۔ موقع یہ چاہتا تھا کہ مصرع اول شکایت کا پہلو لئے ہوئے ہوتا اور میرزا صاحب نے واعظانہ طریقہ سے بیان کیا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ مصرع ثانی یہ بتا رہا ہے کہ تم ان سے یہ کہو گے کہ تم نے ہم سے وعدہ خلافی کی اور وہ کہیں گے کہ تو جھوٹا ہے ہمیں تیرا وعدہ یاد نہیں۔ باہم دگر تکرار ہوگی۔ تکرار سے رنج نکلیگا۔ رنج سے جان عاشق پر مصیبت نازل ہو جائیگی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ان کے بھولے ہوئے وعدہ کا ذکر ہی نہ کرو۔

غزل

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ تیرے توسن کی صبا سے تشبیہ دیکر اپنی مضمون نگاری کی ہوا باندھتے ہیں ورنہ تیرا توسن صبا سے زیادہ چالاک ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اثر کی امید پر ہم آہ نہیں کرتے نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ آہ میں تاثیر ہوتی ہے ہم تو صرف اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں۔

تیری سرعت کے مقابل اے عمر
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اے عمر تیری تیز رفتاری کے مقابلہ میں بجلی کو پابہ حنا باندھتے ہیں پابہ حنا چلنے سے معذور ہونے کا استعارہ ہے۔

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ انسان کو دنیا کی اور ساری قیدوں سے رہائی اور آزادی مل سکتی ہے لیکن قید ہستی

ت نہیں مل سکتی۔ قطرۂ اشک کو باوجود بے سروپائی کے باندھتے ہیں اور وہ بندھ جاتا ہے اور انسان بھی اشک کی طرح بے سروپا ہے اسلئے ہستی کی قید میں ہم ضرور رہینگے اور مرتبۂ فنا جو عین آزادی ہے حاصل نہیں ہوگا۔

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ نشۂ رنگ کی وجہ سے پھول کھلا کرتے ہیں اور جب وہ کھل جاتے ہیں تو وہ نشۂ رنگ اور بھی زور پکڑ جاتا اور مست کبھی بندِ قبا باندھا نہیں کرتے اسی لئے گل کے بھی بندِ قبا کھلے ہوئے ہیں۔

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ لوگ یعنی شعرا نالہ کو رسا باندھتے ہیں اور اس کی رسائی کے قائل بھی ہیں یہ ان کے مضامین کی غلطی ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نالہ کو رسائی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر نالہ رسا ہوتا تو قیامت تک باندھا نہ جا سکتا۔ اس کا بندھ جانا نارسائی کی دلیل ہے۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ اہلِ تدبیر یعنی عقلمند آدمیوں کی باتیں تو دیکھو کہ آبلہ پا پر مہندی باندھکر پاؤں کو عضوِ معطل بنا دیتے ہیں یعنی ایک تو انسان آبلۂ پا کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اس پر علاج کی غرض سے حنا کا باندھنا بالکل ہی پاؤں کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہلِ جنوں کو دیکھو کہ وہ آبلہ پائی میں بھی دشت پرخار طے کرتے ہیں۔

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

ہم سے لفظ کو زور دیکر پڑھنا چاہئے یعنی ہم کو فریب دیتے ہیں اور بھی کسی کو نہیں۔ فرماتے ہیں۔ یہ ان کی بیوقوفی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہم ان کے فریب میں آ جائیں گے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فرماتے ہیں۔ زمانہ جس قدر ہم کو آزار پہنچاتا ہے یہ بہت ہی کم ہے۔ اسد کی جان کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو اس سے زیادہ ستم سہنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ ہمیشہ تیرے در پر تیرے سنگِ در کی طرح سے پڑا نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی کو خاک میں ملا دوں کہ میں پتھر یعنی تیرا سنگِ در بھی نہیں ہوں۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ پیالہ و ساغر کی طرح مجھ کو دن رات گردش نصیب ہے وہ ایک بے جان شے ہیں اگر ان کو شراب مدام کی وجہ سے شب و روز گردش رہتی ہے تو ان کو اس کی تکلیف نہیں پہنچتی ہے۔ وہ بے حس چیز ہیں۔ میں انسان ہو کر کب تک ایسی گردش میں مبتلا رہ سکتا ہوں۔ دل کیوں نہ گھبرا جائے۔

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ مجھکو کس وجہ سے زمانہ مٹاتا ہے باوجودیکہ میں حرفِ مکرر نہیں اور سوا کوئی وجہ میرے مٹنے کی ثابت نہیں ہوتی۔ حرفِ مکرر کا مٹانا لازمی سمجھا جاتا ہے وہ میں ہوں نہیں۔

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

فرماتے ہیں۔ کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہمیشہ جاری رہیگا اور مسلمان گنہگاروں کیلئے میعادِ سزا مقرر ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہمیشہ سے عذاب میں مبتلا چلا آتا ہوں رہائی نہیں پاتا۔

قطعہ ✿ نعتیہ

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

یہ شعر نعت میں ہے۔ بارگاہِ نبوت میں میرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ حضور کس واسطے مجھ کو عزیز نہیں رکھتے ہو کچھ لعل و زمرد و گوہر تو نہیں ہوں یعنی مال دنیا میں نہیں ہوں کہ جس کو آپ عزیز نہ رکھتے تھے۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

یعنی آپ میری آنکھوں پر قدم کیوں نہیں رکھتے۔ میں رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں شبِ معراج میں تو آپ نے مہر و ماہ کو قدم بوسی کا موقع عطا فرمایا تھا۔

کرتے ہو مجھکو منعِ قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مجھ کو قدم بوس ہونے سے کیوں منع کیا جاتا ہے آسمان پر تو حضور کے قدم گئے تھے کیا میرا مرتبہ آسمان سے بھی ہے۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اداۓ شکر کا نیا پہلو ہے۔ وظیفہ اس تنخواہ کو کہتے ہیں جو بلا معاوضۂ خدمت کے ملا کرتی ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

غزل سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اس شعر میں اہل ہنود کے عقیدۂ تناسخ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں سب نہیں بلکہ تھوڑی سی مٹنے والوں کی صورتیں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ہیں ورنہ بڑے بڑے حسین خاک کا رزق ہو گئے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اس شعر میں بھی ابنائے روزگار کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہم کو بھی تم لوگوں کی طرح سے رنگ برنگ جلسے کرنے کا شوق تھا لیکن شباب کا زمانہ گزر جانے سے اب ہمارا حال عبرتناک ہو گیا ہے وہ شوق اور وہ صحبتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں ہم کو دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

شمال کی جانب آسمان پر سات ستارے ہیں۔ ان میں چار ستارے جنازہ ہیں اور تین جنازہ کے اٹھانے والے عرب ان کو لڑکیاں سمجھتے ہیں اور ہندوستان کی عورتیں سات سہیلیوں کا جھمکا کہتی ہیں تاہم ان کا نام بنات النعش ہے۔ فرماتے ہیں۔ دن کو تو وہ آسمان کے پردے میں چھپی رہتی ہیں اور رات کو پردہ سے نکل آتی ہیں یعنی عریاں ہو جاتی ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے کس واسطے کہ جس طرح روزن زنداں ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوبؑ کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں (از یادگار غالب)

رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ سب عاشق تو رقیبوں سے ناخوش ہوا کرتے ہیں۔ لیکن مصر کی عورتوں سے زلیخا خوش ہے کہ یہ عورتیں حضرت یوسف پر عاشق ہو گئیں۔ یہ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ جب زلیخا کا عشق حضرت یوسفؑ سے ظاہر ہو گیا تو زنانِ مصر زلیخا کو عاشق ہونے کے طعنے دیتی تھیں۔ زلیخا نے ان عورتوں میں سے سو عورتوں کو منتخب کر کے ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری ہاتھوں میں دی اور کہا کہ جب تم حضرت یوسف کو دیکھنا ان چھریوں سے یہ لیموں تراش لینا جب حضرت یوسفؑ سامنے بلائے گئے تو ان عورتوں نے بجائے لیموں تراشنے کے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ زلیخا نے خوش ہو کر عورتوں سے کہا کہ دیکھا تم تو مجھ پر طعنہ زن تھیں۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ شبِ تارِ فراق میں جو خون آنکھوں سے بہے گا میں اس کو یہ سمجھوں گا کہ دو موم بتیاں اندھیرے میں روشن ہو گئی ہیں اور یہ تسکین خاطر کا سبب ہو جائیگا۔

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ یہ معشوق جو دنیا میں ہم کو جلاتے ہیں۔ خلد میں ہم اپنا بدلہ ان سے لے لیں گے اگر خدا کی قدرت سے یہ عورتیں ہم کو حور بنکر مل جائینگی۔

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یہ شعر مرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے اس کی شرح اور تعریف بیان سے مستغنی ہے اہلِ ذوق اپنے اپنے خیال کے موافق اس سے لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ میرے باغ میں جانے سے بلبلیں غزلخوانی کرنے لگیں جس طرح مکتب میں طالبعلم سبق پڑھتے ہیں۔ قاعدہ ہے بلبل آوازِ خوش سنکر زمزمہ سرائی کیا کرتی ہے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہوں کے مژگان ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب اوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ (از یادگارِ غالب)

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ میں نے آہوں کو بار بار ضبط کیا اور وہ بار بار اُبھرتی رہیں۔ اس لئے میری آہیں چاک گریبان کا بخیہ ہو گئیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آہوں کے ضبط کر لینے سے باوجود گریبان چاک ہونے کے عشق کا پردہ ہو گیا۔

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں ہی اور وہی مستعمل دعائیں جو درباں کو دے چکا ہوں دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونی ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ اس واسطے کہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جبکہ دعائیں نبڑ چکیں (از یادگارِ غالب)

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

فرماتے ہیں شراب جانفزا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا اس کے ہاتھ کی سب لکیریں یا سچ مچ رگِ جاں بن گئیں۔ گویا کا لفظ مبالغہ کم کرنے کی غرض سے یہاں استعمال ہوا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں (از یادگارِ غالب)

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فرماتے ہیں۔ آدمی جب رنج و غم کا عادی ہو جاتا ہے تو رنج کی سختی اور تکلیف کم ہو جاتی ہے

مجھ پر اتنی مشکلوں کا ہجوم ہوا کہ وہ خود بخود آسان ہو گئیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں   دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اس مقطع میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں ایک یہ کہ رونے کے اثر سے آبادیاں ویران ہو جائینگی اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ سیلاب اشک مکانوں کو ڈھا کر بستیوں کو ویران کر دیگا۔

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں،   یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں ۸۲

فرماتے ہیں۔ یہ بھی دیوانگی ہے کہ جس نے ہمارے گریبان میں ایک تار بھی نہ چھوڑا۔ اگر دو چار تار بھی جنون کے ہاتھ سے بچ جاتے تو ہم انہی کو زنار سمجھتے اس لئے کہ مذہب جسم پرستی میں زنار کا ہونا ضرور تھا۔

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے   دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ دیدار کی تمنا میں جب ہم اپنے دل کو خاک میں ملا چکے۔ اس کے بعد اپنے امتحان کا خیال آیا غور کرنے سے ثابت ہوا کہ دل کے مٹ جانے نے تاب و طاقت دیدار کو بھی مٹا دیا اب اگر وہ دیدار کرا دے بھی تو ہم میں جلوۂ دیدار دیکھنے کی قابلیت اور ضبط کی طاقت نہیں ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے   دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک نکتہ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی اس لئے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں ہے تو اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (از یادگار غالب)

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں   طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

فرماتے ہیں عشق کے بغیر عمر گزر بھی نہیں سکتی اور مصائب عشق برداشت کرنے کی دل میں طاقت بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے زندگی بسر کرنے کیلئے دنیا سے تعلقات بھی تو ہم رکھتے ہیں۔ رنج و درد گو

سے دل بھی اُکتا جاتا ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

فرماتے ہیں شوریدہ سری نے گھر میں نہ ٹکنے دیا وحشت سے تنگ آ کر بصحرا نکل کھڑے ہوئے مگر اس وحشت سے نجات یہاں بھی حاصل نہ ہوئی۔ اب مشکل یہ آ پڑی کہ جنگل میں سر پھوڑ کر مر جانے کے لئے دیوار نہیں ملتی۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ گنجائشِ عداوتِ اغیار کا تو ذکر ہی کیا ہے عشق و ہوس کا زمانہ گذر جانے کے بعد یہاں یار سے بھی وہ دل لگاؤ باقی نہ رہا۔

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

فرماتے ہیں خدا کو مان کر میرا دل نہ دکھا۔ میرے نالوں سے حذر کہ میری فریاد نوائے مرغِ گرفتار نہیں ہے جو بے اثر ثابت ہوگی خدا اس میں ضرور اثر کرے گا

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

فرماتے ہیں۔ ارادہ تو یہ ہے کہ فوجِ مژگانِ یار سے مقابلہ کروں اور حالت یہ ہے کہ دل میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ خلشِ خار کی بھی تکلیف برداشت کر سکوں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

فرماتے ہیں کون ایسا ہے جو یار کی اس سادگی پر قربان نہ ہو جائے۔ لڑتے ہیں یعنی اختلاط میں ہاتھا پائی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ہے۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

فرماتے ہیں ہم نے اسدؔ کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے اس سے ملے ہیں باتیں کی ہیں وہ اگر خلق کے بیان کے موافق پورا پورا دیوانہ نہیں تو کامل ہشیار بھی نہیں ہے۔

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں غزل

فرماتے ہیں۔ بخیہ کے قابل کوئی زخم میرے جسم میں نہیں ہے یعنی ایسے بڑے اور گہرے زخم ہیں کہ جن میں ٹانکے نہیں لگائے جا سکتے اسلئے تاگا چشم سوزن میں ہی تار اشک بن گیا ہے۔

ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

فرماتے ہیں جب ذوق تماشا میں ہم نے در و گھر کی دیواروں کو گرانا چاہا تھا اسی خانہ ویرانی کے ذوق نے روزن دیوار کو پانی کے جھاگوں سے بند کر دیا یعنی روئی کی طرح سے کف سیلاب روزن دیوار میں بھر گئے۔

ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگین نام شاہد ہے مرے ہر قطرہ خون تن میں

فرماتے ہیں امانت خانہ ہوں بیداد کاوشہائے مژگان یار کا جو خون کا قطرہ میرے جسم میں ہے وہ ایک نگینہ ہے مہر کا جس پر میرے معشوق کا نام کندہ ہے مطلب ہے کہ میں امانتدار مژگاں یار کی کاوشوں کا ہوں۔ امانت پر جس طرح مہر لگا دی جاتی ہے اسیطرح میرے خون کے قطروں پر کاوش مژگان یار کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

فرماتے ہیں۔ میرے سیہ خانہ کی تاریکی کا حال کون بیان کر سکتا ہے اگر اسکے روزن دیوار میں روئی رکھدی جائے تو یہ معلوم ہو کہ چاند نکل آیا۔

نکوہش مانع بے ربطی شور جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

فرماتے ہیں۔ میرے احباب کی ملامت میرے جوش جنوں کی روکنے والی ثابت ہوئی ہے اور ان کا خندۂ دنداں نما میرے چاک گریباں کا بخیہ بن گیا ہے مطلب یہ ہے دوستوں کے طعنوں نے مجھ کو آوارگی سے روکدیا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہر آئینے میں مثل ذرہ روزن میں

فرماتے ہیں۔ اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے روبرو آئینے کے جوہر اس طرح اڑتے ہیں جسطرح روزن دیوار میں شعاع مہر سے خاک کے ذرّے اڑتے ہیں۔

نجانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

فرماتے ہیں یہ تو میں بتا نہیں سکتا کہ اچھا ہوں یا برا ہوں لیکن صحبت مجھے مخالف آدمیوں کی نصیب ہوتی ہے یعنی اگر پھول ہوں تو بھاڑ میں ہوں اور اگر گھاس پھوس ہوں تو چمن میں ہوں۔

ہزاروں دل دیے جوش جنون عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

فرماتے ہیں جوش جنوں نے ہم کو ہزاروں دل عطا کر دیے ہیں یعنی دیوانگی کی وجہ سے جو خون سیاہ ہو گیا ہے اسکا ہر ایک قطرہ سویدا بن گیا ہے۔ سویدا دل پر ایک سیاہ دھبہ ہوا کرتا ہے۔

اسد زندانی تاثیر الفتہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

فرماتے ہیں۔ اے اسد حسینوں کی تاثیر محبت میرے لیے قید خانہ بن گئی ہے اور مہربانی سے جو معشوقوں نے میری گردن میں باہیں ڈالی ہیں وہ طوق گلو کا کام دے رہی ہیں مطلب یہ ہے کہ میں اسیر محبت ہوں۔

غزل

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں دنیا کے کھانے پینے کے لطف میری نگاہوں میں خاک بھی نہیں ہیں یعنی مجھ کو ان میں خاک مزا نہیں آتا۔ البتہ خون جگر کے پینے میں مزا ملا کرتا تھا تو اب جگر میں خاک بھی نہیں ہے یعنی جگر میں خون باقی نہیں رہا میں نے سب چٹ کر لیا۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب تواں بال و پر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں شاید ایسا ہو کہ خاک ہو جانے کے بعد ہوا باغ تک اڑا لیجائے ورنہ بال و پر میں تو اب تاب و طاقت خاک بھی نہیں۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں یہ کون سا بہشت شمائل تشریف لانے والا ہے کہ جلوۂ گل کے سوا رہگذر میں خاک نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں خاک نہ ہوگی بہشت شمائل کی عنایت سے دنیا میں بھی جلوۂ گل کے علاوہ خاک کا نہ ہونا لطف سے خالی نہیں ہے۔

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ اگر اس کو مجھ پر رحم نہ آیا نہ سہی مجھی کو اپنی حالتِ زار پر رحم آتا کہ میں نالہ کشی سے باز رہتا مگر معلوم ہو گیا کہ میرے نالۂ بے اثر میں خاک اثر نہیں ہے۔

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ خیالِ جلوۂ گل یعنی نشا کے طفیل سے میکش بدمست ہو رہے ہیں ورنہ شرابخانے کی دیوار و در میں خاک نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ زندگی کو پرلطف بنانے والی شے محبت الٰہی ہے ورنہ اس ناپائدار دنیا میں کیا رکھا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ عشق وہ بلائے روزگار ہے جس گھر میں قدم رکھتا ہے اسکو برباد و غارت کردیتا ہے۔ میں عشق کی غارتگری سے شرمندہ ہوں کہ میرے گھر میں سوائے حسرتِ تعمیر کے اور خاک بھی نہیں ہے۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

فرماتے ہیں۔ اے اسد اب ہم صرف اپنے دل بہلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں ہمکو یہ معلوم ہو گیا کہ اظہارِ کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب لوگ خوشگوئی کی قدر کرتے ہیں ورنہ شعر کی خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ظالم اپنے مظلوم عاشق پر ستم کے ساتھ یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ خبردار آنکھ سے آنسو کا قطرہ نہ ٹپکنے پائے اور عاشقِ مظلوم گڑگڑا کر اس سے کہتا ہے میرے سینہ میں تڑپتا ہوا دل ہے سنگ و خشت نہیں ہے کیوں نہ بھرے ہوئے ساغر کی طرح چھلک جاتے ہیں تو ہزار بار اسیطرح روؤں گا۔ کوئی مجھ کو کیوں ستائے کمال غصہ میں بجائے مخاطب کرنے کے کوئی کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہزار ہزار حسن پیدا کر رہا ہے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

یہ شعر لاکھ نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ ہر صاحب ذوق اپنے ذوق طبیعت کے موافق اس سے لطف اُٹھا سکتا ہے۔

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

فرماتے ہیں جب وہ جمال جس سے دل روشن ہے اور مہر نیمروز کی طرح اسکے دیکھنے سے نگاہ قاصر ہے تو پردہ میں پوشیدہ کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ پردے میں نہاں نہیں ہے بلکہ آشکار ہے مگر پھر کوئی اسکو دیکھ بھی نہیں سکتا۔

دشنۂ غمزہ جانستاں ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

فرماتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ دشنۂ غمزہ جانستان ہے اور ناوک ناز بے پناہ ہے تیرے روبرو کسی کا آنا ہی بہتر نہیں ہے یعنی جو شخص آئیگا وہ مارا جائیگا اب اگر آئینہ تیرے سامنے آیا اور آئینے میں تیرا عکس دشنہ و ناوک لئے ہوئے تیرے مقابل ہو گیا تو بتا تیرا کیا حال ہوگا۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرماتے ہیں جس طرح قید حیات ایذا دینے والی ہے اسی طرح بند غم تکلیف دہ ہے اُن دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے غم سے نجات پائے۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ حسن دلکش اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حسن کی دلفریبی کا یقین بھی کامل ہے ان دونوں باتوں سے بوالہوس کی شرم رہ گئی اسکو اپنی ذات پر اعتماد کلی حاصل ہے کہ جو مجھے دیکھیگا بغیر عاشق ہوئے نہ رہیگا پھر کیوں غیر کا امتحان کرے

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

فرماتے ہیں یہاں تو یہ پاس وضع ہے کہ ہم رستہ میں اس سے ملتے ہوئے شرماتے ہیں اور

واں وہ غرور عز و ناز ہے کہ اپنی بزم میں ہم کو بلاتے ہوئے اسکو ننگ آتا ہے۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

ناصح نے جو حق کی بزبان معشوق کی بے دینی اور بیوفائی بیان کی ہے اس کے جواب میں میرزا صاحب تخصیصہ کے لہجہ میں فرماتے ہیں ہاں وہ خدا پرست نہیں ہے جاؤ وہ بیوفا ہی سہی جس کو دین و دل پیارا ہے وہ اسکی گلی میں کیوں جانے لگا۔ اے ناصح شفیق آپ وہاں جانے کی تکلیف نہ فرمایئے گا اور ہم تو اسکو چھوڑ سکتے نہیں ورنہ اس کی گلی میں جانے سے باز رہ سکتے ہیں۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

میرزا صاحب اپنی وفات کے بعد اپنے دوستوں کو رنجیدہ و ملول پاکر تلقین صبر ان لفظوں میں فرماتے ہیں کہ غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کونسے کام بند ہو گئے جن کی وجہ سے تم زار زار روتے اور ہائے ہائے کرتے ہو۔

غزل

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ میں نے جو یہ دریافت کیا کہ بوسہ کیونکر لیا جاتا ہے تو تو نے منہ بند کلی کو انگلی کے اشارہ سے دکھادیا کہ دیکھو بوسہ لینے کی یہ صورت ہوا کرتی ہے میں خاک نہیں سمجھا میرے پاس آکر اور میرا بوسہ لیکر مجھ کو بتا کہ دیکھو یوں لیتے ہیں۔

پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

فرماتے ہیں۔ دل چھین لینے کے طریقہ کو اس سے کیا دریافت کیا جائے اسکی تو ہر ادا سے یہ اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ دیکھو دل یوں چھین لیا جاتا ہے۔

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

فرماتے ہیں یہ تو ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ شوخ ہمارے گھر میں قدم رنجہ کرے لیکن خدا نہ کرے کہ وہ یوں آئے یعنی شراب پی کر اور غیر کو ساتھ لیکر نہ آئے۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

فرماتے ہیں میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ رات کو غیر سے کیا بنی اس کے جواب میں اس نے یہ کہا کہ میرے سامنے آ بیٹھا اور اس ادا سے یہ ظاہر کر دیا کہ دیکھنا یوں بیٹھی میں اس کے سامنے اس طرح دُور بیٹھا رہا۔

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اُس کی تو خامُشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

فرماتے ہیں اس کے روبرو بزم میں کیونکر خاموش نہ بیٹھا جائے اسکی تو خاموشی میں بھی یہی مدعا نکلتا ہے کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف وہ شخص کہ جسکے ستم میں ظرافت ہو۔ فرماتے ہیں میں نے اس سے کہا تھا کہ بزم ناز غیر سے خالی ہونی چاہیے یہ بات سنکر اُس ستم ظریف نے مجھ کو اپنی بزم سے اُٹھا دیا کہ یوں خالی ہونی چاہیے یعنی ہماری بزم میں ایک تو ہی غیر تھا۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

فرماتے ہیں مجھ سے یار نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہوش و حواس کس طرح سے جاتے ہیں میری بیخودی کو دیکھکر ہوا چلنے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دیکھ لے ہوش یوں اُڑ جاتے ہیں۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئنہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

فرماتے ہیں مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد نہ تھی نقش پا نے مجھے سکھا دیا کہ دیکھ اس طرح خاک میں ملکر اور جلوہ یار سے حیرت زدہ ہو کر معشوق کے کوچہ میں رہا کرتے ہیں۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

فرماتے ہیں اگر تیرے دل میں یہ خیال ہو کہ وصل سے کامیاب ہو کر شوق کیونکر زوال پذیر ہوتا ہے اور عاشق و معشوق میں اتحاد کامل کس طرح ہوتا ہے تو موج محیط آب کو دیکھ لے وہ بتا رہی ہے کہ یوں دست و پا مارتے مارتے انجام کار اتحاد پیدا ہو جاتا ہے جس سے اطمینان و سکون کی شکل نکل آتی ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ریختہ اُردو میں شعر کہنے کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ جو شخص یہ پوچھے کہ ریختہ کیونکر رشک فارسی ہوا کرتا ہے تو غالب کے اشعار ایک بار پڑھ کر اسے سُنا کہ یوں ہوتا ہے۔

* * *

(ردیف ہ)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

محض خیالی مضمون نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت واقعی کو نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے فی الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور دنیا کے حالات سے واقف اور لوگوں کی ترقی تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا لیکن جسقدر اسکا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسیقدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد و رشک کیا جائے بلکہ انکی محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس سے انصاف اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ چشمِ تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسیطرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے (از یادگار غالب)

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی　　بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

بقدر حسرت دل کے برابر ذوق گناہ بھی ہونا چاہیے میں اپنے دامن کا ایک گوشہ تر کروں اگر سات دریاؤں کا پانی مجھ کو مل جائے آبِ ہفت دریا سے کثرت معاصی کا استعارہ ہے۔

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز ہو جائے　　کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

فرماتے ہیں۔ اگر وہ سرو قد اپنے خرام ناز کیساتھ گلزار کی سیر کو آجائے تو ایک ایک مشتِ خاکِ گلشن کی قمری بنکر اسکے عشق میں نالے کرنے لگے۔ قمری کا رنگ خاکستری ہوا کرتا ہے۔

غزل　کعبے میں جارہا تو نہ دو طعنہ۔ کیا کہیں　　بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

فرماتے ہیں۔ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کعبے میں جا رہا تو مجھ کو طعنے کیوں دیتے ہو۔ میں بتکدہ کی صحبتوں کو بھولنے والا آدمی نہیں ہوں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

فرماتے ہیں بہشت میں جو شہد اور شربت کی نہریں ہیں ان کے لالچ سے اگر عبادت الٰہی کی تو کیا کی بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہئے۔ جب بے غرض عبادت کا مزہ ہے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

فرماتے ہیں میں راہ و رسم ثواب سے برگشتہ کیوں نہ رہوں۔ کاتب تقدیر نے جس قلم سے میری سرنوشت لکھی ہے اس پر قط ٹیڑھا لگا تھا۔ یہ وجہ ہے میری رسم ثواب سے برگشتہ ہونے کی۔

غالب کچھ اپنی سعی سے ملتا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

فرماتے ہیں اے غالب اپنی کوشش سے فائدہ اٹھانا میری تقدیر میں نہیں لکھا۔ اگر ٹڈیاں میری کھیتی کو نہ کھالیں تو اناج کے خرمن میں آگ لگ جائے۔

غزل
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ تم سے اس بات کی فرمائش کی جائے کہ ہمارے ساتھ تم محبت کا برتاؤ کرو۔ ہاں یہ کہتے ہیں ہمارے ساتھ عداوت بھی کی جائے تو اس میں بھی غیر کی شرکت نہ ہو۔ مطلب ہے کہ دوستی اور دشمنی ان دونوں باتوں میں سے ہمارے ساتھ وہ کرو جو دشمن کے ساتھ نہ کی جائے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں ضعف نے مجھے ایسا سکھا دیا ہے۔ کہ میرے جسم میں خون باقی نہ رہا اور خون باقی نہ رہنے سے رنگ اختلاط بھی مٹ گیا۔ اب میرے دل پہ نقش محبت بھی بار ہے۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ!
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ مجھ کو تم سے غیر کے ذکر کرنے کی شکایت ہے۔ باوجودیکہ تم نے اسکا ذکر شکایت

آمیز لفظوں میں کہتا ہے۔ مجھ سے اسکی شکایت بھی نہ کیا کرو۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہو تو عشق کا بیمار اچھا ہی کیوں نہ ہو جایا کرے۔

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں شکر ہے میرا معاملہ میری بیکسی نے کسی غیر سے نہ ڈالا یعنی کسی غیر شخص کا احسان مجھ پر نہ ہوا اگر لوگوں سے مجھ کو کچھ نفع بھی پہنچتا تو شرمندگی ضرور اٹھانی پڑتی۔ اب اگر شرمندہ بھی ہوں تو اپنی ہی ذات سے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ تنہائی اور خلوت میں بھی تو خیالات اور تصورات کی ہنگامہ آرائی رہتی ہے وہ کیا انجمن سے کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیہ نفس نہایت دشوار کام ہے اور خطرات قلب پر قابو پانا اس سے بھی دشوار تر۔ یہ شعر تصوف میں ہے۔

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ کسی شخص سے کچھ حاصل کرنا یعنی اسکا احسان لینا انفعال کا سبب ہے۔ اور شرمندگی حاصل کرنی کم ہمتی کا کام ہے۔ یہاں تک کہ زمانے سے عبرت بھی حاصل نہ کرنی چاہیے

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں۔ وارستگی اور آزادی اسکو نہیں کہتے کہ لوگوں سے وحشت اور بیگانگی کا برتاؤ کیا جائے۔ اور یہ خیال موجب فخر و ناز ہو کہ ہم دنیا سے آزاد ہو گئے ہیں۔ بلکہ بیگانگی و وحشت اپنے نفس سے کی جائے اس کا نام آزادی ہے۔

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں وقت کے ضائع ہونے اور گذرنے کا غم ایسا ہے کہ جسکا نعم البدل ممکن ہی نہیں

عمر عزیز اگر صرف عبادت بھی ہو تو بھی اسکا غم کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عبادت سے بڑھ کر اور کوئی اچھا کام کیا جاتا تو ممکن ہے کہ زیادہ موثر اور سود مند ہوتا۔

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ   اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

فرماتے ہیں اے اسدؔ ہم تو اب اس فتنہ گر کے در سے اٹھتے نہیں۔ بلا سے ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ گذر جائے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ روز قیامت میں سب اٹھینگے مگر ہم جب بھی نہیں اٹھینگے۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو   مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو   غزل

فرماتے ہیں۔ مجھے گرفتار رنج و محن اور سرگرم نالہ و فریاد دیکھ کر میرے وہ دوست جو زمانے کی گردشوں سے محفوظ اور دنیا کے رنج و آلام سے بچے ہوئے ہیں۔ کیوں نفرت ظاہر کرتے ہیں میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے   نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

فرماتے ہیں۔ یہ تو میں نے مانا کہ میرا سا جوش عشق اور نالۂ دلگداز میرے دشمن کو نہیں ملا ہے لیکن یہ رشک کیا کم ہے کہ میری طرح وہ بھی آرزوئے دوست رکھتا ہے۔ یا رب العالمین یہ آرزو دشمن کو نہ دی جاتی تو بہتر تھا۔

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر   کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو

فرماتے ہیں۔ تیری آنکھ سے ان زخموں کا حال سن کر ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ جن زخموں کو میرے دل میں دیکھ کر سوزن غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں   کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

میرزا صاحب نے اس شعر میں یہ شوخی بھر دی ہے کہ اپنے جوش عشق اور وفور شوق کا الزام بے گناہ ہاتھوں پر لگا دیا ہے۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں   نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

فرماتے ہیں: ابھی تک ہم قتل گاہ کا تماشہ کتنا آسان ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ تیری سواری کے گھوڑے کو خون کے دریا میں تیرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم یہ سمجھے ہیں کہ قاتل گروہ عشاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خنجر ناز یا تیغ غمزہ سے شہید کر دیگا۔ نہیں معلوم کہ اس تماشہ کے بعد تو آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹنے لگے کہ خون کا دریا بہہ جائیگا۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بنے کا　　کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

فرماتے ہیں: میری دیوانگی کا رتبہ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے پاؤں کی زنجیر بنائے جانے کا چرچا سن کر فولاد کو جوہر فولاد نے معدن میں بیتاب کر دیا۔ یعنی وہ یہ چاہتا تھا کسی طرح کان سے باہر آ کر اس دیوانہ کی زنجیر بن جاؤں۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے　　سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

فرماتے ہیں: میرے کھیت پر بار بار ابر کا آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ میری زراعت کی پرورش کے لئے آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو تلاش کر رہی ہے اور اس کی جستجو میں دوڑ دوڑ کر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا نامراد شخص ہوں کہ جس کی ساری کوشش بیکار ثابت ہوتی ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے　　مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانہ میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے۔ اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے (از یادگار غالب)

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو　　جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

فرماتے ہیں: میری قسمت میں مرتبہ شہادت مقدر ہو گیا تھا اسی واسطے مجھ کو یہ عادت عطا ہوئی تھی کہ جہاں میں تلوار کو دیکھتا تھا گردن جھکا دیتا تھا۔ گویا تلوار میری آنکھوں میں [illegible] دیتی تھی۔ نہایت بلیغ اور پر لطف شعر ہے۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اس شعر کا یہ مطلب ہے کہ انسان دنیا میں آرام اسی صورت میں پا سکتا ہے جب تعلقات دنیوی کو دل سے شا دے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے   جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

فرماتے ہیں جگر کاوی کے ساتھ شعر کو موزوں کرنا معدن کو کھود کر جواہر نکالنے سے بدرجہا بہتر ہے

مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب   فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

میرزا صاحب کا مدعا شاہ سلیمان جاہ کہنے سے یہ ہے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور نہایت دیندار یہ سب بادشاہ جن کا مصرعہ ثانی میں ذکر کیا ہے کافر تھے۔ وجہ فوقیت ثابت ہے۔

غزل

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو   رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

پانو دھو کر پینا۔ اظہار جوش محبت کا استعارہ ہے باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو   ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

میرزا صاحب کے زمانہ میں بیوقوف آدمی کو بنانے کا موقع پہ کہا کرتے تھے کہ اس کے پانو پڑے اب ایسے موقع پہ کہتے ہیں۔ ان کا بایاں پانو پوجئے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے بیوقوفی سے ایک عیار کے دم میں آ کر جو پیرزن کا بھیس بدل کر آیا تھا جان دیدی۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ   ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مطلب ہے کہ تقدیر الہی کے خلاف کوشش بیکار ثابت ہوا کرتی ہے اور اکثر اس کا نتیجہ برعکس ظاہر ہوتا ہے۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور   تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

مطلب یہ ہے جستجو سے جو ہر مراد ہمیشہ نہیں ملا کرتا کبھی مل جاتا ہے۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ   ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

فرماتے ہیں شوق صحرا نوردی مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہے۔ زندگی میں دنیا کے جنگلوں میں پھرتا تھا موت کے بعد میدان عدم طے کر رہا ہوں۔ بالکل اچھوتا خیال ہے۔

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف   اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

میرزا صاحب نے اس شعر میں عجیب نزاکتِ معنی سے کام لیا ہے۔ مطلب یہ ہے اس بہار کے ساتھ چمن میں بہار آئی ہے کہ جو پرندے باغ پر اڑتے ہوئے گذرتے ہیں وہ تماشائے گل و لالہ دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں اور آگے جانے کا ارادہ فسخ کر کے وہیں اتر پڑتے ہیں۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں   دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

فرماتے ہیں۔ آج اس بتِ نازک بدن کے پانو دکھتے ہیں۔ شاید کہیں گیا ہوگا۔ جانے کے خیال کے ساتھ رشک نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ اس کا بیداری میں جانا بیان کیا جائے اسلئے یہ بات بنائی گئی کہ شاید وہ خواب میں کسی کے ہاں گیا ہوگا۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو   پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

خسروِ شیریں سخن کا اشارہ بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر آخر بادشاہ دہلی کی طرف ہے۔ باقی ظاہر ہے

قطعہ   واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار   یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

جوشِ محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ معشوق کو کوئی تکلیف یا بیماری پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق اپنی آہ و دعا یا جذبۂ دل کے اثر سے اس کا ہونا سمجھا کرتا ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ   آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

فرماتے ہیں جب تک دیدۂ شکار کا آئینہ روبرو نہ ہو وہ ستم آرا اپنا منہ نہیں دیکھتا ہے۔

غزل   واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو   صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ کوچۂ یار میں پہنچ کر جو ہم کو پیہم غش آتا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ ہماری ناتوانی اور کمزوری میں یہاں تک پاؤں نے پہنچا دیا۔ اس احسان کا ہم یہ بدلا کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قدم چومنے کے ارادہ سے اس زمین پر گر پڑتے ہیں جس پر ہمارا نقشِ قدم ہوتا ہے۔

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے   کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ دل کو میں محو وفا رکھتا ہوں اور مجھ کو دل محو وفا رکھتا ہے آپس میں ہم دونوں

ایک دوسرے کو گرفتار وفا رکھنا چاہتے ہیں۔

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن   تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ چیونٹی کا نقشِ قدم ہم سے کمزور آدمی کے واسطے طوقِ گردن کا حکم رکھتا ہے اتنے بھاری بوجھ کو لے کر ہم کیونکر تیرے کوچے سے بھاگ سکتے ہیں۔

جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو   یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ جان کر یعنی سمجھ کر ارادہ کے ساتھ مجھ سے چشم پوشی کیجئے تو مجھ کو رحم آجانے کی امید بندھ جائے لیکن ایسی ناآشنا نظر سے دیکھ لینا تو میرے لئے زہر سے کم نہیں ہے۔

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں   نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ ایک تو ہم نوائی کا رشک دوسرے دردِ فریاد کا اثر ان دونوں باتوں نے نالۂ مرغِ سحری کو میرے واسطے دو دھار کی تلوار بنا دیا ہے۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا   ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور تیرا سر کاٹیں گے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا سر کاٹنے کی ہم کو قسم ہے۔ ہم تیرا سر ہرگز نہ کاٹیں گے۔ محاورہ میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ یعنی آج ہم کو پانی پینے کی قسم ہے۔ آج ہم پانی نہ پئیں گے۔

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار   پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ دل کے خون کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے صرف اس مجبوری سے دل کو خون کرتے ہیں کہ بغیر اشکِ خونی کے آنکھیں ذرا بے رونق سی معلوم ہوتی ہیں۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو   ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ تم اسقدر نازک ہو کہ فغاں ترک کر دینے کے بعد ہماری خاموشی کو بھی فغاں کہتے ہو۔ اور ہم اتنے کمزور ہیں کہ ستم موقوف کر کے تم نے تغافل اختیار کیا تو ہمارے حق میں اس نے بھی ستم کا کام دیا۔

قطعہ　لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی　　ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ لکھنؤ آنے کا کچھ سبب ہم پر ظاہر نہیں ہوا یعنی سیر و تماشہ کی غرض سے انسان سفر کیا کرتا ہے تو دونوں باتیں نہیں ہیں۔

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شعر　　عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

فرماتے ہیں۔ یہ شعر سلسلۂ شوق کا مقطع نہیں ہے یعنی اس کا ختم کرنے والا نہیں ہے سیرِ نجف اور طوفِ حرم کا ارادہ ہم کو ہے۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب　　جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

میرزا صاحب بغرض استغاثۂ پنشن کلکتہ جاتے ہوئے چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں ٹھہرے تھے اس مقطع میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

غزل　تم جانو تم کو غیر سے جو راہ و رسم ہو　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

فرماتے ہیں۔ غیر کی رسم و راہ کے ساتھ اگر مجھ سے بھی ربط و ضبط رہے تو یہ کچھ بری بات نہیں ہے ترکِ ملاقات سے کیا فائدہ ہوگا۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے　　قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

فرماتے ہیں۔ تم کسی طرح مواخذۂ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ یہ میں نے مانا کہ میرا قاتل رقیب ہے یعنی اس کی طبعِ رشک نے مجھ کو قتل کیا ہے۔ لیکن گواہی میں تم بھی ضرور پیش ہوگے۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و ناحق شناس ہیں　　مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

فرماتے ہیں۔ کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بیگناہ و قتل کرنے والے اور حق نہ پہچاننے والے ہیں یہ تو میں نے مانا کہ تم بشر نہیں ہو۔ خورشید جمال اور ماہ پیکر ہو۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار　　مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

فرماتے ہیں۔ اس کی نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا ہے مجھے اس کو دیکھ کر یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی مشتاقِ جمال کی نگاہ تو داخلِ نقاب نہیں ہو گئی ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر کا مصرعِ اولیٰ

بے شک نکلا ہے۔ ثبوت دعویٰ کے واسطے اس سے بہتر خیال کا بہم پہنچنا ممکن نہیں۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید   مسجد ہو۔ مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں ازراہ تہذیب اسکا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے۔ مطلب ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا۔ اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کے کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنے میں مقتضائے بلاغت ہے (از یادگار غالب)

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست   لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

فرماتے ہیں بہشت کی جو کچھ تعریف ہم سنتے ہیں وہ سب بجا و درست ہے۔ ہم کو اس کی اور خوبیوں سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے لیکن خدا ایسا کرے کہ وہ تیری جلوہ گاہ قرار پا جائے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں   دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

فرماتے ہیں۔ غالب کا سا باکمال شاعر اگر دربار میں نہ ہو تو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا لیکن یارب دنیا ہو اور اس میں میرا ممدوح بادشاہ زندہ سلامت رہے۔

غزل

کی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو   کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ وہ زمانہ گذر گیا کہ جب ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ ان سے اظہار کی تمنا کی لیکن کیونکر اتفاق جاہے۔ خوش نصیبی سے جب ایسا موقع مل گیا کہ بہت سی فکر کے بعد جو ایک تجویز ہم نے سوچی تھی اس کے موافق ہم نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور انہوں نے وہ سب سنی مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اب کیونکر ہمارا کام بنے۔ مطلب یہ ہے ہم نے سب کچھ کہا مگر ان پر اثر خاک بھی نہ ہوا اور ہمارے کہنے کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا اب کیا کریں مجبور ہیں۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال   کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ہمارے نزدیک اسی کا نام وصال ہے کہ پہروں بیٹھے ہوئے یہ سوچا کرتے ہیں۔ کہ اگر وصل یار خدانخواستہ نصیب نہ ہوا تو ہم کیا کرینگے۔ کہاں جائینگے اور اگر ہوگا تو کیونکر ہوگا اس کے لئے کیا سامان ہونے چاہئیں۔ کس قسم کی کوشش کی جائے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے   حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

فرماتے ہیں۔ ارمان۔ شوق۔ تمنا ہم کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی مراد دلی حاصل کریں۔ مگر ادب روکتا ہے اور ان دونوں فریقوں میں باہم کشمکش پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کی حیا ان کو صاف جواب نہیں دینے دیتی ان کی طرف سے گومگو میں بات جا پڑتی ہے اب کامیابی حاصل ہو تو کیونکر ہو۔

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا   بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں۔ تم ہم کو یہ بات بتا دو کہ صنم پرستوں کا گزارا یعنی ان کا حصول مدعا کس طریقہ سے حاصل ہو اگر سارے جہان کے معشوقوں کی ایسی ہی عادت ہوجائے کہ جیسی تمہاری ہے کسی بات کو مانتے ہی نہیں۔ ہر سوال پر انکار کردیتے ہو۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ   جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا ہی اپنی مانند گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت بپا کرو۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا   وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے (از یادگار غالب)

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر   ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں ہم کو ان سے کسی بھلائی کی امید کیونکر ہو اور ان کو ہم جیسے جانباز عاشق کی قدر ہو تو کیونکر ہو جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں اور ہم سے اپنے دل کا کوئی مدعا بھی نہ کہیں اور ہماری

کا موقع بھی نہ دیں۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا   نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ ہمارا یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائے گی ہمیشہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ معشوق کی تحریر سے عاشق کی بیتابی کم ہو جایا کرتی ہے مگر یہاں بدنصیبی سے دیدۂ دیدار طلب نے دل مضطر سے بھی زیادہ پاؤں پھیلائے وہ کمبخت کسی طرح اسکے خط سے بہلتا ہی نہیں اور یہی ضد کئے جاتا ہے کہ میں تو اس کا دیدار ہی دیکھونگا۔ اب تسلی ہو تو کیونکر ہو۔

بتاؤ اس کی مژہ دیکھ کر کہ مجھ کو قرار   یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں۔ اے حضرت ناصح آپ کا یہ ارشاد کہ تو بیتاب نہ ہو اور صبر کر میرے سر آنکھوں مگر ذرا اس ظالم کی پلکوں کو دیکھ کر فرمائے کہ ایسے نشتر جب دل میں چبھے ہوئے ہوں تو صبر قرار کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور   فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

فرماتے ہیں اے غالب میں کچھ دیوانہ تو نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ بیقرار اور پریشان رہوں۔ بقول حضور کے (حضور سے مراد ظل سبحانی بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر بادشاہ آخر دہلی ہیں۔ یہ مصرعہ غالباً ان کا ہے) فراق یار میں تسکین کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تسکین ہو تو کیونکر ہو۔

غزل

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو   نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ کسی پر عاشق ہو کر فریاد و فغاں کرتے رہنا منافی شان عشق ہے۔ عاشق کو خاموش رہنا چاہئے۔ گویا پردہ داری عشق شان عاشقی ہے۔ جب دل سینہ میں نہ ہو اور وہ کسی کو دیدیا جائے تو لازم ہے کہ زبان بھی منہ میں نہ ہو۔ اسکو بھی کاٹ کر پھینکدینا چاہئے یا کیل دینا مناسب ہے کیا خوب مطلع فرمایا ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں   سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اس شعر کا مضمون نثر کے فقروں میں بھی اس برجستگی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا جس طرح میرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں ادا کیا ہے۔ قادر الکلامی کی حد ہو گئی۔ فرماتے ہیں وہ اپنے ڈھنگ

کی عادت نہ چھوڑیں گے۔ ہم اپنی خودداری کی وضع کیوں ترک کریں۔ بھلا ہم ان سے کیا پوچھیں کہ تم ہم سے آزردہ کیوں ہو۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ رازِ عشق ہم نے تو چھپا لیا تھا۔ مگر ہمارے غمخوار کی بیتابیوں نے اسکو ظاہر کر دیا اس محبت کو آگ لگے جس کی وجہ سے ہمارا غمخوار ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ جو رنج و غم کی تاب نہ لا سکے وہ کمبخت ہمارا رازداں ہی کیوں بنے۔ ادائے مطلب میں بلاغت ختم ہو گئی ہے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ وفاداری کیسی اور عشق و محبت کیا جب سر پھوڑ کر مر جانے ہی کی ٹھان لی تو پھر مذکورہ بالا دونوں باتوں کا پاس اور خیال کیا اور جب سر پھوڑ کر مر جانے کی تجویز دل میں قرار پا ہی چکی۔ تو پھر اے سنگدل تیرے سنگ آستاں کی کیا احتیاج ہے۔ یہ نہیں اور کسی پتھر سے سر پھوڑ لیں گے۔ جواہر کے ٹکڑے ہیں الفاظ نہیں ہیں۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ اے ہمدم یعنی اے عصفیر تو آج ہی گرفتار ہو کر چمن سے آیا ہے اور میں بہت دنوں سے اسیرِ قفس ہوں۔ تو مجھے یہ تو بتا دے کہ چمن کی کیا حالت ہے اور تو اس کے بیان کرنے میں جھجکتا کیوں ہے۔ صاف صاف کہہ۔ روداد چمن بیان کر دے۔ کل جس آشیانہ پر بجلی گری ہے وہ شاید میرا آشیانہ ہو۔ تو اس کے بیان کرنے میں پس و پیش نہ کر۔ ایسا بلیغ شعر اور پھر اس زمین میں میرزا کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو تم کہہ نہیں سکتے کہ ہم دل میں نہیں ہیں۔ مگر ہم کو یہ بتا دو کہ جب دل میں تم ہی تم ہو اور کوئی دوسرا نہیں ہے تو پھر آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو جس طرح دل میں رہتے ہو۔ اسی طرح آنکھوں کے سامنے بھی رہا کرو۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ تم جو مجھ سے میرے جذبہ دل کی شکایت کرتے ہو کہ یہ ہم کو اپنی طرف کھینچتا ہے غلط ہے۔ خیال کرکے دیکھو اس میں قصور کس کا ہے۔ یعنی میرا یا تمہارا اگر تم مجھ سے نہ کھنچو تو آپس میں کشاکش کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے کھنچتے ہو۔ میرا جذبِ دل تم کو کھینچتا ہے۔ باہم کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

فرماتے ہیں۔ یہ فتنہ یعنی تمہارا دوست ہونا خانہ ویرانی کے لیے کافی ہے۔ تم جس کے دوست ہو آسمان اس شخص کا دشمن کیوں ہو یعنی تمہاری دوستی اس کے برباد کر دینے کے لئے ہر پہلو سے کافی ہے آسمان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ بھی دشمنوں میں اپنا نام لکھوائے۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کسکو کہتے ہیں عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

فرماتے ہیں جب تم ہمیشہ کے واسطے دشمن کے ہو گئے اور اسکے عمر بھر نباہ دینے کا وعدہ کر چکے تو پھر میرے عشق و محبت اور وفا و مروت کا امتحان کیوں لیتے ہو تم میری آزمائش تو نہیں کرتے بلکہ ظلم کرتے ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

فرماتے ہیں تم نے جو یہ کہا کہ غیر سے ملتے ہیں۔ یہ بدنامی و رسوائی کیوں ہو کیا وجہ ہے بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر دوبارہ تو کہو کہ ہاں رسوائی کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رسوائی تو ضرور ہوگی تمہاری خاطر سے کہو تو کہہ دوں کہ ہاں غیر سے ملنا رسوائی کا موجب نہیں ہے۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

میرزا صاحب نے یہ ساری غزل مرصع لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کا جواب نہیں ہے اور مقطع سونے پہ سہاگہ کا کام دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں اے غالب تو التجا کے موقع پر طعنے دے کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے اپنے دل میں یہ تو سمجھ کہ وہ تیرے بے مہر کہنے سے تجھ پر مہرباں کیوں ہو۔ خوبی اس مقطع میں رکھی گئی ہے کہ معشوق کی عادت کو بڑی شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مطلب ہے کہ وہ ہمیشہ

کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ کر اس کو نامہربان کہا ہے کہ وہ اپنی قدیم ضد کے موافق مہربان ہو جائے یعنی جو اس سے کہا جاتا ہے وہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

قطعہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں مجھ کو اپنے دوستوں، ہم وطنوں، ہمسایوں، ہمدموں، ہمسخنوں سے اتنے رنج والم پہنچے ہیں کہ اب میں ایسے مقام پر جا کر رہنا چاہتا ہوں کہ جہاں یہ سب ذات شریف نہ ہوں۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں کسی میدان میں لکڑیاں کھڑی کر کے ایک چھپر ڈال لینا چاہیے جو گھر کا بھی کام دے اور اس میں در و دیوار بھی نہ ہوں۔ دروازہ نہ ہوگا تو پاسبان کی کیا احتیاج رہیگی اور دیوار نہ ہوگی تو کوئی ہمسایہ میں آ کر کیونکر رہیگا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی سے میل جول نہ رکھا جائے تو رنج نہ پہنچے گا۔

پڑئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

فرماتے ہیں۔ ایسے غیر آباد مقام پر نصیب دشمناں اگر بیمار پڑ جائے تو ان دشمنوں میں سے کہ جن سے رنج پہنچے ہیں کوئی تیماردار بنکر نہ آئیگا اور اگر خدانخواستہ مر جائے تو ان ظالم دوستوں میں سے جنہوں نے تکلیفیں دی ہیں۔ بزم ماتم میں نوحہ خواں کوئی نہ ہوگا۔

(ردیف ہ ہوز)

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

فرماتے ہیں۔ مہر سے ذرہ تک عالم میں رخ و رخ اور دل و دل آپس میں آئینہ ہیں۔ اس کو اس میں اور اس کو اس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارا عالم متحد بہ وجود واحد ہے اور ایک ذات کو دوسری ذات سے غیریت نہیں ہے۔ یہ اس میں اپنے کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح آئینہ میں کوئی اپنی صورت دیکھے۔ جب یہ حال ہے تو طوطی شش جہت میں سے جس طرف منہ کرے آئینہ اسکے سامنے موجود ہے۔ طوطی کی مثال آئینہ سے استعارتاً لکھی گئی ہے۔ مراد اس

بیان سے وہ صوفی شخص ہے جس کو یہ اتحاد باہمی دکھائی دیتا ہے اور وجد و حال کی حالت میں نعرۂ انا الحق بلند کرتا رہتا ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　　جسکی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں میرے غمکدہ کے در و دیوار ایسے منہدم ہو گئے ہیں۔ جن پر برسات کے موسم میں ہری ہری گھاس اُگ کر سبزہ زار کا سماں دکھاتی ہے۔ جس گھر کی بہار یہ ہو۔ یعنی ایسا اجاڑ ہو گیا ہو اس کی خزاں کا حال نہ پوچھو کہ وہ کس قیامت کی ہو گی۔

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے　　　دشوارئ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

فرماتے ہیں۔ راہ کی دشواریاں اور ہمراہیوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو وہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ مجبور ہو کر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اب بیکسی اور تنہائی کی حسرت اٹھانی چاہیے اور ایسے دشوار گذار راستہ میں اسقدر ظالموں کا ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　　طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

فرماتے ہیں۔ سو جلوہ روبرو ہیں۔ اگر آنکھ اٹھا کر دیکھئے یہ طاقت کہاں ہے کہ دید کا احسان اٹھائے مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت کے گوناگوں تماشے نظر آ رہے ہیں۔ یہ کس میں طاقت ہے کہ ان سب کیفیتوں کو دیکھے اور سمجھے۔ آدمی دیکھتے دیکھتے تھک جاتا ہے اور اس کی قدرت کی نیرنگیاں ختم نہیں ہوتیں۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق　　　یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات تنخواہ کی چٹھی کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ پتھروں پر معاش جنونِ عشق کی تنخواہوں کی چٹھیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ ابھی اور کچھ دن پتھر مارنے والے لڑکوں کا احسان اٹھاتے رہنا چاہیے مطلب یہ ہے کہ جنونِ عشق میں لڑکوں کے ہاتھ سے پتھر کھانے چاہئیں

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم　　　اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

فرماتے ہیں۔ احسان اسقدر بوجھل چیز ہے کہ دیوار میں بھی اس کے اٹھا لینے کی طاقت نہیں ہے وہ بھی مزدور کے بار احسان سے خم ہوگئی ہے۔ اے خانہ خراب دنیا میں کبھی کسی شخص کا احسان نہ اٹھا اور دیوار کو دیکھ کر عبرت حاصل کر کہ ایسی مضبوط چیز بھی اپنے سنگین بار کا اٹھانے کے سبب خم ہوگئی

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

فرماتے ہیں۔ رشک رقیب کے زخم جو میرے دل کے اندر پڑ گئے ہیں اور وہ خندہ زن ہیں یا تو ان زخموں کو رسوا نہ کیجیے اور یا ایسا کیجیے کہ پردہ میں رقیب کے ساتھ چھپ چھپ کر مسکرانا چھوڑ دیجیے۔

غزل مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

شعرا آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محراب مسجد سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اے قبلۂ حاجات یہ اشارہ واعظ یا شیخ یا زاہد کی طرف ہے مسجد کے برابر میخانہ ضرور بنانا چاہیے جس طرح بھوں کے پاس آنکھ اللہ تعالیٰ نے بنا دی۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اِک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

فرماتے ہیں۔ ہم جس طرح آپ پر عاشق ہیں۔ اسی طرح آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہوگئے ہیں اور یہ راز ہم پر کھل گیا ہے آپ نے اپنے عاشقوں پر بہت سے ظلم روا اور ناروا کئے ہیں۔ آخر ان کا بدلہ کچھ تو آپ کو بھی خدا کی طرف سے ملنا چاہیے۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

فرماتے ہیں۔ اے فلک بہت سی حسرتیں تو نے خاک میں ملا دی ہیں۔ اب تو ان حسرتوں کی ہم کو داد ملنی چاہیے۔ میرا دل حسرت پرست بہت مغموم ہوگیا ہے اور کوئی آرزو تو میری بھی پوری کر دے کہ جس سے گذری ہوئی باتوں کی تلافی ہو جائے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

فرماتے ہیں۔ خوبصورت لوگوں کے واسطے ہم نے تصویر کھینچنی سیکھی ہے یوں کہو یہ ہے کہ شاعری سیکھی ہے۔ معشوقوں کی ملاقات کے لئے کوئی ذریعہ ہونا چاہیے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

فرماتے ہیں۔ مے پینے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ نشاط و سرور حاصل کروں بلکہ میں تو رنج وغم فراموش کرنے کی غرض سے شراب پیتا ہوں۔ مجھ کو دن رات اک تھوڑی سی بیخودی درکار ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا   ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

فرماتے ہیں۔ لالہ و گل و نسرین کا رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی لالہ بہت سے رنگوں کا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ہر رنگ کے پھول پر داغ ہوتا ہے۔ گل گلاب کے پھول کو کہتے ہیں۔ اس میں بھی بہت سے رنگ ہیں۔ نسرین بیشتر سفید ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ رنگوں یا صورتوں کے اختلاف سے غرض نہیں ہے۔ ہر رنگ میں بہار کا ثابت ہونا لازمی ہے۔ بہار سے یہاں ظہور ذات باریتعالیٰ کا خیال مقصود ہے۔ شعر تصوف میں ہے اور بہت خوب ہے۔

قطعہ سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی   رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

فرماتے ہیں۔ بیخودی کے وقت سر کو پائے خم پر ہونا لازمی ہے اور مناجات کے وقت منہ کو قبلہ کی طرف ہونا لازمی ہے۔

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

فرماتے ہیں حسب منشا گردش پیمانۂ صفات۔ عارف کو ہمیشہ مے ذات سے مست و سرشار رہنا چاہیے۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو   خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

فرماتے ہیں اصل سے یعنی جڑ سے ٹہنیوں کا بڑھنا اور پھولنا پھلنا ہے اے غالب۔ جو بات انسان کے منہ سے نکلتی ہے وہ خاموشی کے بعد نکلتی ہے پہلے آدمی اس کا مطلب سوچ سمجھ لیتا ہے جب زبان سے کسی بات کو نکالا کرتا ہے۔ اس سارے قطعہ میں اپنی تصوف کے خیالات کو باندھا ہے اور ان شعروں میں یہ تین باتیں بیان کی ہیں پہلی بات یہ ہے کہ تمام عالم اجسام [illegible]

شکل سے منزہ ہے اور اس عالم ظہور سے باہر ہے جس طرح درخت کی شاخیں خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں لیکن سب کی سب جڑ سے پھوٹ کر نکلی ہیں۔ مگر ان کی جڑ پوشیدہ ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ہر بات خاموشی سے نکلی ہے یعنی اس کے معنی اول ذہن میں گذرتے ہیں۔ بعد ازاں اس سے بات پیدا ہوتی ہے اور خود معنی پوشیدہ ہیں۔ تیسری مثال یہ ہے کہ چمن میں بہت سے رنگوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر رنگ کے پھولوں سے بہار کا وجود ثابت ہے اور خود آنکھوں سے نہاں ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رنگ برنگ کے پھولوں سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ہر رنگ میں انسان اپنے مبدع کو ثابت کرتا ہے۔ کبھی نشے میں سرشار ہے کبھی زاہد شب بیدار ہے اسکا یہ مطلب ہے کہ دنیا کے یہ سارے رنگ ذات کی صفات ہیں، اور یہ ساری صفتیں اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہو کر وجود ذات کی شہادت دیتی ہیں۔

ل بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ بساطِ عجز میں ایک دل تھا اور وہ بھی صرف ایک خون کا قطرہ تھا اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ مگر ٹپکنے کے انداز سے وہ کمبخت بھی سرنگوں رہتا ہے۔ خبر نہیں کس وقت ٹپک جائے انسان کے پہلو میں دل ایک رودے کے ذریعہ سے لٹک رہا ہے اور اس کی وہی صورت ہے جو ٹپکتے وقت قطرۂ خون کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے عشق کا سرمایہ جو کچھ تھا وہ ایک دل تھا۔ اب رنج و غم سہتے سہتے اس کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے کہ خون کے قطرہ کی طرح ہر وقت ٹپک جانے پر آمادہ رہتا ہے۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ اس شوخ سے تھوڑے دن تک بناوٹ اور تصنع سے آزردہ خاطر رہے۔ لحاظ و پاس کہ وہ بھی ایک انداز جنون تھا۔ پہلے مصرعہ میں تکلف کے معنی بناوٹ کے ہیں اور دوسرے مصرعہ میں شرم و لحاظ کے۔

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

فرماتے ہیں۔ ہمارا آزردہ دل مرجانے کے خیال سے بھی کچھ خوش نہیں ہوتا ہماری تمنا

اس شعر میں دو معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی محفل ناز میں عجب حسن سے بات کرتے ہوئے میرے لبوں کو حجاب اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اس مطلب کو میرزا صاحب نے یوں فرمایا ہے کہ سخن خوشامد طلب ہو گیا ہے اس لئے ہمارے ہونٹوں سے بار بار روٹھ کر یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی خوشامد کریں۔ ایسے خوشامد طلبوں سے ہم تنگ آگئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ معشوقوں کو خوشامد طلب کہا گیا ہے اور ان کی جا و بیجا خوشامد کرنے کی وجہ سے سخن ہمارے لبوں سے بیزار ہو گیا ہے۔

غزل

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

فرماتے ہیں صہبا تو باعث دل بستگی ہے اسکو پریشان کرنا زیبا نہیں ہے اور دورِ قدح وجہ پریشانی ہے یعنی تھوڑی تھوڑی شراب نکال کر جو لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے یہ بظاہر شراب کے پراگندہ و پریشان ہونیکا سبب ہے ایک بار شراب کے مٹکے کو میرے منہ سے لگادو کہ میں ڈگڈگا کر سارا مٹکا پی جاؤں۔ اس صورت میں شراب ایک ہی جگہ رہے گی جگہ جگہ نہ پھیلے گی۔ اپنے مطلب کی بات کس خوبی سے اور دلیل کے ساتھ بیان کرنی لطف سے خالی نہیں۔

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

فرماتے ہیں۔ اے حضرت زاہد یہ رندوں کی بھیڑ جو در میخانہ پر جمع ہو گئی ہے یہ لوگ بہت گستاخ اور حاضر جواب ہیں۔ خبردار آپ ان لوگوں کے منہ نہ لگئے یعنی ان بیباک شہدوں کے سامنے شراب کی مذمت کا بیان نہ فرمائیگا۔

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ میری جان میرے لبوں کی قدیم آشنا تھی اور دل سے بہت ہی محبت رکھتی تھی ہمیشہ ہونٹوں پر رہا کرتی تھی لیکن وفا کے ظلم دیکھ کر اس نے بیوفائی اختیار کی اور ہمیشہ کے لئے ان دوستوں یعنی لبوں سے رخصت ہو گئی۔

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہمارے معشوق نے یہ وضع اختیار کر لی ہے کہ اگر کوئی اس کے سامنے ہمارا ذکر چھیڑ دیتا ہے تو وہ اس کو منع نہیں کرتا کہ تو میرے سامنے یہ ذکر نہ کر۔ چونکہ منع کرنے میں ایک قسم کی بے مروتی پائی جاتی ہے۔ اس لئے وہ اس بات سے گریز کرتا ہے اور خود بھی ہمارا ذکر کبھی کسی کے سامنے نہیں کرتا اور ان دونوں باتوں سے اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم کو اس سے شکایت کرنے کا بھی موقع نہ ملے۔

غالب ترا احوال سُنا دینگے ہم ان کو
وہ سُن کے بلالیں یہ اجارہ نہیں کرتے

کیا خوب مقطع فرمایا ہے اور الفاظ نے کسقدر بلاغت کے پہلو اختیار کر لئے ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی مطلب یہ ہے کہ اے غالب تیرا حال کسی خاص موقع پر اپنی جان پر کھیل کر ہم ان کو سنا تو دینگے یعنی آمدہ سخن یا کوئی بات کا پہلو نکال کر تیرا ذکر ان کے گوش گذار کر دینگے لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتے کہ وہ تیری محبت یا مصیبتوں کا حال سن کر تجھ کو اپنی بزم ناز میں باریابی کی اجازت بھی فرما دیں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ غم عشق نے ہم کو برباد کر دیا لیکن حسرت تعمیر کو وہ بھی غارت نہ کر سکا اور یہی حسرت تعمیر ہمارے گھر کی سب سے بڑی پونجی تھی۔ اس کے سوا ہمارے جھونپڑے میں کچھ تھا ہی نہیں کہ جسکو غم عشق برباد کرتا۔

غزل

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اسکے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں (از یادگار غالب)

کھلیگا کسطرح مضمون مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانیکی

فرماتے ہیں دو صورتوں سے میرے خط کا مضمون اس پر ظاہر ہو سکتا تھا ایک اسطرح کہ

دو میرے خط کو کھول کر پڑھتا تو اس کے مطالب سے آگاہ اور خبردار ہو جاتا۔ اس بات کی تو اس کافر سے امید ہی نہیں وہ کیوں میرا خط کھولے اور پڑھے۔ دوسری یہ صورت تھی کہ میرے خط کو مفت میں آکر جلا دیتا اور اسوقت میرے سوزِ عشق اور آتشِ فراق سے آگاہ ہو جاتا مگر اس نے کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہے یہ بھی امید قطع ہو گئی۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

فرماتے ہیں۔ کہ جامۂ حریر میں شعلۂ آتش کو لپیٹ کر باندھ لینا جو ناممکن ہے ممکن سمجھا جاتا ہے۔ بہ نسبت اسکے کہ دل میں سوزِ غم کو پوشیدہ رکھا جائے مطلب یہ ہے کہ دل عاشق پرنیاں سے بھی زیادہ نازک ہے اور سوزِ غمِ عشق شعلۂ آتش سے بھی زیادہ سرکش ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

فرماتے ہیں۔ ان کو اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا منظور تھا۔ اس کا اظہار غیروں کے روبرو صاف صاف تو وہ نہ کر سکے۔ یہ کہدیا کہ ذرا باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ گل و لالہ کا تماشہ دیکھینگے۔ اس حیلے سے اپنے زخمیوں کو دیکھ تو لیا مگر گل و لالہ کی سیر اور زخمیوں کا دیکھنا مساوی درجے میں ان کے خیال کے موافق ثابت ہوا اور یہی بہانہ کی شوخی تھی۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

فرماتے ہیں۔ یہ ہماری سادگی یعنی ہماری حماقت تھی کہ تیرے التفاتِ ناز پر فریفتہ ہو گئے ہمارے گھر میں تیرا آنا آنا نہ تھا بلکہ جانے کی تمہید۔ مطلب یہ ہے کہ اسی غرض سے آیا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس جائے اور ہم تیرے فراق میں مہینوں تڑپتے رہیں۔

لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

فرماتے ہیں۔ اب ہم ایسے کمزور ہو گئے ہیں کہ بارِ حوادث بھی اٹھاتے ہوئے پچکے جاتے ہیں وہی ہم تھے کہ بتوں کی نازبرداری کی طاقت رکھتے تھے گویا زمانے کے حوادث و آفات بتوں کے ناز و انداز سے بوجھ بھاری میں کم ہیں۔

کہوں کیا خوبئ اوضاع ابنائے زماں غالبؔ — بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس قافیہ کو معمولہ کہتے ہیں۔ ایک دو شعروں میں ایسا قافیہ باندھنا حسن کلام سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں۔ ابنائے زمان کی کچھ ایسی وضع ہو گئی ہے کہ ہم ان کی خوبی بیان ہی نہیں کر سکتے ہم نے جس سے بارہا نیکی کی تھی اسی نے ہمارے ساتھ برائی کی اوپر کے مصرعہ میں خوبی کا لفظ طنزاً استعمال ہوا ہے جو برائی کے معنی دیتا ہے۔

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

ڈوبی ہوئی اسامی زمینداروں کی اصطلاح میں اس کاشتکار کو کہتے ہیں جس کو کسی افتادگی کی وجہ سے نقصان پہنچا ہو اور مالگذاری کا روپیہ مہاجن کا قرضہ اس کے ذمہ ایسا باقی ہو جس کی وصولیابی کی امید قطع ہو گئی ہو اور جواریوں کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ہارتا رہتا ہو۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دل جوش گریہ میں اثر گریہ کو اپنی بدنصیبی سے کھو بیٹھا ہے۔ اثر گریہ گویا حاصل گریہ ہے مطلب یہ ہے کہ اے آرزو تو گریہ پر بھروسہ کر کے اپنی مراد دلی حاصل کرنی چاہتی ہے اور گریہ کی بے اثری دلکو لے ڈوبی ہے تیرے حسب مراد کوئی کام نکلتا معلوم نہیں ہوتا

اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھائے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

فرماتے ہیں۔ میں داغ ناتمامی ہوں یعنی مجھ کو اپنے ناتمام رہجانے کا داغ اس شمع کی طرح ہے جسکو کسی قدر جل چکنے کے بعد کوئی شخص یا دفعتاً گل کر دے اور وہ ناتمام اور ناکام رہجائے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے غزل

فرماتے ہیں۔ ہم ستم کے مارے ہوؤں کا جہاں ایسا چھوٹا سا ہے کہ اس جہان کا آسمان صرف ایک چیونٹی کا انڈا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے واسطے دنیا سمٹ کر بہت ہی تنگ دائرہ میں آگئی ہے۔ نہ میرا کوئی معاون ہے نہ فریادرس

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

فرماتے ہیں۔ ساری کائنات نے تجھ کو اپنا مبدء و اصل قرار دے لینے کے بعد تیرے

تقاضائے لازمی سے تیری جانب اپنی ساری توجہ مبذول کر دینے کے بعد رجوع کی ہے جس طرح آفتاب کی روشنی سے خاک کے ذروں میں جان پڑ جاتی ہے۔ ذرات کی حرکت کو جان پڑ جانے سے محمول کیا ہے جس میں عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ   غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

فرماتے ہیں حقیقت حال تو یہ ہے کہ میرے شیشۂ دل کو سنگ خارا کی چوٹ یعنی زمانے کی آفتوں نے لال کر دیا ہے جس کا اثر میری آنکھوں کو سرخ رکھتا ہے آنکھوں کی سرخی اکثر نشہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ناواقف لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میرا شیشۂ دل شراب سے لبریز ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا   آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

فرماتے ہیں رقیبوں کے دل میں ہماری طرح سوزِ عشق کی آگ نہیں ہے اور اسی لئے معشوق نے رقیبوں کے دل میں جگہ کر لی ہے۔ ٹھنڈے مکان میں رہنا ہر شخص پسند کرتا ہے اور جس دل میں آتشِ عشق نہیں ہے وہ ضرور سرد خانہ کا کام دیگا۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا   بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔ اس میں دو معنی رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں اگر بولنے پہ آئے تو تم کو قائل کر دینگے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں (از یادگار غالب)

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں   فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

فرماتے ہیں۔ جو شخص سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھا ہوا ہے وہ گویا کشورِ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ ہندوستان کی تخصیص باعتبار رنگ سایہ کے ہے یعنی سایہ بھی کالا ہوتا ہے اور ہندوستان کالا مانا سمجھا جاتا ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا   کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

یہ مضمون بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ فرماتے ہیں ہجوم غم نے میرے جگر پر داغ ڈال دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس داغ نے جگر کو نوش جان فرمایا۔ داغ ہی داغ باقی رہ گیا جگر کی ہستی مٹ گئی اب اگر کسی سے یہ کہتا ہوں کہ کبھی میں بھی جگر رکھتا تھا اور اب تک اس کی نشانی یعنی داغ میرے سینہ میں موجود ہے تو کسی شخص کو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا۔

ہے بارے اعتماد وفاداری اسقدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

فرماتے ہیں ہماری وفاداری پر اسکو ایسا بھروسہ اور یقین کامل ہے کہ باوجود نامہربان ہونے اور ستم کرنے کے کبھی اسکو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ غالب ہماری بے رخی سے ترک محبت کرے گا۔

غزل

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

یہ ساری غزل قطعہ بند اور معشوق کا مرثیہ ہے اسکو نزع میں دیکھ کر فرماتے ہیں کہ میں تجھ کو اس حالت میں دیکھ کر دردمند ہو رہا ہوں اب تو اس حال میں بھی میرا رنج و غم گوارہ نہیں کرتا اور میرے تڑپنے سے تو خود بھی بیقرار ہو رہا ہے۔ تیری وہ غفلت شعاریاں کیا ہو گئیں جب میری جان پر بنی تھی اور تو میری بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

فرماتے ہیں اگر تیرے دل میں غم کی سختیاں اٹھانے کی برداشت نہ تھی تو تو نے میری غمگساری کا دعویٰ ہی کیوں کیا تھا یعنی مجھ سے تجھے ملنا ہی نہ تھا اسی طرح نا آشنا رہتا۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ کاش تو میرا غمخوار نہ بنا ہوتا اور میرے ساتھ غمخواری کرنے کا خیال تجھے پیدا نہ ہوتا تو نے مجھ سے غمخواری کر کے اپنے کو رسوائے خلق کر لیا اور انجام کار رسوائی کے خوف سے اپنی جان دیدی

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تو نے تمام عمر وفاداری کے ساتھ قائم رہنے کا مجھ سے عہد بھی کیا تو کیا تیری عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی اور مجھے تڑپتا ہوا چھوڑ کر تجھ کو دنیا سے جانا پڑا۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی   یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ میرے لئے زندگی کی آب و ہوا زہر کا اثر رکھتی ہے جب اس نے تجھ سے وفا نہ کی تو اب میں ایسی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتا ہوں۔

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا   خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تیری جلوہ افروزی کے وقت تیرے ناز و انداز سے جو پھول جھڑا کرتے تھے وہ کیا ہو گئے؟ یا تو وہ زمانہ تھا یا اب یہ وقت آگیا کہ تیری قبر پہ پھول رکھے ہوئے ہیں۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں   ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ رسوا ہو جانے کی شرم سے تو زمین کا پیوند ہو گیا اور تو نے خاک کی نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لی۔ تجھ سے زیادہ دنیا میں محبت کا پردہ پوش کون ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوف رسوائی سے تو نے اپنے کو ہلاک کر لیا۔

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی   اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ تیرے مر جانے سے ناموس پیمان محبت خاک میں مل گئی گویا دوستی کی راہ و رسم ہی دنیا سے اٹھ گئی یعنی تیرے بعد اب کوئی معشوق وفادار زمانے میں پیدا نہ ہوگا۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا   دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ افسوس کی جگہ ہے کہ دستِ قاتل بیکار ہو گیا۔ مجھ کو تو یہ آرزو تھی کہ میرے دل پر اس کے ہاتھ سے تلواروں کے زخم لگتے وہ آرزو میری پوری نہ ہونے پائی۔ زخم اٹھانے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے ناز و انداز کے لطف حسب دلخواہ حاصل نہ کر سکا۔

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال   ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ ہم کو تو اس بات کا مزا پڑا ہوا تھا کہ انتظار کی گھڑیاں اور فراق کی راتیں تارے گن گن کر بسر کیا کرتے تھے۔ اب یہ برسات کی اندھیری راتیں کیونکر ہم سے کٹیں گی۔

شبہائے غم کو شب ہائے تار سے تعبیر کیا ہے اور برسات رونے کا استعارہ ہے۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال　　ایک دل اُس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ کان تو پیام یار کے ہجر میں مبتلا ہیں اور آنکھیں جمال یار سے محروم ہو گئی ہیں میرے ایک دل پر یہ دو مصیبتیں ناامیدواری کی بلائیں نازل کر رہی ہیں۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ　　رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے عشق نے ابھی تک وحشت کا رنگ اختیار نہ کیا تھا یعنی ابھی میں نے ہرزہ گردی و دشت نوردی نہ کی تھی کہ رسوائی کے ڈر سے میرے معشوق نے اپنی جان دیدی اور میرے دل میں ذوقِ خواری اسی طرح رہ گیا۔

غزل

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے　　تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

فرماتے ہیں اپنی سرگشتگی کی وجہ سے زندگی سے ناامید ہو گیا ہوں اب تسکین کو مبارکباد دینی چاہیے کہ موت آجانے کے بعد یقینی سرگشتگی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر　　اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

فرماتے ہیں میرا دل میرے اختیار سے باہر ہو کر آوارگی پسند ہو گیا ہے لیکن معشوق کو اب تک یہی یقین ہے کہ وہ میرے ہی پاس ہے۔ اسی یقین کے بھروسہ پر وہ میرے دل سے بے پرواہ ہو گیا ہے اور اس کی خبر نہیں لیتا ہے۔

کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک　　ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

فرماتے ہیں۔ تپ غم کے چڑھنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کہاں تک اس کا بیان کروں مختصر یہ ہے کہ رونگٹا رونگٹا میرے جسم کا شکرگذاری کے واسطے زبان بن گیا۔ جاڑے کے بجائے میں جسم پہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا　　ہر چند اسکے پاس دلِ حق شناس ہے

فرماتے ہیں۔ میرا دل حق شناس تو اسی کے پاس رہا کرتا ہے اور مجھکو اس بات کا کامل

یقین ہے کہ اس ظالم کو میرے دل حق شناس نے رسم و راہ وفا سے بخوبی خبردار کر دیا ہوگا۔ مگر وہ اپنے غرور حسن میں کس کی سنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک رسم و راہ وفا سے بیگانہ رہا

پی جسقدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

فرماتے ہیں۔ شب مہتاب میں جسقدر شراب میسر آسکی میں نے پی لی۔ میرا مزاج بلغمی ہے اور بلغمی مزاج والے کو گرم چیزیں بہت مفید ہوا کرتی ہیں۔ شراب کو آتش تر سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی گرم مزاجی کا ادنیٰ ثبوت ہے اور شب مہتاب بھی ٹھنڈی ہوا کرتی ہے اس وجہ سے شب مہتاب میں شراب کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسد ہر مکان کو مکین سے شرف حاصل ہوا کرتا ہے۔ جنگل کی آبادی مجنوں کے دم سے تھی۔ اس کے مر جانے کے بعد جنگل اداس ہو گیا ہے۔

غزل
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

فرماتے ہیں۔ گر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ دل کا حال کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور راز دل چھپا رہتا ہے تو میں اپنی گفتگو سے بھی خوش ہوں۔ یہ بھی خاموشی کے برابر کام دیتی ہے اس لئے کہ میری بات کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ دینا نہایت بلیغ خیال ہے۔

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ
دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

فرماتے ہیں۔ حسرت اظہار۔ زبان کے گویا نہ ہونے کی گلا مند ہے میں کس کے آگے جا کر اسکا گلہ کروں اور دل میرا ایک فرد حساب ہے جس پر جمع و خرچ زبانہائے لال کا حساب رقم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حسرت اظہار ان لوگوں سے گلا مند ہے جو گونگوں کی طرح زبانوں کو مہر لگائے ہیں یعنی مجھ سے میری مصیبتوں کا حال نہیں پوچھتے۔ باوجودیکہ میرے چہرے سے حسرت اظہار ظاہر ہو رہی ہے۔

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

فرماتے ہیں۔ ایزدا تیری رحمت کس پردہ میں چھپی ہوئی آئینہ بخشش کی جلا کر رہی ہے اور کیوں پردہ سے باہر نہیں آتی اب تو اسے ظاہر ہو جانا چاہئے اس لئے کہ میرا لب سوال عذر خواہ معصیت ہے مطلب یہ ہے کہ میرے لب رحمت کا سوال اس شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے بے انتہا گناہ کئے ہیں اور میری یہ خاموشی گویا میرے گناہوں کا عذر ہے اس صورت میں اظہار رحمت ضروری ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی   اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

فرماتے ہیں۔ اے شوق محبت تو جو اس خیال سے منفعل ہو رہا ہے کہ اس شوخ نے تیرے ساتھ دشمنی برتی یا برتے گا۔ ہے ہے خدا نخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگا یہ خیال تیرا بالکل غلط ہے۔

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان   نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

یہ شعر منقبت میں ہے۔ فرماتے ہیں۔ غلاف خانہ کعبہ کو مشک آگیں علی کے قدم سے جان یعنی خانہ کعبہ سے جو فیض و برکت تمام دنیا کو پہنچ رہا ہے۔ وہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے خانہ کعبہ کی دیواروں سے بتوں کو توڑ کر نکالا ہے۔ اگر بت نہ توڑے جاتے تو اس پر کفار کا قبضہ رہتا مسلمانوں کو اس سے فیض نہ پہنچتا اور خانہ کعبہ زمین کی ناف ہے۔ ناف غزال نہیں ہے جس میں مشک ہوتا ہے۔ مشک کے اعتبار سے خانہ کعبہ کو مشکیں لباس نہ سمجھنا چاہئے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت پیدا بھی خانہ کعبہ میں ہوئے ہیں۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا   دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

فرماتے ہیں۔ میدان دنیا میری صحرا نوردی کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اس لئے زمین عرق انفعال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دریا اور سمندر گویا زمین کے واسطے عرق انفعال کا حکم رکھتے ہیں

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسد یہ ساری دنیا صرف خیالی اور اعتباری وجود رکھتی ہے یہاں اپنے موجود ہونے کو بھولے سے اپنی ہستی نہ سمجھ لینا۔ یہ سارا عالم حلقۂ دام خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو   حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے   غزل

فرماتے ہیں تمہاری شکایتیں میرے دل میں اسی طرح چھپی ہوئی ہیں جس طرح چقماق میں آگ دبی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر تم انہیں کھود کھود کر اور کرید کرید کر پوچھو گے تو ان باتوں کا شکایت آمیز اظہار دشمنی کی آگ کو مشتعل کر دیگا۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں میں اکثر شکوہ و شکایت سے فساد پیدا ہوتا ہے۔

والا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

فرماتے ہیں۔ یہ درد و الم کا نتیجہ ہونے والا ہے کہ ایک دن ہم مر جائیں گے اور پھر نہ گریۂ سحری باقی رہیگا نہ آہ نیم شبی کا وجود ہوگا۔ اے دل درد و غم کی حالت کو غنیمت سمجھنا چاہئے کہ جس وقت تک یہ ہے جاری زندگی بھی ہے۔

غزل

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پہ سے حرف بآسانی گزلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اسکا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لئے ہیں جس پر سے حرف خود بخود اڑ جائے۔ کہتے ہیں کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ہے (از یادگار غالب)

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

فرماتے ہیں ہر سانس سینے کے اندر ایک تیز اشتعال پیدا کرتا ہے اور یہی اشتعال زندگی کا باعث ہے۔ باوجود اسکے کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا حصہ فنا ہوتا ہے۔ اس سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بمقتضائے فطرت طبیعت ہر ذی حیات کو فنا کا ذوق ہے یعنی یہ وہی اشتعال ہے جو فنا کرتا ہے اور حیات بخشتا ہے لیکن اس ذوق فنا کی ناتمامی پر دل جلتا ہے کہ ایک بار جسم کو جلا کیوں نہیں دیتا۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے لاچار ہے

فرماتے ہیں آگ ایک خاموش چیز ہے غل شور سے تعلق نہیں رکھتی لیکن جب اسے پانی میں ڈال دیتے ہیں تو اس میں سے بھی ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہر کوئی مصیبت

کے وقت نالہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق عذر خواہ۔ معافی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ہے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔ (از یادگار غالب)

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی　　زندگی سے بھی مرا جی اندنوں بیزار ہے

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو ہمیں اپنی زندگی کہا کرتا تھا جب میں ایسا کہتا تھا وہ اور وقت اور زمانہ تھا اب تو اپنی زندگی سے بھی میرا جی بیزار ہو گیا ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا　　تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرت دیدار ہے

فرماتے ہیں۔ میں نے لفافہ خط پر بجائے پتہ لکھنے کے آنکھ کی تصویر قلم سے بنا دی ہے۔ اور اس سے مدعا یہ ہے کہ تجھ پہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کاتب خط کو حسرت دیدار بہت زیادہ ہے۔

شعر　پینس میں گذرتے ہیں جو وہ کوچہ سے میرے　　کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

فرماتے ہیں جس طرح میری صورت سے ان کو نفرت ہے اسی طرح میرے محلے سے بھی ہے میرے کوچہ میں اتنی دیر توقف فرمانا بھی گوارا نہیں ہوتا کہ جتنی دیر میں کہار کندھا بدل لیتے ہیں اس لئے کہاروں پر تاکید ہوتی ہے کہ اس کوچے سے باہر نکل کر کندھا بدلنا یہاں سے جلد گذر جاؤ۔

[illegible]　مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے　　جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

فرماتے ہیں میری ہستی حیرت آباد تمنا کو رونق بخشنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس آواز کا نام اہل دنیا نے مقرر کر لیا ہے۔ وہ اس عالم کا عنقا ہے یعنی کسی قسم کی آواز بلند ہی نہیں ہوتی۔ صوفیا کی اصطلاح میں مقام حیرت اس مقام کو کہتے ہیں جہاں طالب پر تجلی ذات وارد ہوتی ہے۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کسکو کوئی موسم ہو　　وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

یہ مضمون صاحب نے چھ جملے دو مصرعوں میں عجیب حسن خوبی کے ساتھ ادا کر دیئے ہیں۔ اور اس میں لطف یہ رکھا ہے کہ سب جملے زبان بلبل سے ادا کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ہمیں معلوم نہیں خزاں کس کو کہتے ہیں اور بہار کس کو کہتے ہیں۔ ہماری حالت کسی موسم میں بدلتی ہی نہیں ہے۔ ہم وہ بلبل گرفتہ ہیں کہ قفس میں مدت سے بند ہیں اور ہمیشہ [illegible] کے ہاتھ میں گرفتار ہیں۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم　　اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

فرماتے ہیں وفادار دوست کا مل جانا خوش نصیبی ہے۔ اتفاقیہ امر ہے ورنہ اے ہمدم فریاد کے اثر اور محبت کی تاثیر کے ہم قائل نہیں ہیں یعنی نہ محبت کے اثر سے معشوق رام ہوتا ہے نہ آہ و نالہ کی تاثیر کارگر ہوتی ہے۔

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی　　کفِ افسوس ملنا اہل تجدیدِ تمنا ہے

فرماتے ہیں شوخی اندیشہ سے ناامیدی اور مایوسی کا صدمہ نہیں اٹھ سکتا اس واسطے ایسی تمنا میں ہمیشہ مبتلا رہنا مایوس ہو جانے سے بدرجہا بہتر ہے اس لئے کف افسوس ملنا ناامیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دوبارہ تمنا سے تجدید بیعت کرنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو یاس کے عالم میں کف افسوس ملتا ہوں یہ ناامیدی کی وجہ سے نہیں ملتا بلکہ تمنا کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کرتا ہوں۔ بیعت کرنے کے وقت مرید اپنے دونوں ہاتھوں میں پیر کا ایک ہاتھ تھام کر توبہ استغفار کرتا ہے اور کف افسوس ملنے کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے　　نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

چراغ کشتہ استعارہ ہے بیمار وفا سے۔ فرماتے ہیں۔ رحم کر ظالم کہ بیمار وفا کی ہستی ہی کیا ہے گویا اس کی نبض دود چراغ کشتہ ہے نزع کے وقت کی نبض کو اطبا دودی کہتے ہیں اور نملی بھی کہتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں　　ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

فرماتے ہیں۔ دل لگی کی آرزو ہم کو بے چین رکھتی ہے اور اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ کہ رونق چراغ اس کے نقصان کا باعث ہے یعنی چراغ جلتا رہتا ہے تو اس کا تیل اور بتی دونوں ختم

ہو کر چراغ کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور اگر وہ بجھ جاتا ہے تو اس کی بے رونقی چراغ کے واسطے مفید ہے۔

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلہ آواز ہے

فرماتے ہیں حسینوں کی آنکھیں خاموشی میں بھی گفتگو کرتی رہتی ہیں گویا ان کی آنکھوں کا کاجل شعلہ آواز بنایا گیا ہے۔ سرمہ خورانیدن یا سرمہ آواز یہ دونوں فارسی الفاظ کے محاورے میں خاموش کرنے کے معنی پر ان کا استعمال ہوتا ہے۔ میرزا صاحب کہتے ہیں کہ یہ کاجل شعلۂ آواز بنایا گیا ہے لہٰذا اس کا اثر خلافِ دوسرے سرموں کے قوتِ گویائی بخشتا ہے تو کہوے توگوئی کا ترجمہ ہے۔

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

فرماتے ہیں پیکرِ عشاق یعنی عاشقوں کے جسم بدنصیبی کے ساز ہیں اور ان کے نالے گویا بدبختی کے ستاروں کی آواز ہیں عشاق ہمہ تن نالہ و فریاد ہوا کرتے ہیں اس لئے ان کو بدبختی کا ساز کہا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہلِ عجم کے محاورے میں مقامِ عشاق ایک راگنی کا نام ہے۔

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

فرماتے ہیں دیدۂ خونبارِ مجنوں کی دستگاہ تو ملاحظہ فرمائیے کہ آنکھوں سے جو خون کی ندی بہی ہے اس نے نجد کے جنگل کو ایسا فرشِ پا انداز بنا دیا ہے جس پر کوسوں تک جلوۂ گل کا سماں نظر آتا ہے۔

غزل

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

فرماتے ہیں تو جو میرے دعوائے عشق پر کہتا ہے کہ تجھ کو عشق نہیں ہے بلکہ دیوانگی کا جوش ہے جس میں وحشت پیدا ہو گئی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھا مجھ کو عشق نہ سہی وحشت ہی سہی اور یہ میری وحشت تیری شہرتِ حسن کا باعث ہی سہی۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ مضمون میرزا صاحب کے حصے میں آ گیا ہے جہاں نظم کیا ہے خوب نظم کیا ہے اور ہر جگہ نیا انداز باندھا ہے فرماتے ہیں۔ ہم سے قطع تعلق آپ کیوں کرتے ہیں۔ اگر کچھ بھی لگاؤ باقی نہیں ہے تو کار

سے عدو دشمنی ہی کیجیے، محبت نہ سہی عداوت سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

فرماتے ہیں اگر میں تمہاری مجلس میں آ بیٹھوں گا تو اس میں کونسی آپ کی بدنامی ہوگی۔ جب دونوں جگہ یکساں ہے مجلس نہ سہی خلوت سہی۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

فرماتے ہیں ہم کچھ اپنے عدو تو نہیں ہیں کہ تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کریں جب تجھے غیر کی محبت کا یقین کامل ہے اور اس کو اپنا سچا عاشق سمجھتا ہے تو ہم تجھ سے کیوں ملیں۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

فرماتے ہیں اپنی ہستی کو جاننا عین عرفان ہے بمصداق من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یعنی جسنے پہچانا اپنے نفس کو اس نے پہچانا اپنے رب کو دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں اگر اپنے نفس سے آگہی حاصل نہ ہوئی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی کر لینی مناسب ہے یعنی جب اپنے کو نیست سمجھ لیا تو موجود حقیقی کا جلوہ ضرور نظر آ جائیگا یہ شعر بھی میرزا کے نشتروں میں کا ایک آبدار نشتر ہے۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

فرماتے ہیں یہ تو ہم نے مان لیا کہ عمر کا قیام بجلی کی چمک کی مانند ہے لیکن پھر بھی اتنی فرصت مل جانی ممکن ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

فرماتے ہیں ہم عشق کی تکلیفوں سے گھبرا کر ترک وفا نہ کریں گے یوں بھی کہ عشق کو ہم ذریعہ راحت نہ سمجھیں باعث مصیبت سمجھیں گے۔

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

فرماتے ہیں اے فلک میں تجھ سے یہ تو نہیں کہتا کہ تو میری مراد بھی پوری کر دے کم از کم رخصت فریاد تو مجھے دے کہ اس کے دینے میں بھی تیرا کچھ نقصان ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

فرماتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈال لیں گے جب یہ سمجھ لیں گے کہ بے نیازی تیری عادت میں داخل ہو گئی ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

فرماتے ہیں اے اسدؔ یار سے مدعا طلبی کی چھیڑ چھاڑ ہوتے جانے خاموش ہو کر بیٹھ رہنا کچھ کام کی بات نہیں ہے اگر وصل نہیں ہوا تو اظہار حسرت ہی سہی۔

غزل

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

فرماتے ہیں۔ آرام لینے کی حالت میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ کو سرزنش کیجائے وطن میں رہ کر صبح کا ہونا میرے واسطے خندۂ دنداں نما ہے مطلب یہ ہے کہ مجھ کو تلاش یار میں ترک وطن کرنا لازمی اور ضروری ہے میری آرام طلبی کی دیکھو جو گھر میں بیٹھا ہوا ہوں تو وطن کی صبح میری حالت پر ہر روز خندہ زن ہوتی ہے۔

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

فرماتے ہیں۔ میرا دل اس گانے والے کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی آواز کی بجلی مجھ پر گر کر مجھکو فنا کر دے اور میں غم ہائے اسکے ساتھ اپنی ہستی کو بھی بھول جاؤں

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

فرماتے ہیں۔ میدان خیال میں مستانہ وار راہ کو طے کر رہا ہوں تو وہ اسلئے کہ پلٹ کر آنے سے مجھکو غرض مطلب نہ رہے یعنی میں اپنے کو اس طرح گم کر دوں کہ پھر ہوش میں نہ آ سکوں۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

فرماتے ہیں میں تو ہمیشہ نکہت گل کو بے حجابی کا الزام دیتا رہا ہوں اور اس سے یہی کہتا رہا ہوں کہ ذرا ہوا چلی اور تو جامے سے باہر ہو گئی مگر تو آج اس سے بھی زیادہ بے حجاب اور بے شرم نکلا اب مجھے نکہت گل سے شرمسار ہونا پڑا یعنی تیری بے حجابیاں دیکھ کر دوسے گل کو کس منہ سے

بے حجاب کہوں۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ   شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

فرماتے ہیں کسی شخص پر میرے دل کا معاملہ یعنی میرا رازِ عشق کیوں ظاہر ہوتا اگر اشعار کے انتخاب نے مجھے بدنام کر دیا یعنی میں ایسے ہی شعر چن کر پڑھا کرتا تھا جن میں معاملاتِ عشق و محبت مضامین بندھے ہوئے ہوتے تھے۔

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فرماتے ہیں اے غالب جب ہماری زندگی ایسے بُرے حالوں سے گزری تو ہم کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

غزل اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے   بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

میرزا صاحب نے اس شعر میں حیا کے معنی غیرت کے لیے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اُنکی بزمِ ناز میں مجھ کو غیرت سے کام لیتے ہوئے نہیں بن آئی میں بیٹھا رہا باوجودیکہ غیر سے اُن کے اشارے ہوتے رہے۔

دل ہی تو ہے سیاستِ باں سے ڈر گیا   میں جاؤں در سے ترے بے صدا کیے

فرماتے ہیں دل ہی تو ہے یعنی دل کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی مضبوط ہو جاتا ہے اور کبھی بودا ہو جاتا ہے اس وقت اس کا یہ حال ہوا کہ ذرا سے دربان کے دھمکا دینے سے ڈر گیا ورنہ میں ایسا نہ تھا کہ تیرے دروازہ پر سے بغیر صدا کیے چلا جاتا۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے   مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

فرماتے ہیں۔ خرقہ و سجادہ کو شراب کے بدلے گرو رکھتا پھرتا ہوں اس لیے کہ بسنت کے بعد بہار کا موسم آیا ہے مینہ برس رہا ہے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے مناسب ہے کہ اس وقت فصلِ بہار کی دعوت کی جائے اور شراب کا دور ہو اور دونوں چیزوں کو الگ گرو رکھے ہیں یہ توقع رکھی ہے کہ ایک چیز سے قیمت شراب ادا ہوئی۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر   حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

فرماتے ہیں۔ تعلقات دُنیا سے چھٹکارہ کہاں کہ عمر کو عبادت الٰہی میں صرف کیا جائے عمر اگرچہ حضرت خضر کی کیوں نہ ہو مگر بیکار ضرور گذریگی حضرت خضر بھی کل فرمائینگے کہ معلوم نہیں ہم کیا کرتے رہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

فرماتے ہیں۔ اگر یہ قدرت حاصل ہو جائے تو میں ضرور خاک سے دریافت کروں کہ اے لئیم تو نے وہ قیمتی خزانے کیا کر دیئے یعنی بڑے بڑے لوگ تیری آغوش میں آئے اور تو نے انکو خاک میں ملا دیا اس طرح کہ کسی کا بھی نشان باقی نہ رہا۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

فرماتے ہیں وہ کونسا دن تھا کہ جس دن دشمنوں نے ہمارے اوپر تہمتیں نہ باندھیں اور وہ کونسا دن تھا کہ جس دن ان کی جھوٹی باتوں میں آ کر تم نے ہمارے سر پہ آرے نہ پھیرے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو یہ وہم پیدا ہو گیا ہے کہیں غیر کی صحبت میں تو اس کو یہ عادت نہیں پڑ گئی وہ بغیر التجا کئے بوسہ دیتا ہے اور اس وہم نے وصل کی خوشی کو غم سے بدل دیا ہے۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

فرماتے ہیں ضد کی تو بات ہی اور ہے کہ اسے ہم سے کسی وقت کسی بات پر خاص ضد پیدا ہو جائے ورنہ یہ عادت بری تو نہیں ہے اکثر اس نے بھولے سے وعدے وفا کیے ہیں یہ مطلب ہے کہ اس کی بھول بھی بعض اوقات لطف کا کام دیجاتی ہے۔

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملیگا جواب کیا مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

فرماتے ہیں کہ اے غالبؔ تم خود ہی سوچ کر اس بات کا جواب دو کہ وہاں سے تم کو جواب کیا ملیگا۔ یہ تو ہم نے فرض کر لیا کہ تم اپنا مطلب ان سے کہتے رہے اور وہ سنتے بھی رہے لیکن تمہاری مدعا براری کی کیا صورت ہوگی۔ وہاں تمہاری پہنچ کیونکر ہو سکیگی اور پھر وہ بغیر اظہار رضا کی اجازت کس طرح دیگا تم کہاں وہ کہاں کچھ دل میں تو اپنے سوچو۔

غزل رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

فرماتے ہیں جس طرح اہل تنجیم آفتاب کی رفتار سے سال کا حساب لگا لیتے ہیں عمر گریزاں کا حساب آفتاب کے بدلے تجلی سے کرنا چاہیے۔ سال یعنی عمر بھی استعمال ہوتا ہے راہ اضطراب وہ راستہ ہے جو حالت اضطراب میں طے کیا جائے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

فرماتے ہیں۔ نشاط بہار سے سبز شیشۂ شراب سرو کا مد مقابل بن گیا ہے اور شراب تند کی لہر بال تدرو کا نمونہ دکھا رہی ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

فرماتے ہیں پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہو کر مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اب میدان عشق سے بھاگ سکتا ہوں اور نہ ٹھہر سکتا ہوں۔

جاداد بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

فرماتے ہیں۔ جاداد یعنی جائداد۔ بادہ نوشی سے مراد شرب عرفان ہے رند سے مراد عارف مطلب ہے اہل عرفان کو شش جہت پر اپنے عرفان کی وجہ سے قبضہ حاصل ہو گیا ہے وہ ہر طرف ذات باری تعالیٰ کی تجلیاں دیکھ رہے ہیں اور جو شخص جلوہ حقیقت سے ناآشنا یعنی غافل ہے اسکے گمان میں دنیا خراب ہے یعنی غافل ہو رہی ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

فرماتے ہیں ظہور عالم اجسام شاہد حقیقی کے واسطے پردہ کا حکم رکھتا ہے نظر اسکو دیکھ ہی نہیں سکتی یعنی نظر جب دیکھے گی نقاب ہی کو دیکھے گی آنکھ جب اٹھے گی جسم ہی پر پڑے گی جوش بہار سے مقصود ہے ظہور عالم کا اور نقاب کہنے سے اسکو یہ مراد ہے کہ نقاب جس طرح چہرہ کو چھپا لیتی ہے اسی صورت سے عالم اجسام کا تماشہ صوفیہ کے نزدیک عالم لاہوت تک جانے سے روکتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

فرماتے ہیں میں اپنے دل نامراد کی تسلی کیونکر کروں یہ تو میں نے مانا کہ صرف تیرے دیکھ لینے سے نگاہ کو تسلی ہو گی۔ مگر دل کو تسلی اسی صورت میں ہو گی کہ جب تجھ سے وصل جسمانی بھی حاصل ہو گا۔

گزرا اسدؔ مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوالُ جواب ہے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ میں پیغام یار کی خوشی و مسرت کو لیکر کیا کروں مجھ کو تو یہ رشک قتل کئے ڈالتا ہے کہ اگر میں قاصد کو بھیجوں گا تو قاصد جا کر اس سے گفتگو کرے گا ہمکلام ہو گا اور مجھے یہ بات کسی طرح گوارا نہیں۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے غزل

فرماتے ہیں میری بدنصیبی تو دیکھو کہ مجھ کو آپ اپنے پر رشک آ جاتا ہے (انتہائے محبت یہ ہے کہ محبت میں بدگمانی پیدا ہو جائے اور انتہائے بدگمانی یہ ہے کہ انسان کو کامیابی کی صورت میں خود اپنے پر بھی رشک آ جائے) رشک کی حالت میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ انتہائے محبت کامیابی سے بھی محروم رکھتی ہے۔

ہات دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

فرماتے ہیں اگر آتش فکر میں ایسی ہی گرمی ہے تو دل سے نا امید ہو جانا چاہیے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی مضمون کو تشبیہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آبگینہ یعنی دل کا شیشہ شراب کی تیزی سے پگھلا جاتا ہے۔

غیر کو یا رب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملہ کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گذرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا درحقیقت ایک ہی چیز ہے پھر اسکے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے؟ بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ اگر حیا بھی اسکو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی و درخواہش بیجا سے اور شرما جاتا ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے (از یادگار غالب)

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

فرماتے ہیں شوق کو ایسے رنگ کا لپکا پڑ گیا ہے کہ ہر گھڑی نالہ و فریاد کئے جاتا ہے اور دل کی حالت ایسی زار و نزار ہو گئی ہے کہ سانس لینا بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔ لت کے معنی بُری عادت کے ہیں۔ جیسے شراب یا اس کو جوا کھیلنے کی لت ہے۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

فرماتے ہیں چشم بد دور تیری بزم طرب کی کیا بات ہے یعنی اس قدر خوشی سے معمور ہے کہ میرا نالہ بھی جو وہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری فریاد کو سن کر تو خوش ہوتا ہے اس سنگدلی پر اللہ رحم کرے۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ آپ کی چشم پوشی یعنی بے توجہی راز عشق کی پردہ پوش ہے لیکن ہم ایسے رند ایسے بے خود اور خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ راز عشق سے باخبر ہو جاتا ہے کھوئے جانے سے چونکا ایسے دو محاورے اس شعر میں نظم کئے گئے ہیں کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجور یاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اس کی محفل ناز کی خبر سن کر میرا دل رنجور یہاں اس طرح سے بیٹھا جاتا ہے یعنی ناامید ہو جاتا ہے جس طرح رقیب کی دل کا مدعا اس کے دل پر بیٹھ گیا ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

فرماتے ہیں وہ پری رخ معشوق یہ عاشق ہو کر اور زیادہ نازک بن گیا محبت کے صدمے سے جس قدر اس کا رنگ اڑتا ہے اتنا ہی رنگ نکھرتا جاتا ہے یعنی زیادہ گورا ہوتا جاتا ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

فرماتے ہیں اس کی تصویر بھی مصور کے ساتھ ناز و غرور کا برتاؤ کرتی ہے یعنی جس قدر مصور تصویر کو کھینچتا جاتا ہے اسی قدر اس کی تصویر مصور سے کشیدگی پیدا کرتی جاتی ہے۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

فرماتے ہیں اے اسدؔ عشق کی بدولت ایسی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں کہ میرا سایہ بھی مجھ سے گریز کرتا ہے یعنی جس طرح آگ سے دھواں بھاگ کر بلند ہو جاتا ہے اسی طرح میرے سوزِ جگر کے خوف سے میرا سایہ مجھ سے دُور بھاگ جاتا ہے گویا شعلۂ آتشِ جگر کا دھواں ہے میرا سایہ نہیں عجب پُر لطف مقطع لکھا ہے۔

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے قطعہ

فرماتے ہیں نقشِ قالین کو دیکھ کر میں صرف نالہ و فریاد ہو کر ہائے یہ شکل تیرے پہلو میں ہو اور میرا معشوق ہو گرمِ فریاد ہونے نے شبِ ہجر کی سردی سے میری جان بچا لی ورنہ میں ٹھٹھر کر مر جاتا۔

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

فرماتے ہیں میری ہمت کی نگاہ میں دنیا و عقبیٰ میں کوئی بھی چیز جچتی نہ تھی نسیہ و نقد ان دونوں کو بے حقیقت سمجھ کر میری ہمتِ عالی نے مجھ کو خود خرید لیا یعنی میں وہ بیش بہا جنس ہوں کہ میری خریداری کیلئے نقدِ دنیا اور نسیۂ عقبیٰ ناکافی تھا۔

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

فرماتے ہیں کثرت کے لباس میں وحدت کو آراستہ کرنا اور وحدت پہ کثرت کا خیال کرنا وہم پرستی نہیں تو اور کیا ہے یعنی یہی خیل کثرت اصنامِ خیالی سمجھے جاتے ہیں اور جس طرح بتوں کو بتوں کا بندہ شریکِ باری تعالیٰ سمجھتا ہے اسی طرح وہ بھی جو وجودِ کثرت کے قائل ہیں کثرت کو وحدت کا شریکِ وجود سمجھتے ہیں اور ایسا خیال کرنا کھلا ہوا شرک و کفر ہے۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

فرماتے ہیں تماشائے گل کا تصور بھی اب آنے نہیں پاتا اس کھٹکے سے بھی مجھ کو نجات حاصل ہو گئی یہ راحتِ قلبی بے پروبالی کی بدولت مجھے حاصل ہو گئی مطلب یہ ہے کہ جب تک بال و پر میں طاقتِ پرواز رہی میں اڑ کر باغ میں پہنچ جاتا تھا اب بے طاقتی کی بدولت عشقِ گل کی قید سے آزاد ہو چکا۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے غزل

میرزا صاحب اپنی رقعات عودِ ہندی میں ان تینوں شعروں کی شرح خود تحریر فرماتے ہیں۔

وہ یہ ہے داغ سامان مثل شمع انجمن وہ شخص کہ داغ جسکا سرمایہ سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عناء ہے مزارع کا وہ لہو جو کشت کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ نفی راحت اور صورت رنج غنچہ۔

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

کلی جبتک نکھلی بصورت قلب صنوبری نظر آئی اور جب تک پھول بے برگ عافیت معلوم یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام بمصرعہ۔ برگ عیشی بگور خویش فرست۔ برگ اور برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل شخصیت گل باعتبار خاموشی و برجا ماندگی پریشانی نما ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔

ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

پشت دست صورت عجز اور خس بدنداں کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھدی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کسطرح ہو قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا۔ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ ۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

فرماتے ہیں ہم تو وحشت دل کی بدولت دیوانگی کے عالم میں بیاباں نورد ہو گئے اور بہت

نے آکر گھر کے درودیوار پر ویرانگی کے عالم میں گھاس پیدا کردی افسوس ہے کہ ہم تو جنگل میں مارے مارے پھرتے ہیں وہ گھر میں بہار آکر خانۂ ویران باغ بن گیا ہے۔ میرزا صاحب نے دیوانگی کی تصویر ایسے سادے لفظوں میں کھینچی ہے کہ تعریف سے مستغنی ہے۔

غزل
سادگی پر اُسکے مرجانے کی حسرت دل میں ہے   بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

یہاں سادگی سے مراد ترک زینت و آرائش ہے۔ فرماتے ہیں اسکی سادگی جو بغیر تلوار کے قتل کر رہی ہے یعنی ابھی تلوار اس نے باندھی بھی نہیں ہے میرا ارادہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ کر مرجانے کا تھا اور یہی حسرت ابھی تک میرے دل میں ہے کہ اسکی سادگی پر گلا کاٹ کر مرجاؤں مگر میرے اس ارادہ کی تکمیل ابھی نہ ہوئی تھی کہ خنجر اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب میری حسرت نکلنے کے دو سبب مانع ہو گئے ہیں؛ ایک یہ کہ جب خنجر اسکے قبضہ میں آگیا تو ہم اپنا گلا کیونکر کاٹیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب خنجر اس نے کھینچ لیا تو اب وہ سادگی کہاں باقی رہی جس پر ہم اپنی جان قربان کرنی چاہتے تھے۔ دوسرے مصرع میں پھر کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ ہم اپنا گلا کاٹنے پر مستعد تھے مگر اس نے اسی طرح خنجر ہمارے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسنِ بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے؛ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی

(از یادگار غالب)

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ   ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذکر ان کے سامنے برائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور غیر وہ ذکر کرتے ہیں مگر بہرحال مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں آتو جاتا ہے۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی   یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

فرماتے ہیں اے ہجوم ناامیدی بس کر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سعی بے حاصل میں جو اک

ذرا سی لذت باقی رہ گئی ہے یہ بھی خاک میں مل جائے۔

رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے　　اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

راہ کی تکلیفیں کیوں کھینچی جائیں اور یہ کوشش کیوں کیجئے۔ واماندگی کو ہم سے عشق ہو گیا یعنی ناکامی و نامرادی ہم پر عاشق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ واماندگی ہم پر مبتلا ہے پھر کبھی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے تو اب ہمارا ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا یعنی رستہ چلنے سے بالکل ہی چھوٹ گیا۔

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی　　فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

فرماتے ہیں یہ آپ سچ کہتے ہیں ہمارے دل میں آتش دوزخ بھری ہوئی ہے لیکن فتنۂ قیامت کس کے آب و گل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو سراپا فتنۂ قیامت کا نمونہ ہو۔

ہے دل شوریدۂ غالبؔ طلسم پیچ و تاب　　رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

مطلب تو اس شعر میں صرف اتنا ہے کہ میری تمنا نے دل نکال دیا۔ مرزا صاحب نے اس کو تشبیہ شوخی کے ساتھ بیان کیا ہے فرماتے ہیں غالبؔ کا دل شوریدہ طلسم پیچ و تاب ہے یعنی ایک گورکھ دھندے کی طرح بہت سے بل پڑے ہوئے ہیں تمہاری تمنا ایسے پیچ و تاب میں ایسی مشکل میں مبتلا ہو گئی ہے تم غالب پر رحم نہ کرو بلا اپنی تمنا پر رحم کر کے اس کو اس آفت سے نکال کر لیجاؤ۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی غز

فرماتے ہیں۔ تیری نگاہ تیر کی طرح دل سے جگر میں جا پہنچی اور ان دونوں کو ایک ہی ادائے ناز میں رضامند کر کے واپس ہو گئی۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق　　تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

فرماتے ہیں سنو تو سہی میرا سینہ شق ہو گیا ہے اور اس کے شق ہونے سے لذت فراق کو عجیب سرور حاصل ہوا ہے بڑی تکلیف زخم جگر چھپانے کی تھی اب وہ مٹ گئی کھلم کھلا فراق کے مزے لوٹنے نصیب ہو گئے۔

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

فرماتے ہیں۔ اب رات کی پی ہوئی شراب کی سرمستیاں کہاں باقی رہیں یعنی شباب کا زمانہ گذر گیا بیدار رہنے کا وقت آ گیا۔ لذتِ خواب سحر باقی نہ رہی یعنی پیری کا آغاز ہو گیا جوانی کی نیند سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ نفس کو غفلت کا موقع نہ رہا۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

فرماتے ہیں۔ مجھے برسوں سے یہ آرزو تھی کہ بال و پر پیدا ہو جائیں اور میں یار کے کوچہ میں اڑ کر پہنچ جاؤں زندگی میں میری یہ مراد پوری نہ ہوئی لیکن مرنے کے بعد میری خاک کوئے یار میں اس طرح اڑتی پھرتی ہے جس طرح میں زندگی میں چاہتا تھا۔

دیکھو تو دلفریبیٔ انداز نقش پائے موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

فرماتے ہیں۔ اس کی نقش پا کی دلفریبیوں کے انداز تو ذرا دیکھو موج خرام یار مقراض بنکر کیسے پھول کتر گئی۔ دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ گل کترنا محاورہ ہے جو فساد برپا کر دینے کے موقع پر بولا جاتا ہے اور اس کے نقش پا نے زمین پر قائم ہو کر عشاق و اغیار میں باہم فساد برپا کر دیا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فرماتے ہیں ہوس رانوں کی عادت حسن پرستی نہ تھی۔ مگر اب انھوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے یہ عادت اختیار کر لی۔ اہل نظر کے عشق صادق کی قدر جاتی رہی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فرماتے ہیں رخ یار تک پہنچکر نگاہ ایسی بدمست ہو گئی کہ اس کی زلفوں کی طرح پریشان ہو کر بکھر گئی اور اس نقاب کی طرح دیدار کی مانع ہو گئی گویا خود نقاب بن گئی۔

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کا مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں بدل

یہ زمانہ حال ہو جائیں گے۔ سب تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی۔ قیامت گذر جانے کے دو معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گذر جانا اور خود قیامت کا آجانا۔ (یادگار غالب)

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

فرماتے ہیں۔ اے اسد اللہ خاں بہادر تمہیں زمانہ کی گردشوں اور مصیبت کی تکلیفوں نے موت سے پہلے تمام کر دیا۔ وہ جوش و خروش اب کہاں ہے اور وہ زور و شور جوانی کے کدھر گئے۔

غزل **تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے**
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

فرماتے ہیں۔ عاشق کے لئے یہ دو باتیں عیش و مسرت کی ہیں۔ ایک تسکین قلب۔ دوسری ذوق نظر۔ حوران خلد اگر تیری ہمشکل ہوں تو ان کے ملنے سے ہم کو صرف ذوق نظر حاصل ہو سکتا ہے تسکین قلب نہیں ہے کہ حوروں کی صورت تجھ سے ملتی ہوئی ہو اور اس صورت میں بھی کہ ان کو تیرا ہمشکل مان لیا جائے تو بھی تسکین قلب بغیر تیرے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم ذوق نظر ملنے پر بھی صبر کر لیتے ہیں لیکن یہاں وہ بھی میسر نہیں اس لئے کہ حوریں تیری شباہت نہیں رکھتیں۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

فرماتے ہیں تو مجھے اپنی گلی میں دفن کرے گا تو اس میں دو قباحتیں پیدا ہو جائیں گی ایک قباحت یہ ہے کہ میرے پتہ سے تیرا گھر مشہور ہو جائے گا یعنی لوگ قبر والی گلی مشہور کریں گے یہ نہیں کہیں گے غالب کی قبر جس گلی میں ہے اور مجھے دونوں صورتوں میں رشک ہوگا اور رشک مجھ کو مر جانے کے بعد بھی گوارا نہ ہوگا۔ دوسرے باریک معنی اس شعر میں یہ ہیں کہ جب قبر کے پتہ سے تیرا مکان مشہور ہو جائے گا تو لوگ تجھ کو غالب کا قاتل یا غالب کا معشوق مشہور کر دیں گے اس میں تیری توہین اور بدنامی ہوگی مجھ کو مر جانے کے بعد بھی تیری بدنامی گوارا نہ ہوگی۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

فرماتے ہیں۔ آج تم ساقی بنے ہو چلئے ہم کو چھکا دو۔ تھوڑی بہت تو ہر روز پیتے تھے ہم بھی پیتے ہی رہتے ہیں۔ مگر پیٹ بھر کر نصیب نہیں ہوتی۔ آج تو ہمیں جی بھر کے پلا دو۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

فرماتے ہیں۔ اے ندیم تجھ سے تو ہم کو کچھ زیادہ شکایت نہیں ہے البتہ نامہ بر جو بڑی ڈینگیں ہانکتا تھا اور دعویٰ کر کے گیا تھا کہ میں ضرور جواب نامہ لیکر آؤنگا اور اب تک اس نے شکل ہی نہیں دکھائی اور شرمندگی سے چھپکر بیٹھ گیا اگر وہ ملجائے تو میرا سلام کہدینا مطلب یہ ہے کہ ذرا اسکی شکایت کرنا اور شرمندہ کرنا۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

فرماتے ہیں ہم تم کو دکھا دیتے کہ مجنوں یعنی قیس نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ غم پنہاں اپنی پردہ دری اور رسوائی کے خوف سے ہم کو کھینچ کھینچ کر لے آتا ہے اور جنگل میں نکل جانے سے مانع ہوتا ہے۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

فرماتے ہیں راہ سلوک میں تو ہم خضر کے برابر ہیں لیکن راہ طلب میں خضر سے سبقت لیجانی چاہتے ہیں اس لئے ان کو ایک بزرگ آدمی سمجھتے ہیں مگر ان کی پیروی کرنے سے قاصر ہیں۔ اس شعر سے میرزا صاحب کی شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

فرماتے ہیں اے ساکنان کوچۂ راہ سلوک تم کو غالب آشفتہ سر اگر ملجائے تو اس کی زیارت کرنا اور دیکھنا کہ اس کی جذبی کیفیت کس قدر بلند رتبہ رکھتی ہے تم جس کوچہ میں جھونپڑی چھا کر پڑے ہو وہاں سے کس طرح بے تعلقی کے ساتھ گذر جاتا ہے۔

غزل

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

فرماتے ہیں اب تک تو ہم نے تمہاری التجا میں غیروں کی منتیں کیں اور راہ عشق کی ٹھوکریں کھائیں مگر اب ہم نے اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ تم سے ترک تعلق کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ جائیں گے اگر عشق کامل و جذبہ صادق رکھتے ہیں تو تم خود ہمیں پوچھتے ہوئے ہمارے گھر چلے آؤگے۔ مگر یہ ساری

یا تیری سی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہماری زندگی بھی وفا کرے اور غم فراق ہماری جان پر نہ بنائے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ یہ گرمی آتش دوزخ کو کہاں نصیب ہے، غم پنہاں کا سوز کچھ دوسری چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سوز غم عذاب دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

فرماتے ہیں۔ دور محبت کی بدگمانی غضب کی چیز ہے باوجودیکہ بہت دفعہ ان بن ہوا اور پھر باہم صفائی ہو گئی ہے لیکن اب کی بار یہی یقین ہے کہ اب ان سے ملاپ نہ ہوگا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

فرماتے ہیں نامہ بر نے ان کا خط مجھے دیدیا لیکن اسکے منہ دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منہ زبانی بھی کچھ کہلا بھیجا ہے اور وہ ایسی بات ہے کہ اس کے دہرانے میں قاصد کی زبان نہیں اُٹھ سکتی معلوم ہوتا ہے دو چار گالیاں بھی خط کے ساتھ دی گئی ہیں میرزا صاحب کی شوخی اور ظرافت ہر غزل میں ضرور اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

فرماتے ہیں اکثر ستارے ایسے ہیں جن سے عمریں قطع ہو جاتی ہیں لیکن یہاں جس بلائے آسمانی سے کام پڑا ہے وہ ان نحوس ستاروں کے مقابلہ میں قضائے مبرم کا حکم رکھتی ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

فرماتے ہیں اے غالب زندگی میں جن مصیبتوں کا سامنا پڑا وہ انجام کار سب ختم ہو گئیں تو ایک مرگ ناگہانی کی آفت ابھی باقی رہی ہے۔ موت کچھ کہکر تو آتی ہی نہیں کیا معلوم کس وقت آ جائیگی ضرور اور بے خبر آئیگی ایک دھک سی لگی ہے میں ہر وقت اس کا منتظر ہوں۔

غزل

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

فرماتے ہیں جھوٹی امید کی کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی ناکامی اور نامرادی میں زندگی

بسر ہو رہی ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

فرماتے ہیں موت کے واسطے ایک دن معین ہو چکا ہے جب تک وہ دن نہ آئیگا موت کیونکر آ سکتی ہے لیکن نیند کو شبِ فرقت میں کیا ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی مری موت تو نہیں ہے کہ اس کے آنے کے لئے بھی کسی خاص دن کی قید لگا دی گئی ہو۔ وہ (یعنی نیند) شبِ فرقت میں رات رات بھر کیوں نہیں آتی۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

میر اگر زندہ ہوتے تو میرزا صاحب کے اس شعر کی داد دیتے۔ پریشان خاطری کی تصویر کن سادے لفظوں میں کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں پہلے تو مجھے اپنے دل کی مصیبت پر ہنسی آجایا کرتی تھی۔ اب میری مصیبتوں نے اسقدر مجھ کو افسردہ خاطر کر دیا ہے کہ خوشی کی بات پر بھی مجھ کو ہنسی نہیں آتی۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

فرماتے ہیں زہد و عبادت کو ثواب جانتا ہوں۔ اور ان دونوں باتوں کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوں لیکن طبیعت ادھر رجوع نہیں ہوتی۔ اسکا کیا علاج مطلب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ توفیق نہ دے۔ انسان کوئی نیک کام نہیں کر سکتا۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ بہتر یہی ہے۔ کہ میرا منہ نہ کھلواؤ ورنہ بیٹھے بٹھائے رسوا ہو جاؤ گے مطلب یہ ہے کہ مجھے وہ راز کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں کہ جن کے بیان کر دینے میں بدنامی کا خوف ہے۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ میری نالہ کشی کو میرا معشوق اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے اسکو میری فریاد میں ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے اگر میں خاموش ہو جاتا ہوں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے

کہ ہمارے مکان کے قریب ایک دیوانہ سا آدمی بیٹھا ہوا نالے کیا کرتا تھا۔ آج اس کی آواز نہیں آتی شاید کہیں چلا گیا۔ اس لئے میں رات دن چیخا کرتا ہوں۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے چارہ گر اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا داغ دل پردے میں یعنی میرے سینے کے اندر چھپا ہوا ہے تو اسکو دیکھ نہیں سکتا لیکن اے کمبخت کیا تیرا دماغ بند ہے کہ تجھ کو اسکے جلنے کی بو بھی نہیں آتی۔ سانس کے ساتھ کباب کی بو آرہی ہے اور تو اسکو نہیں سونگھ سکتا اور دل کے کباب ہونے سے انکار کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں استفہام تقراری ہے یعنی بو آرہی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ خود رفتگی و خود فراموشی اسقدر بڑھ گئی ہے کہ ہمکو اپنے حال کی بھی خبر نہیں رہی۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ مرتے ہیں مرتے ہیں یعنی موت کے بے انتہا مشتاق و آرزومند ہیں۔ موت آتی ہے یعنی موت کا آنا لازمی اور ضروری ہے۔ رات دن سیکڑوں آدمیوں کا مرنا سنتے رہتے ہیں مگر ہم کو موت نہیں آتی ہم نہیں مرتے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

فرماتے ہیں۔ اے غالب ساری عمر تو شاہد پرستی اور شراب خواری کرتے رہے اب کیا منہ لے کر خانۂ کعبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم کو شرم نہیں آتی۔

غزل

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

فرماتے ہیں دل ناداں تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ تو کسی طرح اپنے حرکتوں سے باز نہیں آتا آخر اس درد یعنی درد عشق کی دوا کیا ہے۔ تیرا کیا علاج کریں جو تو ان حرکتوں سے باز آئے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں بڑا ناز و نیاز کی باتیں ہوتی

ہیں۔ ان سے ناواقف ہے۔ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔ (از یادگارِ غالب) یہ شعر بھی مرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

فرماتے ہیں غیروں سے تو تم ان کی حالت پوچھتے رہتے ہو۔ مجھ کو بھی اللہ تعالیٰ نے زبان عطا فرمائی ہے۔ مجھ سے بھی تو کبھی پوچھو کہ تیرا مدعا کیا ہے۔ دیکھو تو میں تم کو اس کا کیا جواب دیتا ہوں

* * *

قطعہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اے خدا جس صورت میں کہ تیرے سوا دنیا میں کوئی دوسرا موجود ہی نہیں ہے پھر یہ ہنگامہ آرائی کیسی ہے یعنی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

جب تیرے سوا کوئی دوسرا اس عالم میں نہیں ہے تو یہ پریوں کے سے حسین اور خوبصورت لوگ کیسے نظر آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کے یہ غمزے اور ناز و کرشمے اور ادائیں کیا چیز ہیں۔

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

یہ خوشبودار گھونگر والی زلفیں کس لئے بنائی گئی ہیں۔ اور یہ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا کام دے رہی ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ سبزہ زار اور یہ خوشبودار پھول کہاں سے آگئے ہیں۔ کس نے ان کو پیدا کر دیا ہے اور یہ ابر کیا چیز ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اور یہ ہوا کیا ہے۔ اس کی حقیقتِ حال کیا ہے۔ اس قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ زبانِ حال سے مرزا صاحب فریاد کر رہے ہیں۔ کہ اس دلکش اور دلفریب منظر کو دیکھ کر ایسا فطین نفس کس کے پاس ہے کہ آدمی ان سب تماشوں کو ہیچ سمجھ کر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نمائشِ نظر فریب نے انسان کو ایسا مشغول کر دیا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ زیادہ دامن گیر ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ان ساری لذتوں کو ترک کر کے

اس ذات واحد کی طرف رجوع کریں لیکن ان منظروں کی دلفریبیاں ہم کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ ابھی سلامتی سے اسقدر کمسن اور نادان ہیں کہ سرے سے وفا ہی کو نہیں جانتے کہ وفا کس جانور کا نام ہے اور ہم عشق کے دام میں پھنس کر ایسے نادان بن گئے ہیں۔ کہ اب بھی ان سے وفا کی امید رکھتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا　　اور درویش کی صدا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہے۔ سچ تو کہتا ہے۔ اس میں شک شبہ کرنے کی کیا بات ہے۔ فقیر کی یہ صدا کہ جو بھلا کریگا یعنی دنیا میں کسی کو کچھ فائدہ پہنچائیگا۔ دونوں جہان میں اسکو فائدہ پہنچیگا

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اوروں کی طرح زبانی خرچ میرے پاس نہیں ہے یعنی میں خالی دعا دینی نہیں جانتا۔ جان کو تم پہ قربان کرتا ہوں۔ میری بڑی دعا یہی ہے کہ اپنی جان تمہارے صدقہ میں اتارتا ہوں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

فرماتے ہیں اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ غالب ایک بیکار سا آدمی ہے لیکن تم کو تو مفت کا غلام ملتا ہے۔ تم کو اس کے غلام بنانے میں کیا برائی ہے۔ کچھ گرہ سے دام تو خرچ کرنے ہی نہیں پڑتے۔ مفت کا سودا ہے لے لو۔

غزل　کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے　　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

فرماتے ہیں۔ اے دوستو۔ اے ہمدمو۔ اے ندیمو۔ اے غمخوارو تم سب میرے لئے یہ دعا تو کرتے ہو کہ خدا کرے وہ بت غالیہ مو آجائے۔ یہ کرو کہ ایک بار تم سب لوگ گھبرا کے کہہ بیٹھو۔

ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت　　کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

فرماتے ہیں میں اسوقت کشمکش نزع میں مبتلا ہوں۔ مگر ہاں اے جذب محبت [illegible]

کشش تو تو بھی دکھا دے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مجھ میں اب بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے لیکن وہ میرے پوچھنے کو تو آ جائے۔ بلا سے جواب نہ دے سکوں نہ سہی۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ میرے گھر میں تشریف لے آئے ہیں لیکن ان کی حالت صاعقہ و شعلہ و سیماب کی سی ہے یعنی دم نہیں لیتے۔ بیٹھتے نہیں ٹھہرتے نہیں آتے ہی جانے کا سوال ہو رہا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا آنا بھی آنے میں شمار ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادۂ دوشینہ یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی ازراہ شوخی کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کئے چلے جائیں (از یادگار غالب)

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

یہ شعر تصوف میں ہے گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

فرماتے ہیں۔ یہ طعنہ کس سے سُنا جائے کہ برسوں اس کی طلب میں خاک چھانی اور پھر اسکو نہ پایا۔ ناکام و نامراد واپس آ گئے۔ ہم نے جب دیکھا کہ معرفت الٰہی کا راز پوشیدہ دریافت نہیں ہو سکتا اور اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا تو ہم اپنے کو کھو آئے۔ یعنی ہوش و خرد سے گذر کر مست و مجذوب ہو گئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

فرماتے ہیں ہماری یہ عادت نہیں ہے کہ طلب دوست سے اکتا کر آرام سے ہو بیٹھیں جب ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا اور ہم کسی طرح اس تک نہیں پہنچ سکتے تو کعبہ جا کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں بار نہ ملا تو یار کے گھر کو ہی دیکھ آئے۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

فرماتے ہیں میرے ہمنشینوں نے معشوق سے اثرِ گریہ کی بابت تقریر کی یعنی گریہ میں اثر ہونیکو ثابت کیا مگر ثابت نہ کرسکے اور وہ اس بنا پر کہ جب معشوق نے یہ کہا کہ رونے میں اگر تاثیر ہوتی اور تم جس کے جانب دار بنکر یہ گفتگو کر رہے ہو کہ وہ تیرے فراق میں راتدن روتا رہتا ہے اور اس کے رونے کا تجھ پہ اثر ہوگا تو نصیب دشمناں تیرے دم پر بن جائے گی۔ یہ بالکل غلط ہے نہیں ایسا نہیں ہے آنسو بہانے میں اگر تاثیر ہوتی تو میں اسوقت رونیوالے کے پاس ہوتا۔ یہ سنکر میرے ہمنفس گریہ کا بے اثر ہونا مان گئے اور مایوس ہوکر واپس چلے آئے۔ قائل ہوجانے کے بعد یہ لوگ تو اسکے اچھے رہے یعنی اسکے ہمزبان بن گئے مگر مجھ کو ڈبو آئے یعنی میری گریہ کی بے اثری کا قائل ہوجانا میرے لئے شرمندگی کا سبب تھا۔ دوسرا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا جس کو میں پوشیدہ رکھتا تھا۔ اب اس حال کے ظاہر ہوجانے کے بعد اس کی نگاہوں میں حقیر ہوجاؤنگا۔

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

فرماتے ہیں۔ وہ انجمن ناز یعنی تیرے معشوق کی بزم اے غالب قابل تعریف کے ہے وہاں کسی کی روک ٹوک نہیں ہے دوست دشمن سب جمع ہوجاتے ہیں ہنسی مذاق غرض یہ کہ لطف صحبت حاصل کرتے ہیں تیری بدنصیبی ہے جو تو وہاں جانے سے محروم ہے اور باریابی سے روکا جاتا ہے۔

غزل

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر دل میں بےچینی پیدا ہوگئی ہے اور ہر وقت گدگدی سی ہوتی رہتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کا زخم کھانے کی دوبارہ خواہش پیدا ہوگئی ہے۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

فرماتے ہیں۔ ناخن نے پھر جگر کریدنا شروع کردیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کا موسم پھر قریب آگیا ہے۔ باغ میں لالہ و گل کھلیں گے اور سودا پھر زور پکڑیگا اہل جنوں کے زخم پھر تازہ ہوجائینگے۔

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

فرماتے ہیں پھر نگاہ نیاز کا قبلۂ مقصد وہی پردۂ عماری بن گیا ہے جس میں محبوب جلوہ گر ہے

مطلب یہ ہے کہ لیلیٰ کی طرح ہمارے معشوق کو بھی محمل میں سوار ہونیکا شوق پیدا ہو گیا ہے۔

* * *

قطعہ چشم دلال جنسِ رسوائی   دل خریدار ذوق خواری ہے

فرماتے ہیں۔ آنکھ جنس رسوائی کی دلالی کرنے لگی ہے اور دل ذوق خواری کا خریدار بن گیا ہے یعنی دیوانہ ہو گیا ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی   وہی صد گونہ اشکباری ہے

پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں بیان فرمائی ہے یعنی دل سو سو طرح سے نالہ و فریاد کرتا ہے جس کا انجام ذلت و خواری کے اور کیا قرار پا سکتا ہے اور آنکھ سو سو طرح سے اشکباری کرتی ہے جو رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے۔

دل ہوائے خرام ناز سے پھر   محشرستان بیقراری ہے

فرماتے ہیں۔ خرام ناز یار کے شوق میں پھر ہمارا دل بیقراری کے لئے میدان حشر بنگیا ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے   روز بازار جانسپاری ہے

فرماتے ہیں۔ جلوۂ یار متاع ناز و غمزہ کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشق جانباز اس کا خریدار بنتا ہے گویا بازار جاں سپاری کی ہر روز گرمی بازار ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

فرماتے ہیں۔ پھر اسی بیوفا کا عشق دوبارہ پیدا ہو گیا ہے یعنی پہلے جس پر مرتے تھے اور پھر اسی طرح سے زندگی کے دن بسر رہے ہیں جس طرح پہلے بسر ہوتے تھے۔

* * *

قطعہ پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز   گرم بازار فوجداری ہے

فرماتے ہیں۔ تعطیل ختم ہو گئی۔ پھر عدالت ناز کے دروازے کا قفل وا ہو گیا۔ آجکل پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ فصل گل کے آتے ہی پھر عشق و جنون کے

ولولے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

ہو رہا ہے جہاں میں اندھیر　　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

فرماتے ہیں۔ جہاں میں پھر وہی اندھیر ہو رہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زلف کو پھر عہدہ سرشتہ داری مل گیا ہے

پھر کیا پارۂ جگر نے سوال　　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے

فرماتے ہیں۔ پارۂ جگر نے پھر دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ پھر چاروں طرف فریادی ٹوٹ پڑے ہیں

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　　　اشکباری کا حکم جاری ہے

فرماتے ہیں پھر عدالت کے روبرو عشق کے گواہ پیش ہو رہے ہیں۔ اشکباری کا حکم جاری ہے آنسوؤں کے ساتھ خون دل لخت جگر کو عشق کی شہادت میں پیش کر رہا ہے۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　　آج پھر اس کی روبکاری ہے

فرماتے ہیں مژگان یار اور دل عاشق میں جو باہم مقدمہ بازی ہو رہی تھی آج پھر عدالت میں اس کی روبکاری ہے یعنی دونوں فریق اپنا اپنا ثبوت دعویٰ اور جواب دعویٰ پیش کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی جدت پسند طبیعت اشعار میں نئی نئی ترکیبیں پیدا کئے بغیر رہ نہیں سکتی چنانچہ یہ قطعہ بھی ان کی ندرت بیان کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

بیخودی بے سبب نہیں غالب　　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب۔ یہ بیخودی بے سبب تو نہیں ہے کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے جس کے چھپانے کی غرض سے یہ بیخودی طاری ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اخفائے راز عشق کے لئے یہ پردہ بیخودی حائل ہوا ہے۔

قطعہ　جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی　　　نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

فرماتے ہیں کہ جنون مجھ پر تسکین کی تہمت میری تھوڑی دیر کے لئے شادماں ہو جانے کی وجہ سے نہیں عائد ہو سکتی۔ اگر میں دم بھر کے لئے خوش ہو گیا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجھ پر خدا نخواستہ

شادمانی کی تہمت لگا دی جائے گی۔ مجھ کمبخت کی شادمانی تو زخم دل پر نمک پاشی کے سبب سے ہے تسکین کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ زخم دل پر لذت زندگانی کا نمک پاشی ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایسے برے حال سے زندہ رہنا زخم دل پر نمک چھڑک رہا ہے اور زخم پر نمک چھڑکنے سے زخموں میں سوزش اور تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے نہ کہ تسکین۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

فرماتے ہیں آزادی چاہے جتنی کوشش کرے مگر دنیا میں آکر ہستی سے کوئی آزاد نہیں ہو سکتا دریا کی موجوں کو دیکھو وہ آزاد ہونے کے لئے جسقدر ہلکتی ہیں اسی قدر زنجیروں میں زیادہ الجھتی چلی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ علائق ہستی سے انسان جسقدر آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی قدر اسکی گرفتاری بڑھتی جاتی ہے۔ انجام کار اس کی کوشش کشش سے مغلوب ہو جاتی ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے
شرار سنگ نے تربت پہ میرے گلفشانی کی

فرماتے ہیں۔ مرجانے کے بعد بھی تیرے دیوانہ کو لڑکوں نے زیارت گاہ بنا رکھا ہے اور وہ اب تک بھی میری قبر پر آکر پتھر مارتے ہیں۔ شرارۂ سنگ کے پھول قبر پر ہر روز چڑھائے جاتے ہیں۔

غزل

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیداد دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

فرماتے ہیں ظلم معشوق کی فریاد کرنے والے مجرم کی سزا زجر و ملامت ہے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو صبح محشر بھی اس کمبخت کے حق میں خندۂ دنداں نما بن کر نمودار ہو۔

رگ لیلیٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

مشہور ہے کہ ایک بار لیلیٰ کی فصد ہوئی تھی اور قیس کی رگ بازو سے خون جاری ہو گیا تھا۔

فرماتے ہیں۔ دشت مجنوں کی خاک رگ لیلیٰ کو زخمی کرے اگر دہقان غلہ کی جگہ نوک نشتر بوئے۔ مطلب یہ ہے اگر دشت مجنوں میں دانہ کی جگہ نوک نشتر بوئیں تو زمین سے بجائے کونپل کے رگ لیلیٰ پیدا ہو یعنی جذبہ عشق نے عاشق و معشوق اور رگ و نشتر میں اسقدر اتحاد باہمی پیدا کر دیا ہے۔

پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پروانہ کا پر مے کی کشتی کا بادبان تھا اس لئے کہ جب مجلس خوب گرم ہو گئی تو دورِ ساغر چلنے لگا۔ مطلب یہ ہے جہاں بزم آرائی ہوتی ہے وہاں شمع روشن کی جاتی ہے اور جہاں شمع روشن ہوتی ہے وہاں پروانوں کا لشکر آدھمکتا ہے اور گرمیِ مجلس دورِ ساغر کا سبب قرار پاتی ہے تو شاید کشتیِ مے کا بادبان پرِ پروانہ ہوتا ہے۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت　　کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

فرماتے ہیں میری کیا مجال ہے جو ذوقِ پرفشانی کے ستم و جور کو عرض کر سکوں۔ پھڑکنے سے پہلے شہپر کی طاقت نے جواب دیدیا۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے　　مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

فرماتے ہیں خیمے کے پیچھے کہاں تک روؤں۔ قیامت یہ ہے کہ یارب میری قسمت میں پتھر کی دیوار بھی نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو گریہ میں اتنا جوش ہے کہ کم سے کم قنات خیمہ کو بہادے اور یار کا دیدار نصیب ہو جائے نہ رونے میں ایسا اثر ہے کہ وہ خیمہ سے گھبرا کر باہر نکل آئے یا مجھ کو خیمہ کے اندر بلالے اور قسمت سے بجائے قنات خیمہ سنگین دیوار بھی نہیں ہے کہ ناامیدی اور مایوسی کی حالت میں دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں۔

غزل　بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے　　جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

فرماتے ہیں جسقدر ہم نے اپنی حد سے تجاوز کیا اسی قدر لوگوں کی نگاہوں میں سبک ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے　　اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقہ سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا (از یادگار غالب)

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے　　یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

فرماتے ہیں ہماری ہستی ہماری فنا پر دلیل ہے ہم اس قدر مٹے ہیں کہ آپ اپنی قسم بن گئے ہیں کسی شے کے نہ ہونے کو محاورے میں یوں کہتے ہیں کہ فلاں شے ہمارے پاس قسم کھانے کو

شئی نہیں ہے اور اس قسم پر یہ شئی بولا جاتا ہے کہ نام کو بھی نہیں ہے یعنی اگر وہ شئے برائے نام بھی ہوتی تو ثبوت قسم کے لئے کافی سمجھی جاتی اور اس طرح کی ہستی جو برائے قسم یا برائے نام ہو وہ ہستی فنا کی لپیٹ ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ہستی کو اس قدر مٹا دیا ہے کہ قسم کھانے کے لائق بھی باقی نہیں رہی۔

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

فرماتے ہیں عشق کی سختیاں کھینچنے والوں کی یعنی اپنے عشاق مصیبت زدہ کی خبر کیا دریافت کرتے ہو وہ لوگ گھلتے گھلتے یعنی فنا ہوتے ہوتے سراپا الم بن گئے مطلب یہ ہے کہ جس طرح رنج و الم ظاہر و محسوس شئے نہیں ہے یہی حال ان بدنصیبوں کا ہو گیا کہ گھلتے گھلتے نظر سے پوشیدہ ہو گئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

فرماتے ہیں تیری وفا سے تیری ہی جفا کی تلافی ہو سکتی ہے اور ہم ایسے ستم زدہ ہیں کہ تیرے علاوہ زمانہ نے بھی ہزاروں ستم ہم پر کئے ہیں۔ ان کی تلافی تیری وفا سے کیونکر ہو سکتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر رحم کھا کر اپنی جفا کی تلافی کرتا ہے تو پھر ایسا کر کہ عمر بھر کے لئے ہمیں کوئی شکایت ہی پیدا نہ ہو یعنی دنیا کی تکلیفوں سے بھی تیری بدولت چھٹکارا ہو جائے۔ میرزا صاحب معشوق کو مہربان پا کر اور پاؤں پھیلاتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جنون سے یہاں مراد عشق ہے فرماتے ہیں ہم عشق کی حکایات خونچکاں اپنے اشعار میں لکھتے رہے ہیں باوجودیکہ معشوق نے ہمارے ہاتھ قلم بھی کئے تو بھی ہم گذرے ہوئے معاملات نظم کرنے سے باز نہ آئے ایک شارح صاحب نے میرزا کے اس مصرعہ ثانی پر اپنی جودت طبع دکھانے کے لئے ستر مصرعے لگائے ہیں مگر اس ہیچمدان کی رائے میں میرزا کا مصرعہ اولیٰ سب پہ سبقت حاصل کئے ہوئے ہے

اللہ ری تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے

فرماتے ہیں تیری بدمزاجی کے خوف سے نالہ لب تک نہ آ سکا نالۂ دل دل ہی میں تحلیل ہو گیا اور اس کا ایک جزو دوسرے جزو کو اسی طرح نوش جان فرما گیا جس طرح خوف سے رگوں میں

خون خشک ہو جاتا ہے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

فرماتے ہیں بوالہوسوں کی جیت اسی میں ہے کہ میدانِ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور وہ لوگ اپنے دل میں یہ سمجھیں کہ میدان سے بھاگتے وقت جو پاؤں اٹھا وہ گویا علمِ فتح کا بلند ہو جانا ہی ہے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو یہاں آ کے دم ہوئے

فرماتے ہیں ہم ازلی بدنصیب ہیں۔ ازل میں بھی نالہ کشی کا منصب ہم کو عطا ہوا تھا جو نالے وہاں کھینچنے سے باقی رہ گئے تھے وہ دنیا میں آکر ہمارے لئے سانس بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ عدم میں خوش تھے نہ وجود میں آکر خوش رہے ہمارے لئے سانس بھی نالوں کا حکم رکھتے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے اسد ہم نے گدائی میں بھی عاشق مزاجی ترک نہ کی سائل ہونے کی حالت میں جس کسی نے ہمیں بھیک دیا ہم اسی کے عاشق ہو گئے

غزل

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

فرماتے ہیں۔ اگر شعلۂ عشق میرے داغِ دل کی حفاظت نہ کرے یعنی اسے ٹھنڈا ہونے سے نہ روکتا رہے تو افسردگی کا قابو چل جائے جو بے زبانی کے پردہ میں چور کی طرح چھپی بیٹھی ہوئی ہے اور قابو ڈھونڈ رہی ہے کہ ذرا غافل پاؤں تو اشرفی داغِ دل کو لے بھاگوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شعلۂ عشق داغِ دل کی ہر وقت خبرداری نہ کرتا رہے تو داغِ دل ٹھنڈا ہو جائے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

فرماتے ہیں۔ کم عمری میں کہانی سننے کا شوق بہت ہوا کرتا ہے۔ اس عمر میں تو تب معشوق نے کبھی میری کہانی سنی ہی نہیں۔ اب جوانی کے زمانہ میں مجھے اس سے کب یہ توقع ہو سکتی ہے کہ میری مصیبت کی داستان سنیگا۔

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ میرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

رماتے ہیں۔ بے وجہ کسی کو تکلیف دینی اچھی بات نہیں ہے۔ ورنہ میں ضرور یہ دعا مانگتا کہ الٰہی
یری مصیبتیں دشمن کو مل جائیں جو میرے رنج و غم کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

لمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے　　غزل

میرزا صاحب نے عود ہندی میں خود اس مطلع کی شرح لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے۔ یہ خبر ہے پہلے مصرعہ کی۔ مصرعہ ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہے (اندھیرا ظلمت غلیظ) سحر نا پیدا گویا خلق ہی نہیں وئی ہاں ایک دلیل صبح کی موجود ہے یعنی بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا یا کرتے یں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب ریکی کے۔ پس دیکھنا چاہئے جس گھر میں علامت صبح موجب ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

ے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

فرماتے ہیں۔ اب نہ وصل کا مژدہ کانوں کو حاصل ہوتا ہے نہ جمال کا نظارہ آنکھوں کو میسر تا ہے۔ مدت ہوگئی کہ چشم و گوش میں باہم اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا ہے مطلب یہ ہے۔ وہ زما زر گیا کہ جب آنکھوں کو اگر نظارۂ جمال ہوتا تھا تو کانوں کو رشک پیدا ہو جایا کرتا تھا کہ ہم کو بھی وصل مژدہ ملے یا کبھی کانوں تک وصل کی خوشخبری پہنچ جاتی تھی تو آنکھوں کو حسد پیدا ہو جاتا تھا کہ نوں نے تو مژدۂ وصل سن لیا اور ہم نظارۂ جمال سے محروم ہیں۔

ے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب　　اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

فرماتے ہیں۔ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اے شوق دل عاشق اب تجھ کو بھی جازت ہے کہ تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہوش و حواس اس حسن بے حجاب کو نذر کر دے۔

ہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے۔

رماتے ہیں۔ موتیوں کا ہار حسینوں کی گردنوں میں دیکھنا نصیب ہو گیا ہے۔ گوہر روش کا ستارہ کس قدر اوج پذیر ہے۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدۂ بیخروش ہے

فرماتے ہیں دیدار تو شراب ہے اور حوصلہ ساقی ہے اور نگاہ میخوار ہے۔ خیالی مجلس ایک ایسا میکدہ ہے جس میں کسی قسم کا غل شور ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بزم خیالی عجب سرور افزا منظر ہے۔ مصرع اولیٰ میں اضافت کہیں نہیں ہے۔

قطعہ
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

فرماتے ہیں۔ اے نوجوانو تم نفسانی خواہشوں میں تازہ گرفتار ہوئے ہو۔ خبردار اگر تم کو نے کا سننا اور شراب کا پینا منظور ہے تو۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

مجھ کو دیکھو اور میرا حال دیکھ کر عبرت حاصل کرو اور نے کے مقابلے میں میری نصیحت گوش دل سے سنو اور وہ نصیحت یہ ہے کہ۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی اس جلوہ گری کے ساتھ ایمان و آگہی کا دشمن واقع ہوا ہے اور مطرب اس خوش گلوئی کے ساتھ تمکین و ہوش کا لوٹ لے جانے والا ہے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

یا تو رات کو نظر کے سامنے وہ تماشے ہو رہے تھے کہ فرش کا ایک ایک گوشہ پھولوں کی آراستگی سے باغبان کا دامن اور گلفروش کا ہاتھ بنا ہوا تھا یعنی عجب دلبستگی اور دلفریبی کے سامان جمع ہو گئے تھے اور ان کی تفصیل یہ ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ساقی کی مستانہ چال پامال کئے دیتی تھی اور چنگ و رباب کی آواز کھینچے لیتی تھی۔ ایک طرف تو نگاہ کے لئے جنت کا سماں روبرو تھا اور دوسری طرف کانوں کے واسطے فردوس کی تعریف

کے لطف حاصل ہو رہے تھے۔ یہ گویا حوریں تھیں اور وہ طیور خوش نوا۔

یا صبحدم جو دیکھیے آکر وہ بزم میں
نے وہ سرود و سوز نہ جوش و خروش ہے

صبح کے وقت جو آکر دیکھا تو بزم میں عجب اُداسی اور بیرونقی پائی جاتی تھی۔ نہ تو وہ باجوں کی آوازیں تھیں نہ وہ اہل بزم کا سوز و گداز تھا۔ نہ وہ محفل کا جوش و خروش تھا۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان سب کیفیتوں اور سامان انبساط کے بدلے یہ نظر آیا کہ صحبت شب کی جلی ہوئی اور داغ فراق سے افسردہ خاطر ایک شمع باقی ہے اور وہ بھی کمبخت دل عاشق کی طرح بجھی ہوئی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حق تو یہ ہے ایسی زبردست غزل لکھ کر میرزا صاحب کا یہ مقطع لکھنا ہرگز تعلّی میں داخل نہیں ہے بلکہ حقیقت حال ہے۔ فرماتے ہیں میرے خیال میں ایسے مضامین بلند غیب سے وارد ہوتے ہیں۔ اے غالب میرے خامہ کی آواز فرشتہ کی صدا سمجھنی چاہیے۔

غزل

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

فرماتے ہیں آ اور جلد آ کہ میری جان زار کو صبر و قرار باقی نہیں رہا ہے۔ اب مجھ میں بیداد انتظار سہنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔

دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

فرماتے ہیں حیات دنیا کے بدلے جنت عطا فرمائی جائیگی لیکن دنیاوی تکلیفوں کی تلافی جنت سے نہ ہو سکے گی اور اس بیان کی مثال پیش کرتے ہیں کہ جس نے نشے کے آثار کی مصیبت بے انتہا جھیلی ہو۔ اور اس کے بعد اسکو تھوڑی مقدار میں شراب پلائے تو کیا نشہ کر سکتی ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

فرماتے ہیں بیوفا تیری بزم سے مجھ کو نکال رہا ہے یعنی آنسو تو رکتے نہیں اور میں شرم کی ندامت سے بزم میں ٹھہر نہیں سکتا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ کو اپنے رونے پر بھی دل کی

طرح سے اختیار حاصل نہیں ہے۔ آنسوؤں کا روکنا میرے حدِ اختیار سے باہر ہے۔

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر   خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

فرماتے ہیں ہم لوگوں سے رنجشِ خاطر کا گمان بیفائدہ ہے عشاق تو ایک مشتِ خاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے جو زندگی میں خاک ہو گئے ہیں۔ ان میں غبارِ خاطر کو دخل نہیں ہے۔

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی   غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ جلوۂ معانی آئینۂ دل میں اسی طرح سے نظر آیا کرتا ہے جس طرح آئینۂ گل میں بہار کا حسن و جمال دکھائی دیا کرتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے   وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

فرماتے ہیں اس نے خدا خدا کر کے میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے یعنی یہ تو کہدیا ہے کہ تجھے ہم ضرور قتل کر دینگے۔ ہائے اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے تو بڑا ستم ہوگا۔

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب   تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

فرماتے ہیں اے غالب تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے تیری قسم سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ترکِ میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھلک رہے ہیں تو ہمیں تیری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

غزل   ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے   کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

فرماتے ہیں میرے حصے میں اتنا غم آ گیا ہے کہ اس کے بوجھ سے میرا سر میرے دامنِ قبا سے اس طرح جا ملا ہے کہ نظر کے تار اور قبا کے تاروں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی   سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

فرماتے ہیں۔ زخم میں ٹانکے لگانے سے مجھ کو لذتِ زخمِ سوزن مطلوب ہے اور اس لذت کو حاصل کر کے جو میں بے خود و مدہوش ہو ہو جاتا ہوں اور پھر ہوش میں آ کر لطف سے تڑپ جاتا ہوں تو اس کو یہ نہ سمجھنا کہ درد و زخم کی وجہ سے دیوانہ غافل ہو گیا ہے۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ   چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

فرماتے ہیں۔ وہ گل اندام جس باغ میں اے غالبؔ سیر کے واسطے جاتا ہے اسکے حسنِ دلکش کے اثر سے گلاب کی کلیاں جو چٹکتی ہیں۔ ان میں سے خندۂ دل کی آواز نکلتی ہے مطلب یہ ہے۔ کہ اس کو دیکھ کر باغ کا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

قطعہ پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد   خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

فرماتے ہیں میں صحرا نوردی کا عادی تھا۔ مجبوری پابدامن ہو کر یعنی پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہا ہوں۔ صحرا نوردی کے زمانے میں جو کانٹے میرے پاؤں میں چبھے تھے وہ اب آئینہ زانو کا جوہر بن گئے ہیں زانو کو آئینہ سے تشبیہ دیجاتی ہے اور آئینہ فولادی کے جوہر کانٹوں سے شباہت رکھتے ہیں

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت   ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے

فرماتے ہیں ہم آغوشی کے وقت میرے دل کی حالت دیکھنے کے قابل ہوگی یعنی یہ وہی دل ہے جو برسوں تیری زلفوں میں اسیر رہ چکا ہے۔ اس لئے یہ تیرے ایک بال کو نگاہ آشنا سمجھتا ہے اور کسی دوست کے دل کا حال دوست کو خوب معلوم ہوتا ہے۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ   ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

فرماتے ہیں میں وہ باجا ہوں جس میں تیری شکایت کا راگ بھرا ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تو غیروں کے سامنے مجھے نہ چھیڑے اگر تو مجھ کو چھیڑیگا تو تیری شکایت کا راگ میرے دل سے نکلنا شروع ہو جائیگا

غزل جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے   جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آئے

فرماتے ہیں۔ ناز و ادا کے ساتھ جس بزم میں تو باتیں کرتا ہے اس مکان کی دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوتی ہیں۔ ان میں جان پڑ جاتی ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر   تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے

فرماتے ہیں سرو صنوبر سایہ کی طرح تیرے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں۔ پھر گلستان کے پابند نہیں اگر تو اس قدِ دلکش سے ایک بار بھی باغ میں چلا آئے (سے) کے معنی یہاں ساتھ یا ہمراہ کے ہیں

اکثر اہل زبان محاورے میں اسکو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ میرزا کا یہ شعر بیت الغزل ہے

تب نازِ گرانمائیگی اشک بجا ہے   جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آئے

فرماتے ہیں۔ ہم اسوقت اپنے آنسوؤں کو انمول موتی سمجھیں گے۔ جب جگر کے ٹکڑوں کے ساتھ اشکوں میں مل کر دیدۂ خونبار میں آجائیں گے۔

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر   کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

یہ دوسرا شعر بھی حاصل زمین ہے ایسے گرانقدر شعر ایسی شکست زمینوں میں کب کسی کو نصیب ہوا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو اپنی ستم گاری کا لطف اٹھانا ہے تو مجھ کو شکایت کی اجازت دیدے۔ اگر صبر و خاموشی کے ساتھ میں نے تیرے ظلم و ستم اٹھائے تو تجھ کو کیا معلوم ہوگا کہ کون سا تیر جفا تیرا زیادہ کارگر ہوا اور کونسا ناوک بیداد تیرا اوچھا زخم ڈالتا ہوا نکل گیا

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ   طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

فرماتے ہیں۔ اس کی چشم فسوں گر کا اشارہ پا جائے تو آئینہ بھی طوطی کی طرح باتیں کرنے لگے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آئے

فرماتے ہیں۔ کانٹوں کی خشکی یانی پیاس کی وجہ سے ہے آبلہ کا پانی ملجائے تو ان کی تشنگی رفع ہو

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک   آغوش خم حلقۂ زنار میں آئے

فرماتے ہیں۔ میرا معشوق زنار بند ہندو ہے۔ اس کے دوش پر زنار دیکھ کر مجھ کو رشک آتا ہے کہ وہ نازک جسم میرے آغوش میں تو نہ ہو اور حلقۂ زنار میں ہو۔ مرجانے کی جگہ ہے۔

غارتگر ناموس نہ ہو گر ہوس زر   کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آئے

فرماتے ہیں۔ گل کو ہوس زر ہے یعنی گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے اسکو زرِ گل کہتے ہیں۔ اب گل کو یہ ہوس ہے کہ اس زر کو زیادہ ہونا چاہئے۔ اس لئے ہوس زر سے اس کو بازار میں بکنے کے واسطے آنا پڑا اور اس صورت میں بربادی ناموس ظاہر ہے یعنی شاہد بازاری بن گیا۔

تب چاک گریباں کا مزا ہے دل نالاں   جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آئے

فرماتے ہیں۔ اے دل نالاں گریباں چاک کرنے کا مزہ یہ ہے کہ تارِ گریبان کے ساتھ سانس ہی کھنچ آئے اور تارِ نفس ٹوٹ کر دم نکل جائے۔

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے   اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

فرماتے ہیں۔ میرا سینہ رازِ نہاں کی گرمی سے آتشکدہ بن گیا ہے۔ اگر وہ راز ظاہر ہوگیا تو معلوم نہیں کہاں کہاں آگ لگ جائے گی۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اسکو سمجھئے   جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

فرماتے ہیں۔ اے غالب میرے اشعار کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی اور طلسم معنی سمجھنا چاہئے یعنی میرے ایک لفظ میں کئی کئی معنی ہوتے ہیں اس لئے اسکو گنجینہ سمجھنا چاہئے اور طلسم اس وجہ سے اس کو کہا جاتا ہے کہ ایک ایک معنی میں کئی کئی پہلو نکلتے ہیں اور طلسم کی تعریف یہ ہے کہ مشکل سے کھلے اور نہایت حیرت انگیز ہو اس لئے اسکو طلسم کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کلام بہت دشواری سے سمجھ میں آتا ہے اور سمجھ جانے کے بعد اس کے معنی سے ایک حیرت پیدا ہو جاتی ہے؟

غزل

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے   اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے۔ معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اس کو ماہِ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے (از یادگارِ غالب)

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ   جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

میرزا نے اس شعر میں حرص و آز معشوقانہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ فرماتے ہیں ہر لحظہ یعنی بار بار دل پر نگاہ ڈالتے ہیں جس سے دل کا سوال پیدا ہوتا ہے اور بوسہ دینے سے صاف انکار ہے چہرہ کے تغیرات دلی خیالات کے ترجمان ہیں دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ مال اچھا ہے چھوڑنا نہ چاہئے مگر ناز معشوقانہ جو حرص کا پہلو لئے ہوئے ہے وہ یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اگر مفت میں مل جائے تو اس صورت میں اچھا مال ہے۔ پھر کسی موقع پہ بوسہ کو جان کی قیمت میں لگائینگے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا   جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جامِ جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جسکی وجہ سے وہ جامِ جم جیسی چیز سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جامِ جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزہ میں بھی شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوت متخیلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جامِ سفال کے آگے جامِ جم کی کچھ حقیقت نہ رہی اور پھر اس صورت موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا کہ زبان اسکو پڑھ کر زبان متلذذ اور کان اسکو سن کر محظوظ اور دل اسکو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دیکر ایک نئی صورت بخشی ہے وہ تخیل یا امیجنیشن ہے اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہنکر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اسکا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں امیجنیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونو کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلیٰ درجہ میں واقع ہوا ہے کہ باوجود کمال سادگی اور بیساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے (از مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ)

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

فرماتے ہیں سوال کی تلخی عطا کی شیرینی کو بدمزا کر دیتی ہے جو چیز بے طلب عنایت فرمائی جائے اس کے لطف کا کیا کہنا ہے۔ وہ گدا جسکو عادت سوال کی نہ ہو اچھا ہے۔ اس شعر میں ردیف کی نشست ایسی زبردست واقع ہوئی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہو جاتی ہے نیز یہ بھی معلوم تھا کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالت زار اور اس کی بیدلی کو حد درجہ جتا نہ دے دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا یقین نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم

تھا کہ بعض خوشی سے دفعتاً ایسی بشاشت ہو سکتی ہے کہ رنج اور غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے اور اب ابن جنش نے اس تمام معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانہ کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے اسوقت معشوق نہیں ہوتا اور جب معشوق ہوتا ہے اسوقت تکلیف نہیں رہتی اس مثال میں بھی ابن جنش کا عمل معناً اور لفظاً دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحب ذوق سلیم پر ظاہر ہے (از مولانا حالی رحمتہ اللہ علیہ)

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا یا وبا نہیں آئے گی لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ (از یادگار غالب)

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کہا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ فرہاد ایک مزدور پیشہ جوان تھا اور شیریں اس کی معشوقہ ایک بڑے دولتمند خاندان کی عورت اور نہایت باعصمت تھی۔ مگر سنگ تراشی کے کمال نے فرہاد کو شیریں تک پہنچا کر اس سے ہمکلام کر دیا۔ دنیا میں کمال عجیب شے ہے۔ اہل کمال کی احتیاج بادشاہوں کو بھی ہوتی ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

فرماتے ہیں فرع کا اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا زمانے کے سارے کاموں سے اچھا کام ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے ایک صاحبزادے تھے۔ یہ شعر ان کی مدح میں ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کے بہلائے رکھنے کو یہ

خیال اچھا ہے میرزا صاحب نے اس مقطع میں قیامت کی شوخی برتی ہے۔

غزل

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی   امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

اس مطلع کی نسبت مولانا طباطبائی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔ اس شعر پر اگر غالب خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کریں تو خدا گواہ ہے کہ زیب ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ مطلع بھی ویسا ہی بے مثل ہے کہ جیسا مرزا صاحب کا اکثر کلام ہے۔ فرماتے ہیں میں نے وفا کا امتحان ایسی کامیابی سے دیا کہ انجام کار اپنی جان دیدی۔ اس پر بھی اگر آپ کی تسلی نہیں ہوئی اور آپ نے مجھے کامل وفادار نہیں سمجھا تو اب جو آپکے خیال میں امتحان اور ہو وہ بھی میری نعش پر پورا کر لیا جائے یعنی میں نے آپکے اور آپکے عشق میں اپنی جان دیدی۔ اب میری نعش ہی اگر آپ چاہیں تو قیامت تک آپکے کوچہ میں پڑ سکتی ہے

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے   شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ اگر شوق گلستان تسلی کا گلچین نہ بن سکا نہ سہی اس کے واسطے حسرت دیدار کے کانٹے ہی کافی ہیں۔ مطلب یہ ہے اگر شوق کو تسلی حاصل نہ ہوئی تو حسرت دیدار نے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا تسلی کے لئے حسرت دیدار کیا کم ہے۔

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے   ایکدن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

فرماتے ہیں اے مے پرستو انتظار ساقی کے بعد بھی تو خم مے کو منہ لگا کر شراب پینی ہی پڑی اگر ایک دن بزم مے میں ساقی موجود نہ ہوا تو نہ سہی یعنی اگر ساقی ہوتا تو وہ خم مے سے شیشے اور صراحیاں بھرتا اور صراحی یا شیشے سے شراب گلاس میں نکال کر پیش کرتا۔ ہم نے اس کی غیر موجودگی میں اگر مٹکے سے منہ لگا کر پی لی تو اس میں کیا قباحت ہوئی۔

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا   گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

فرماتے ہیں قیس کا دم صحرا کے واسطے چشم و چراغ کا حکم رکھتا ہے یعنی اس سے جنگل آباد ہو کر روشن ہو گیا ہے۔ اگر قیس کو لیلیٰ کے سیہ خانہ میں باریابی حاصل نہ ہوئی (اور وہاں سے دھتکار دیا گیا) نہ سہی لیلیٰ کے گھر کو سیہ خانہ اس غرض سے کہا گیا ہے۔ کیونکہ مجنوں کو وہاں بار نہ ملی

نفرت سے اسکو سیہ خانہ کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ لیلیٰ کا رنگ کالا بیان کیا جاتا ہے اس اعتبار سے بھی اس کا گھر سیہ خانہ ہونا چاہئے تیسری رعایت یہ ہے کہ لیلیٰ ہمیشہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق		نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

فرماتے ہیں۔ دنیا کی شادی و غم دونوں بے اصل ہیں۔ علاوہ ازیں نگاہ عارف میں نہ شادی کی کوئی وقعت نہ غم کی کوئی حقیقت گھر کی رونق کے لئے البتہ انجمن آرائی کی ضرورت ہے۔ محفل نشاط ہو یا بزم ماتم۔ لوگ دونوں صورتوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ		گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

میرزا صاحب اس شعر میں ان لوگوں کو خطاب کرکے کہتے ہیں جو میرزا کے کلام کو مہمل یا دشوار کہتے تھے۔ مطلب ہے۔ اگر کوئی ناقدرداں کچھ صلہ یا انعام دینا چاہتا تھا تو نہ دے یا کوئی سخن ناشناس تحسین و آفرین کرتا تھا تو نہ کرے۔

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو		نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

فرماتے ہیں حسینوں کی صحبت میں جو ایک دم بھر کے واسطے ناپائدار خوشی حاصل ہو جاتی ہے اے غالب اسی کو غنیمت سمجھو۔ اگر اس کو قیام نہیں ہے نہ سہی۔

غزل

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے		کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

فرماتے ہیں۔ اس خوشی کے ساتھ قتل ہونے کے لئے ہم جلاد کے آگے آگے مقتل کی طرف دوڑے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ ہمارے پاؤں جو شوق قتل میں جلد جلد بڑھ رہے ہیں ہمارے سر کا سایہ ان سے بھی دو قدم آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے۔ آفتاب پشت کی جانب واقع ہو تو سایہ آگے کی طرف بڑھتا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت		فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

فرماتے ہیں مجھ کو خراب بادۂ الفت لکھنا چاہا تھا مگر قلم مست مدہوش ہو کر تھم گیا اور بادۂ الفت نہ لکھ سکا یعنی خراب بادۂ الفت کا جملہ ناتمام رہ گیا اور اسی وجہ سے میں نرا خراب ہی ہو گیا یہاں اس

جملہ کی ناتمامی نے عجیب لطف پیدا کر دیا اور اکثر کسی حالت کی ناتمامی کا بیان زیادہ لطف خیز ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس حالت کے تمام ہو جانے کے۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے

فرماتے ہیں۔ دنیا کے الم و غم نے سارے نشے ہرن کر دیئے ورنہ ہم بھی غم عشق کی لذتوں کے لطف اٹھایا کرتے تھے۔

خدا کے واسطے داد اس جنون عشق کی دینا
کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

فرماتے ہیں۔ خط لکھ کر اس کے جواب کا دل میں ایسا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم نامہ بر سے بھی پہلے معشوق کے دروازہ پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے

تیرے آگے آئے ایک قسم کا کوسنا ہے۔ عورتیں اس محل پر تیرے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے بولتی ہیں میرزا فرماتے ہیں اے طرہ ہائے پرخم معشوق یہ عمر بھر جو ہم نے تمہاری وجہ سے پریشانیاں اٹھائی ہیں یہ تمہارے آگے آئے یعنی خدا تم کو ہمارے تکلیف دینے کا بدلہ دے۔

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

فرماتے ہیں ہم جس کو سانس سمجھ رہے تھے وہ ایک موج خون کی پرافشانی ہے مطلب یہ ہے کہ غم نے دل و جگر کو لہو کر دیا ہے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

فرماتے ہیں۔ یا تو اسقدر محبت اور ایسا اتحاد تھا کہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے یا اب ایسی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ جنازہ پر آنے سے بھی صاف انکار کیا جاتا ہے۔

غزل

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ شکوہ کے نام سے اس کو ایسی نفرت ہو گئی ہے کہ اگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو (شکوہ سے نفرت ہو گئی ہے) تو اس بیان کو بھی وہ گلا سمجھتا ہے یعنی یہ بیان بھی داخل شکوہ سمجھا جاتا ہے

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا   اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

فرماتے ہیں میں شکایت سے ایسا بھرا ہوا ہوں جیسا راگ سے باجا بھرا ہوا ہوتا ہے اور اک ذرا مجھ کو چھیڑ کر دیکھیے کیا ہوتا ہے یعنی میں کسقدر شکایت کرتا ہوں اور کیسے کیسے گلے میری زبان پر آجاتے ہیں چھیڑنا محاورہ میں آغاز گفتگو کو بھی کہتے ہیں اور باجا شروع کرنے کو بھی کہتے ہیں اور ایسے مذاق کو بھی کہتے ہیں جس سے دوسرا آدمی بُرا مانے۔

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو   شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

فرماتے ہیں جس وقت معشوق سے ہم اس کے جور کی شکایت کرتے ہیں۔ باوجودیکہ وہ اپنی کمسنی کی وجہ سے ہماری بات کا پہلو سمجھ نہیں سکتا۔ مگر تاہم یہ حسنِ تلافی قابل دید بلکہ لائق داد ہے کہ وہ جفا پر اور زیادہ اور مستعد ہو جاتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال   سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

فرماتے ہیں عشق کی راہ میں آسمان ستارہ دار اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی آبلہ پا بہت تکلیف سے آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ آسمان کو چرخ مکوکب کہہ کر اس کا آبلہ پا ہونا ثابت کیا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ   کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ زمانے کو ہم سے ایسی ضد پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارا ہر کام برخلاف مدعا ہوا کرتا ہے۔ اگر ہم پہ پہلے ہی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تو ہم اپنے بدخواہ بن جاتے اور ہماری بدخواہی ہماری مدعابراری کی صورت پیدا کر دیتی۔ یعنی ہمارا ہر کام برعکس مدعا ہوتا ہے جب ہم اپنی بربادی کی خواہش کرتے تو نتیجہ اس کا کاربراری ہوتا۔ یہ شعر میرزا کی شوخیِ طبیعت کا ثبوت دے رہا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم   آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

فرماتے ہیں ہم تیرِ ستم کے ایسے شائق ہیں کہ اگر کوئی تیر خطا ہوتا ہے تو ہم دوڑ کر اس تیر کو اٹھا لاتے ہیں اور ناوک افگن کی نظر کر دیتے ہیں۔ کہ لیجیے پھر اسکو دوبارہ لگائیے اور ہم کو ہدف تیر ستم کیے بغیر نہ چھوڑیے۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

فرماتے ہیں: تو وہ کیفیت تھی کہ میرا نالہ سات آسمانوں سے گزر کر باب اجابت پر پہنچتا تھا یا اب ضعف و نقاہت سے یہ حالت ہے کہ جو نالہ بہت ہی رسا ہوتا ہے وہ لب تک آجاتا ہے۔ ورنہ ایسا ویسا نالہ تو سینہ ہی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

قطعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

باربد ایک مشہور گویّے کا نام ہے۔ فرماتے ہیں۔ میرا قلم وہ کہ بزم سخن کا ایک باربد ہے۔ بادشاہ کی مدح میں اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے۔ یعنی

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

اے شہنشاہ گویا ستارے تیری سپاہ ہیں اور مہر تیرا علم ہے تو ایسا بڑا بادشاہ ہے تیری مہربانیوں کا حق کس شخص سے ادا ہو سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ اگر ساتوں اقلیموں کا حاصل جمع کر لیا جائے تو وہ تیرے لشکر کا گویا نعل بہا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ چاند ہر مہینہ میں جو بدر بن جانے کے بعد کاہیدہ ہوتے ہوتے ہلال کی صورت پکڑتا ہے یہ تیرے در پر ناصیہ سائی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

فرماتے ہیں میں جو آئین غزلخوانی کو توڑ کر تیرا مدح سرا ہو جاتا ہوں یہ تیرے کرم کی وجہ سے ہے۔ یعنی تیرا کرم ذوق مدح سرائی بڑھاتا رہتا ہے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب میری نواہائے تلخ کو سن کر تو بے مزا اور بے لطف نہ ہو

یہ عذر کے سبب سے ہے یعنی آج میرے دل میں درد کسی قدر زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لئے میری زبان سے پُر درد شعر نکل رہے ہیں۔

غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

فرماتے ہیں میری ہر بات کو سُن کر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تیری کیا حقیقت ہے یعنی مجھ کو آپ بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں۔ آپ یہ تو بتلائیے کہ یہ گفتگو کا طریقہ کیا ہے۔

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں ادا
کوئی بتلائے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اگر اس کی تند خوی کی وجہ سے اسکو شعلہ کہوں تو شعلہ میں یہ کرشمہ و ناز کہاں ہے اور اگر شوخی کے سبب سے اسکو بجلی قرار دوں تو بجلی میں یہ انداز و ادا کہاں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شوخ تند خو درحقیقت ہے کیا۔ کوئی اگر بتا سکتا ہے تو مجھے بتائے کہ وہ کیا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

فرماتے ہیں۔ میں تو اس رشک کی وجہ سے پریشان اور فکر مند رہتا ہوں کہ وہ تم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ وگرنہ مجھے خوف بد آموزی عدو کی کچھ پروا نہیں ہے وہ میری طرف سے تم کو خواہ کتنا ہی بھڑکائے۔ میں اس بات سے نہیں ڈرتا۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

فرماتے ہیں ہمارے سینہ پر لہو کی وجہ سے گریبان چاک ہونے کے بعد چپک کر مل گیا ہے۔ اب اسکو رفو کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس شعر میں خوبی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ لہو نکلنے کا سبب دیوانگی کی وجہ سے خود میرزا صاحب کو معلوم نہیں ہے۔ اس لئے اس کو بیان نہیں کر سکتے خبر نہیں گریبان چاک کرنے کے وقت ناخن سے سینہ پر خراش آگئی ہے یا لڑکوں کا کوئی پتھر خراش کا باعث ہوا ہے یا بے خیالی میں خار مغیلاں جا پڑے ہیں یا خون کے آنسوؤں سے رنگے ہیں۔ یہ سب احتمال تعین نہ کرنے سے زیادہ لطف دے رہے ہیں۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

فرماتے ہیں جہاں جسم جلا ہے وہیں دل بھی جل گیا ہوگا۔ اب جو بیٹھے ہوئے راکھ کریدتے ہو تو تمہیں کیا جستجو ہے۔ کس بات کی تلاش کر رہے ہو۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

فرماتے ہیں ہم اسکو لہو نہیں سمجھتے جو انسان کی رگوں میں دوڑتا پھرے اور باعث حیات سمجھا جائے ہم تو اسکو لہو جانتے ہیں جو کسی پر عاشق ہونے کے بعد آنکھوں سے بہتا ہے وہ لہو ہے

وہ چیز جس کیلئے ہمکو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

فرماتے ہیں بہشت میں سب سے بڑی نعمت شراب ہے اور شراب ہی کے لیے ہم بہشت کو عزیز رکھتے ہیں۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

فرماتے ہیں شراب پینے میں میں اسقدر عالی ظرف واقع ہوا ہوں کہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو سے تو مجھ کو سرور حاصل ہونا ناممکن ہے ہاں اگر دو چار خم موجود ہوں تو میں شراب پیوں۔

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

فرماتے ہیں میں اس ضبط کا انسان تھا کہ آرزو کی آرزو میں جان دیدی اور کبھی حرف آرزو کو لب پر نہ لایا۔ اب تو طاقت گفتار ہی باقی نہ رہی۔ مگر جب قوت گویائی پر قبضہ حاصل تھا اسوقت بھی ناامیدی نے حرف شوق کو کبھی زبان تک نہ آنے دیا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

فرماتے ہیں بادشاہ کی مصاحبت نے غالب کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ اب اتراتا پھرتا ہے ورنہ اس سے پہلے شہر میں اسکو کون جانتا تھا کیا خوب مقطع کہا ہے اور کیسی مرصع غزل لکھی ہے۔

غزل

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

فرماتے ہیں میں ان کو چھیڑوں اور وہ اس کے جواب میں مجھ کو برا بھلا نہ کہیں یہ بڑے تعجب کی

بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسوقت شراب پئے ہوئے نہ تھے۔ بس یہ سمجھ گئے کہ میں انکو چھیڑ رہا ہوں

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ میں تو قہر و بلا کے لئے مخصوص ہو گیا ہوں اور تم بھی سراپا غصہ اور سراپا شوخی ہو کاش میری قسمت میں تم کو لکھ دیا جاتا اور خصوصیت کے ساتھ تم میرے ہو جاتے۔ معشوق کی شوخی و بدمزاجی کی تصویر اپنے شوق و حسرت کے خاکہ کے ساتھ اس خوبی سے کھینچی ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دئیے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اس کثرت سے اگر میری قسمت میں رنج و غم لکھا گیا تھا تو یا رب دل بھی ایک کے بدلے دس عطا فرما دئے ہوتے۔ ایک دل میں اتنا غم سما نہیں سکتا۔ ندرت بیان قابل داد ہے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

فرماتے ہیں۔ اے غالب وہ رفتہ رفتہ ہمارا کہا مان لیتا۔ تم جلدی کر کے مر گئے تمہیں اور کچھ زندہ رہ کر اس کی التجا کرنی تھی۔

غزل

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فرماتے ہیں۔ روز محفل منعقد ہوتی ہے۔ روز غیروں کے ساتھ گلچھرے اڑائے جاتے ہیں اپنے ہاتھ سے بھر بھر کے جام غیروں کو دئے جاتے ہیں ہم پیغام طلبی کے تشنہ لب یعنی محروم رہتے ہیں کبھی ہم کو بھول کر بھی بزم ناز میں نہیں بلایا جاتا۔ الفاظ سے حسرت ٹپکتی ہے۔

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

فرماتے ہیں۔ اپنی تباہی اور بربادی کا گلا ہم کو تم سے نہیں ہے۔ یہ تو اس منحوس آسمان کے ظلم و جور کے ڈھنگ ہیں یہ ظالم رات دن نئے نئے حیلے بہانے تراشتا رہتا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

فرماتے ہیں۔ اگر خط لکھنے کے لئے کوئی نیا مضمون ہاتھ نہ آئے نہ سہی۔ ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں تمہارا نام تو عنوان خط پہ لکھتے ہیں اور مطلب اگر نہیں ہے تو نہ ہو۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم   دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

فرماتے ہیں۔ رات کو چاہ زمزم پر بیٹھ کر شراب پی اور وہ بھی احرام باندھنے کی حالت میں پی کہ جب تمام معاصی کا ترک کر دینا لازمی اور ضروری سمجھا جاتا ہے پھر صبح کے وقت جامۂ احرام کے دھبے جو شراب کے قطرے گرنے سے پڑ گئے تھے دھو کر پاک صاف ہو گئے۔ اس شعر میں رندی اور شوخی کی تصویر کھینچدی ہے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر   یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

فرماتے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے کیا ہمارے دل کو پھنسایا مگر ایسا ثابت ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں بھی تمہارے دام کے حلقے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کی آنکھیں عشاق کو مبتلائے حسن معشوق کرتی ہیں۔ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں عشاق کی حلقۂ دام معشوق ہیں۔

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر   دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے غسل صحت کی خبر گرم ہو رہی ہے دیکھئے کب حمام کی قسمت جاگتی ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

صاف اور سیدھا شعر ہے اور پھر لطف سے خالی نہیں۔

غزل   پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

فرماتے ہیں پھر دوبارہ موسم بہار اس خوش ادائی کے ساتھ آیا ہے کہ مہر و ماہ اسکے تماشائی بنگئے ہیں۔

* * *

قطعہ   دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک   اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

فرماتے ہیں اے خطۂ خاک کے رہنے والو یہ تماشہ دیکھو۔ تمام عالم کو آراستہ کر دینا اسکو کہتے ہیں۔

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر   روکش سطح چرخ مینائی

یعنی زمین پر اس کثرت سے سبزہ و گل پیدا ہو گئے ہیں کہ زمین سطح چرخ مینا رنگ کی مد مقابل بن گئی ہے۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی   بن گیا روئے آب پر کائی

فرماتے ہیں سبزہ نے کثرت سے پیدا ہو کر جب ساری زمین کو گھیر لیا اور اب کہیں اسکی روئیدگی کے لئے زمین پر جگہ باقی نہ رہی تو مجبوری سے پانی کے اوپر کائی کی شکل میں ظاہر ہونا شروع ہو گیا

سبزۂ و گل کے دیکھنے کیلئے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

فرماتے ہیں چشم نرگس کور سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب اس کو باغبان عالم نے بینائی عطا کی ہے تاکہ وہ سبزہ و گل کی کثرت کا تماشہ دیکھے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ۔
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دئے ہیں باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں۔ کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی فضول کام ہے اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہو گا اور باد پیمائی۔ خبر دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جسطرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلیگا کہ آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے (از یادگار غالب)

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہ دیندار نے شفا پائی

فرماتے ہیں۔ اے غالب دنیا یعنی سارے زمانہ کو خوشی کیونکر حاصل نہ ہو۔ دیندار بادشاہ نے مرض سے شفا پائی ہے

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

فرماتے ہیں میں تغافل پسند آدمی ہوں۔ میری طینت میں عجز و انکسار کا مادہ اسقدر زیادہ پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے حق میں بے التفاتی اور بے توجہی کو بہ نسبت التفات و توجہ کے زیادہ پسند کرتا ہوں مجھ سے پہلو تہی کر لی گویا میرے واسطے پہلو میں جگہ خالی کر لی ہے۔ میں اغماض کو اکرام سمجھتا ہوں۔

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا

ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا۔ جو دنیا کو محض ہیچ سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح میخانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانہ میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہلِ ہمت معدوم ہیں (از یادگارِ غالب)

غزل

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

فرماتے ہیں پہلی دشواری و مصیبت تو یہی ہے کہ وہ میری کہانی یعنی میری مصیبت کا حال سنتا ہی نہیں اور پھر اس کے ساتھ دشواری پر دشواری اور مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ میری زبانی کب سنتا ہے۔ الفاظ کی نشست بندش کی چستی۔ بیان کی خوش اسلوبی۔ خیال کی بلندی یہ ساری باتیں اس مطلع میں بہ احسن الوجوہ واقع ہوئی ہیں۔ تعریف سے مستغنی ہے۔

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

فرماتے ہیں غمزۂ خونریز کی کاوشوں کا حال مجھ سے کیا پوچھتا ہے میں کب اس کی خلشوں کو بیان کر سکتا ہوں۔ دل میں زخم، کلیجہ میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ یہ دیکھ لہو کے آنسوؤں سے دریا بہا رہا ہوں

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

فرماتے ہیں مجھ میں کیا وصف ہے کہ جس کو بیان کر کے میرے دوست میرے مر جانے کے بعد روئیں گے۔ مگر میری آشفتہ بیانی ہے۔ شاید اسی کو یاد کر کے روئیں۔ آشفتہ بیانی انکسار کی وجہ سے یہاں کہی گئی ہے۔ حق یہ ہے کہ مرزا صاحب کے بیان کی شوخیاں ایسی اچھوتی اور نرالی ہوتی ہیں کہ کسی شاعر کا بیان ان کے بیان کی خصوصیت کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا بالفتح بمعنی بیابان و دشت۔ فرماتے ہیں صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ دوستوں کے خیال سے نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔

مقابل ہے مقابل میرا   رک گیا دیکھ روانی میری

میرزا صاحب نے اس شعر کی شرح عود ہندی میں تحریر کی ہے۔ فرماتے ہیں تقابل و تضاد کو کون نہ جانیگا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ راحت و رنج و وجود و عدم لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہیں جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے بمفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادت ضد یکدگر ہیں وہ میری روانی دیکھ کر رک گیا۔

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہوا اور ہر شخص آتے جاتے اس پہ پاؤں رکھ کر گذرے یعنی ہوں تو گرانقدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں پس میری گرانی کسقدر ارزاں ہے (از یادگار غالب)

گرد باد رہ بیتابی ہوں   صرصر شوق ہے بانی میری

فرماتے ہیں میں بگولے کی طرح سے بے قرار ہوں اور رہگزر بیتابی کا گرد باد ہوں میری بیتابیوں کی بانی مبانی صرصر شوق ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا   کھل گئی ہیچمدانی میری

فرماتے ہیں۔ اس کا دہن ہیچ ہے۔ اس لئے مجھ پر ظاہر نہ ہوا اور میں اس کو نہیں جانتا تو جو شخص اس کے دہن کو نہ جانے وہ ہیچمدان ہے پس میری ہیچمدانی سب پر ظاہر ہو گئی۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالب   ننگ پیری ہے جوانی میری

فرماتے ہیں۔ اے غالب میں جوانی میں اس درجہ ضعیف و ناتوان ہو گیا ہوں کہ بوڑھے بھی اتنے کمزور اور نحیف نہیں ہوتے۔ میری جوانی ننگ پیری ہے۔

غزل

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

فرماتے ہیں۔ آغوش رقیب میں اس بت طناز کی تصویر اسقدر بدنما اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے کھینچنے کے لئے چاہئے مو قلم پائے طاؤس دست مانی میں ہونا چاہیے مطلب یہ ہے کہ جس

طرح طاؤس کے پر و بال اور اعضائے جسم حسین و خوبصورت مایۂ فخر و ناز واقع ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس کے پاؤں بدرنگ اور بدصورت اس کے حسن و جمال کے لئے موجب ننگ و عار پیدا ہوئے ہیں اسی طرح رقیب ہم آغوشی کی حالت میں اس کی ناز کرنے والی تصویر کی کیفیت ہے۔

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے   غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

فرماتے ہیں تحیر میں خاموشی کا ہونا لازمی اور ضروری ہے اور تو ایسا بدخو ہے کہ میری حیرت اور میری خاموشی کو تماشہ سمجھتا ہے اور غم وہ افسانہ ہے کہ اس کے لئے آشفتہ بیانی اور پریشان گوئی درکار ہے اگر میں حیرت و خاموشی کو دور کرکے غم دل زبان پر لاتا ہوں تو تو بے لطف و بے مزہ ہوتا ہے

وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع   شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

فرماتے ہیں مجھ کو ایسی تپ عشق کی تمنا اور آرزو ہے کہ جس کا شعلہ شمع کی طرح جگر تک دوڑ جانے والا ہو۔

قطعہ گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے   ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

فرماتے ہیں باغ کو تیری صحبت سے مسرور و فیضیاب ہونا اس قدر پسند آیا ہے کہ ہر غنچۂ گل کا کھلنا تیرے شوق میں آغوش کشائی ہے یعنی تجھ سے بغلگیر ہونے کا متمنی ہے۔

واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پہ   یاں نالہ کو اور الٹا دعویٰ رسائی ہے

فرماتے ہیں ان کا کنگرۂ استغنا دن دونا رات چوگنا بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور ہمارا نالہ دن بدن پست ہوتا جاتا ہے یعنی اب تو دل سے چل کر لب تک بھی نہیں آتا سینہ ہی میں ہمت ہار کر رہ جاتا ہے۔

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے   جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

فرماتے ہیں غم عشق مجھ کو ضبط کی تعلیم کر رہا ہے۔ دل میں جو نیا داغ پڑتا ہے وہ اس استاد یعنی غم عشق کی چشم نمائی کا کام دیتا ہے۔

غزل جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

فرماتے ہیں کہ ایسا زخم جس میں ٹانکے دئے جا سکیں اور جس کے مندمل ہونے کی امید کی جا سکے وہ مجھ کو درکار نہیں ہے۔ دشمن کی قسمت میں اس زخم کو لکھ دینا یا رب میں تو ایسے زخم کا خواہشمند

ہوں کہ جسے دیکھ کر چارہ گر بھی علاج سے دست بردار ہو جائے۔

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصوّر　دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ تو نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے یہ معنی پیدا کر دئے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں۔ اس لئے دوست کے سر انگشت حنائی کے تصوّر کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے (از یادگار غالب)

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے　یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی یعنی کم ظرفی۔ یاں سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے ظلم و جور سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے۔ کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔ (از یادگار غالب)

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو　خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہے گلو کی

فرماتے ہیں چھری نے کبھی جگر کو منہ نہ لگایا ہو یعنی اس پر التفات نہ کیا ہو اور خنجر نے کبھی گلو کی بات بھی نہ پوچھی ہو یعنی توجہ نہ کی ہو۔ دشنہ و خنجر سے ناز و انداز و ظلم و بیداد معشوق مراد ہے۔

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب　حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

فرماتے ہیں۔ اے غالب اس ناکام تمنا کی حالت قابل افسوس ہے کہ جو برسوں سے ایک بت عربدہ جو کی تمنا میں زندگی بسر کر رہا ہو۔

قطعہ　سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم　حیراں کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کے

پشت گرمی یعنی پشتیبانی و اعانت۔ فرماتے ہیں جسطرح سیماب یعنی پارے کی قلعی سے آئینہ روشن ہو کر صورت حیرت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح ہم کو دل بیتاب نے سراپا حیرت بنا رکھا ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ پارے کی قلعی سے عکس پذیر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیتا ہے اسی طرح عاشق دل بیتاب کے ذریعے سے معشوق کے جلوہ سے فیضیاب ہونے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

فرماتے ہیں پھول کا کھلنا۔ گلے ملنے کے لیے ہاتھوں کا پھیلانا ہے اے بلبل جلد آ کر معانقہ رخصت کر لے کہ بہار کے دن صبح شام ہی میں جانے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و راحت کا زمانہ دنیا میں بہت ہی قلیل ہے جسطرح بہار ادھر آتی ہے ادھر رخصت ہو جاتی ہے۔

قطعہ ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں   معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

فرماتے ہیں۔ اگر معشوق کے مزاج میں خودداری اور تمکین ہے اور عاشق کی طبیعت میں صبر و ضبط کا مادہ ہے تو عین وصل میں بھی فراق کی طرح بے لطفی نصیب ہوگی۔ مزا اس میں ہے کہ معشوق شوخ و بیباک اور عاشق دیوانہ و مست ہو۔ کہ وصل میں کامیابی کے ساتھ لطف زندگی حاصل کر سکے

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں   شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے

فرماتے ہیں کبھی تو اس کے لبوں کا بوسہ مل ہی جائیگا۔ ہاں اس کے واسطے شوق حد سے بڑھا ہوا اور جرأت رندانہ درکار ہے۔

غزل چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے   یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

فرماتے ہیں۔ اگر دنیا میں کسی سے محبت ہو تو وہ حسینوں سے ہو۔ اور اگر یہ لوگ خود بھی کسی کو چاہیں تو پھر کسی اور نعمت کی ضرورت ہی باقی نہیں ہے۔

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر   جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

فرماتے ہیں۔ رندوں کی صحبت سے حذر واجب و لازم ہے۔ بجائے شراب کھینچنے کے شراب سے اپنے کو کھینچنا چاہیے یعنی رندوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے اور مے پینے سے احتراز لازم ہے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل   بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

فرماتے ہیں تیرے چاہنے کو دل نے کیا سمجھا تھا یعنی کھیل سمجھا تھا۔ سہل سمجھا تھا۔ کیا سمجھا تھا اب اس نابکار دل سے ذرا سمجھو اس چاہت کا بدلہ لینا چاہیے مطلب یہ ہے کہ ضبط عشق اور صدمۂ فراق کی تاب و طاقت نہ تھی تو کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل   کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاک گریبان سے عموماً تشبیہ دیجاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر ایک کام تدبیر کی ہدایت سے کرنا چاہیے پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان چاک مت کر۔ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے (از یادگار غالب)

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

فرماتے ہیں۔ تم جو ہم سے بیگانہ وار پردہ کرتے ہو اور منہ چھپا لیتے ہو اس پردہ میں لگاوٹ جھلک کھاتی ہے اور دیکھنے والوں کو شبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دینا چاہیے میرزا صاحب اس چال سے اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو   کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

فرماتے ہیں۔ میری دشمنی میں غیر نے اپنے کو مٹا دیا۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ میرا کس درجہ دشمن ہے۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی   یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

فرماتے ہیں ہم اپنی سعی کوشش سے اپنے کو رسوا بھی نہیں کر سکتے۔ ہماری بدنامی بھی اسی کی ہنگامہ آرائی پر منحصر ہے یعنی وہ جس کو چاہے ذرا سی اپنی جھلک دکھا کر مضطرب بیتاب بنا دے اور یہ اضطراب وبیتابی بدنامی و رسوائی کا باعث بن جائے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

فرماتے ہیں جس شخص کی امید کا حصر مرنے پر ہو اسکو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس درجہ کس حد تک ناامید ہو چکا ہے۔ بالکل نیا اور اچھوتا مضمون ہے اور اس خوبی کیساتھ نظم کیا ہے کہ توصیف سے مستغنی ہے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

فرماتے ہیں۔ اے غافل ان مہ جبینوں کے لئے چاہنے والا بھی خوبصورت اور وضعدار ہونا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

فرماتے ہیں۔ اور تماشہ دیکھئے حضرت اسد بھی حسینوں کی چاہت کا دعویٰ کرتے ہیں ذرا

آپ کی صورت تو ملاحظہ فرمائیے یعنی ایسی بھونڈی صورت پر کوئی خوش رو معشوق کب التفات کرتا ہے

غزل

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

فرماتے ہیں میں جسقدر آگے بڑھتا جاتا ہوں اتنی ہی منزل مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس چال سے میں بیابان طے کر رہا ہوں اسی چال سے بیابان بھی میرے آگے آگے بھاگتا جاتا ہے

درسِ عنوانِ تماشا بتغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

فرماتے ہیں دنیا کے تماشہ سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے یعنی اچٹتی ہوئی نگاہ سے آغاز تماشے کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کے لئے کافی ہے اس لئے میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ میں ایسا تغافل پسند ہوں کہ میری نظر بھی آنکھ کے پردہ سے باہر نہیں نکلتی اور دنیا کی نیرنگیوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ فراق کی راتوں میں میرا سایہ میری آتش دل سے رم کر کے اس طرح بھاگ جاتا تھا جس طرح آگ سے دھواں بھاگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شب تنہائی میں میرا سایہ بھی میرا ساتھ نہ دیتا تھا وہ بھی مجھ کو تنہا چھوڑ جاتا تھا۔

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کسقدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ خدا ایسا نہ کرے کہ عاشقوں کا غم خوبرو معشوقوں کو سادگی کی تعلیم دے اور یہ لوگ ان کے سوگ میں زینت و آرائش ترک کر دیں۔ ایک میرے ہی مر جانے سے کسقدر خانۂ آئینہ ویران ہو گیا ہے کہ اب اس میں حسن کا جلوہ نظر ہی نہیں آتا۔ یعنی میرے ماتم میں معشوقوں نے آئینہ دیکھنا اور بناؤ سنگھار کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ صحرا نوردی میں میرے پاؤں کے چھالے پھوٹ گئے ہیں خون ان سے جادۂ صحرائے جنوں پر ٹپکا ہے۔ وہ جادہ رشتۂ گوہر کی طرح چراغاں بن گیا ہے۔

بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو   پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

فرماتے ہیں، خدا ایسا کرے کہ میری بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جائے۔ سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے بھرا ہوا ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ بیخودی کے عالم میں راحت و آرام سے میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر پڑا رہوں۔ کہیں خدا ایسا کرے۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے   ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے

فرماتے ہیں۔ تو اگر شوق دیدار کی حالت میں میرا سر کاٹ بھی ڈالے تو میری نگاہیں گل کی طرح نکل کر چاروں طرف تیری جستجو میں پھیل جائیں۔ جس طرح شمع کا گل کتر دینے کے بعد اسکا شعلہ زیادہ روشن ہو کر روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔

بیکسی ہائے شب ہجر کی وحشت ہے ہے   سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

فرماتے ہیں شب غم کی اُداسی اور بیکسی سے میرا سایہ مجھ سے وحشت کر کے ایسا بھاگا اور اسقدر دُور کہ آفتاب قیامت میں جا کر چھپ گیا۔ باوجودیکہ آفتاب سے سایہ بھاگ جاتا ہے۔ لیکن میرا سایہ مجھ سے ایسا گریزاں ہوا کہ آفتاب حشر میں جا کر پنہاں ہو گیا۔

گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے   آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فرماتے ہیں تیرا جلوۂ رنگیں اس بزم میں ساغر شراب کی گردش کا کام دے رہا ہے یعنی وہ بھی شراب تند کی طرح ہوش ربا ثابت ہوا ہے اور میرا دیدۂ حیران آئینہ داری کا نمونہ دکھا رہا ہے، مطلب ہے کہ تیرے حُسن سے لوگ مدہوش ہو رہے ہیں اور میرے عشق کو دیکھ کر انسان حیرت میں مبتلا ہے۔

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد   ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

فرماتے ہیں اے اسد میں جو فراق یار میں باغ کی سیر کو گیا ہوں تو میرے جسم میں آگ لگ گئی ہے اور پھولوں کو دیکھ کر میری آنکھوں سے ایسے شعلے نکلے ہیں کہ جن سے جل کر خس و خاشاک گلستاں چراغاں بن گئے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے   کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے   غزل

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ نکتہ چیں ہے۔ بن نہیں پڑتی کہ غمِ دل اسکو سنایا جائے یعنی وہ ایک ایک لفظ کی گرفت کریگا اور پھر اعتراض جڑیگا۔ بات کیا بنے جہاں بات بنائے نہ بنے۔ بات بنانی جھوٹ بولنا۔ مطلب ہے کہ اس کی نکتہ چینی کیوجہ سے ذرا جھوٹ اس پر ظاہر ہو جائیگا اور بات بگڑ جائیگی۔

میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل   اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

فرماتے ہیں میں اسکو بلاتا تو ہوں لیکن یہ امید نہیں ہے کہ میرے بلانے سے چلا آئیگا۔ اے جذبِ دل تو اگر کچھ مدد کرے اور ایسی کشش اس پر ڈالے کہ بغیر آئے اسکو بن نہ پڑے تو وہ آسکتا ہے۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے   کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ وہ ستم و جور کو بھی کھیل سمجھ کر برتتا ہے۔ اس سے مجھ کو یہ خوف ہے کہ وہ ظلم کو چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے۔ کاش ایسا ہی ہو کہ بغیر میرے ستائے اس کو چین نہ آئے اور ہر روز پابندی کے ساتھ ستاتا رہے۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر   کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

فرماتے ہیں میرا رقیب اس طرح تیرے خط کو ہر جگہ لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ یہ کیا چیز تیرے ہاتھ میں ہے تو وہ اسکو چھپا بھی نہیں سکتا۔ مطلب ہے کہ رقیب ایک دن تجھ کو رسوا کرکے رہیگا۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا   ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ ان کو کمال نازکی نے اس قابل نہیں رکھا کہ گر وہ کسی مشتاق کے ہتھے چڑھ جائیں تو کوئی مشتاق وصل کامیابی حاصل کر سکے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

فرماتے ہیں یہ کون بتا سکتا ہے کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے۔ عالم امکان کو اس نے پیدا کرکے ایک پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ پردہ کسی کے اٹھانے سے اٹھ ہی نہیں سکتا۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے   تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

فرماتے ہیں۔ موت کی میں کیوں راہ دیکھوں۔ اس کا آنا تو لازمی ہے۔ وہ بغیر انتظار کے بھی اپنے وقت معین پر آ کر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو تمہارا بلانا بھی ممکن نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

دونوں مصرعوں میں اپنی مشکلات کا بیان کیا ہے۔ شعر صاف اور سیدھا ہے اور نہایت بلیغ

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فرماتے ہیں عشق پر کسی کا قابو نہیں چل سکتا۔ اے غالبؔ وہ آگ ہے کہ نہ ارادہ کے ساتھ لگائی جا سکتی ہے یعنی اگر ہم یہ چاہیں کہ معشوق کے دل میں بھی اس عشق کی آگ کو بھڑکا دیں تو یہ بھی ممکن نہیں اور اگر یہ چاہیں کہ اپنی لگی کو بجھا دیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

غزل

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کی مانند زخم دل گریبانی کرے

فرماتے ہیں۔ اگر وحشت دل عریانی کی حالت میں گریبان چاک کرنے کی خواہش کرے تو یقین کامل ہے کہ صبح کی طرح میرا زخم دل بھی گریبان بن کر چاک ہو جائے۔

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

فرماتے ہیں۔ تیرے جلوہ کا وہ عالم ہے کہ اگر اس کا خیال بھی آ جائے تو دیدۂ دل کو حیرانی پیدا ہو جائے۔ اسی مقام کی بابت حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

ہے شکستن سے بھی دل نومید یا رب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرض گراں جانی کرے

فرماتے ہیں ہم کب تک بیٹھے ہوئے اس آرزو میں خیالی پلاؤ پکایا کریں کہ ہمارا معشوق سنگدل ایک نہ ایک دن ضرور ہمارے شیشۂ دل کو سنگ جفا سے توڑے گا۔ ہمیں اس سے بھی ناامیدی ہے کہ وہ ہماری دل شکنی پر متوجہ ہو گا۔

میکدہ گر چشم مست ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

فرماتے ہیں۔ اگر میکدہ کو اس کی چشمِ مستِ ناز توڑ ڈالے تو شیشۂ شراب میں جو بال پڑے ہیں وہ دیدۂ ساغر کے واسطے پلکیں بن جائیں اور ساغرِ شراب اس آنکھ سے اس چشمِ مستِ شرابِ ناز کو دیکھ کر حیران ہو جائے۔

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

فرماتے ہیں خطِ عارض جو اس کے رخساروں پر ظاہر ہوا ہے۔ یہ دراصل خطِ عارض نہیں ہے بلکہ میری محبت نے اس کی زلفوں کو یہ عہد نامہ لکھ دیا ہے کہ جو کچھ میرے بارے میں پریشانی کو کرنا ہو، کرے۔ سر تا سر مجھے منظور ہے۔

غزل

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

فرماتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ خواب میں آ کر تسکینِ اضطراب دے جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ میری تپشِ دل مجھ کو سونے کی اجازت دیدے۔ یہ ظالم یعنی میری تپشِ دل اس ستمگر سے زیادہ ظلم ڈھانے والی ہے۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

فرماتے ہیں۔ لگاوٹ سے تیرا رو دینا قتل کر دیتا ہے۔ تیری آنکھوں کے آنسو شمشیرِ نظر میں وہ آبداری پیدا کر دیتے ہیں کہ میں تو ان کو دیکھتے ہی قتل ہو جاتا ہوں۔ لفظ (تو) نے یہاں یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ تیری طرح دوسرے معشوقانِ ستمگر تیغِ نگاہ کو اس طرح کی آبداری دینی جانتے ہی نہیں۔

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

فرماتے ہیں جنبشِ لب ہی سے تلوار کا کام لے اور ہم کو قتل کر دے۔ ہم طالبِ بوسہ ہیں۔ اگر بوسہ دینا منظور نہیں ہے تو صاف جواب دیدے یعنی بوسہ دینے سے انکار کر دے۔ ہم قتل ہو جائیں گے۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

فرماتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر تجھ کو یہ خیال ہے کہ میرا پیالہ نجس ہو جائے گا تو نہ دے۔ ہم شراب کے طالب ہیں ہم کو اوک سے پلا دے۔ شعر رندانہ ہے مگر کیا خوب کہا ہے۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

فرماتے ہیں۔ اے اسدؔ فرطِ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جب میں نے اس کی زبان سے یہ سنا کہ ذرا میرے پاؤں دبا دے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے قدموں تک میرے ہاتھوں کا پہنچنا اس بات کی دلیل ہے کہ خوش نصیبی سے تمنا پوری ہونے کا زمانہ قریب آگیا۔

غزل

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ میرے تڑپنے سے بچھونے کا ایک ایک تار تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے میرا سر تکیہ کے واسطے ایک عذاب بن گیا ہے اور میرا جسم بستر کے لئے آفت ہو گیا ہے۔

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ میرا آنسو دامن کی آنکھ کا تارہ ہے اور میرا دل بیمار بستر مرض کا فرزند دلبند ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کثرتِ گریہ کی وجہ سے دامن کو آنسو سے اُنس پیدا ہو گیا ہے اور بستر رنجوری کو میرے دل بیمار سے دل بستگی پیدا ہو گئی ہے۔

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ میرا مرض بڑا اقبال مند ہے کہ تم سا پری پیکر اور مغرور میری عیادت کے لئے آیا ہے۔ تمہارے قدم رنجہ کرنے سے شمع بالیں کی روشنی طالع بیدار بستر بن گئی ہے۔ مطلب یہ کہ میری بیماری ذریعہ خوش نصیبی ہے کہ تم میری عیادت کے لئے آئے ہو۔

بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ شب فراق میں اسقدر اضطراب ہے اور اس درجہ تاریکی ہے کہ ہر ایک تار بستر آفتاب صبح حشر کی کرن بن گیا ہے یعنی ہر ایک سفید تار اس اندھیری رات میں اسطرح چمک رہا ہے جس طرح سورج کی کرنیں چمکتی ہیں۔ مگر یہ شعاع آفتاب حشر کی شعاع ہے اسلئے کہ جوش اضطراب واقعہ ہوا ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

فرماتے ہیں۔ ابھی تک تکیہ سے اس کی زلف مشکیں کی بو آ رہی ہے یعنی رات ہی کا تو واقعہ ہے کہ اس محل

نصیب ہوتا تھا۔ زلیخا کی طرح حضرت یوسف کو دیدۂ یعقوب میں جو تنہا ہے کے باعث تنگ و بے رنگ کیوں سمجھے وہ جب ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب　　کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

فرماتے ہیں اے غالب میں کیا بیان کروں کہ ہجرِ یار میں میرے دل کی کیا حالت ہے مختصر یہ ہے کہ تڑپتے تڑپتے میرے بستر میں اس قدر سلوٹیں پڑ گئی ہیں کہ ایک ایک تارِ بستر چبھنے کے لیے خارِ بستر بن گیا ہے

قطعہ　**خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے　　غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے**

رگِ گردن۔ کہ وہ غرور اور غیظ و غضب کی حالت میں پھول جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں معشوق کو میری دوستی پر اس قدر غرور ہے کہ مجھ کو یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہیں خدانخواستہ رشتۂ محبت رگِ گردن ہو جائے یعنی محبت دشمنی نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب　　اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فرماتے ہیں اے غالب اس بہار میں نشو و نما کی کوتاہی سمجھنی چاہیے۔ اگر گلاب کی بیل بڑھ کر اور پھیل کر سرو کے قامت پر پیچ ہو کر پیراہن نہ بن جائے۔ ندرتِ خیال و بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے

غزل　**فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　نالہ پابندِ نے نہیں ہے**

فرماتے ہیں۔ فریاد کے لیے کسی لے کی احتیاج نہیں ہے۔ یعنی بے ساختگی میں تصنع کو دخل نہیں ہے۔ نالۂ دل لے کا پابند نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آہِ دل میں جو اثر ہوتا ہے وہ بناوٹ کی فریاد و زاری میں نہیں ہوتا۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے　　گر باغ گدائے مے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ باغبان تونبوں کی بیلیں کس لئے باغ میں بوتے ہیں اگر ان سے کشتیاں بنانا مقصود نہیں ہوتا۔ اس کوشش سے ثابت ہے کہ باغ بھی گدائے شراب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سبزہ و گل کی سیر کا لطف شراب پی کر خوب حاصل ہوتا ہے۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے　　پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ ہر شے میں تیرا ظہورِ قدرت جلوہ نما ہے۔ مگر تیری سی کوئی چیز دنیا میں پیدا نہیں ہوئی یعنی تو جسمانی تشبیہ سے منزہ ہے۔ شعر تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے

اور نہایت خوب ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ ہاں خبردار کہیں ہستی کا دھوکہ نہ کھانا ہر چند لوگ کہیں کہ ہستی ہے۔ مگر تو یہی سمجھنا کہ نہیں ہے۔

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

فرماتے ہیں خوشی سے دست کش ہو جا پھر تجھے غم نہ ہوگا یعنی اگر تو بہار کے موسم سے لطف نشاط حاصل نہ کریگا۔ تو غم خزاں سے کیوں ملول و رنجیدہ ہوگا۔ اُردی بہار کا مہینہ ہے اور دے خزاں کا

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے۔ اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے۔ بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کی قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے (از یادگار غالب) شعر رندانہ ہے مگر خوب کہا ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب۔ تو جو یہ کہتا ہے کہ نہ کچھ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ یہ تو ہمیں بتا آخر تو کیا (اے نہیں ہے) مطلب یہ ہے کہ لفظ (نہیں ہے) کو اسم قرار دے لیا ہے۔ کہتے ہیں۔ اے حضرت نہیں ہے۔ نہ تو آپ ہستی محض ہیں واجب الوجود کی مانند نہ آپ عدم بحت ہیں۔ ممتنع کی طرح اس صورت میں لازم ہے کہ جناب کا اسم گرامی (نہیں ہے) رکھ دینا چاہئے۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

فرماتے ہیں۔ زخم دل کے لئے جو مرہم کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے وہ نہ پوچھو۔ اس لئے کہ اس نسخہ میں دواؤں کا جزو اعظم ہیرے کی کنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زخم دل کے واسطے اس مرہم کا استعمال لازم ہے جس سے زخم دن دونا رات چوگنا بڑھتا چلا جائے۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

فرماتے ہیں۔ بہت دنوں کے بعد تیرے تغافل نے ایک نگہ پیدا کی ہے جو دیکھنے میں نگاہ سے کم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو صرف تغافل یعنی ادائے چشم پوشی کرتے تھے۔ مگر اب اس ادا کو چھوڑ کر ادائے التفات برتنی شروع کی ہے۔ یعنی پہلے تو میری طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ اب دیکھ لیتے ہیں۔ مگر ایک اچٹتی ہوئی نظر سے

قطعہ
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ ہم کو ان کے عشق میں اپنی ذات سے بھی رشک پیدا ہو گیا ہے اس لئے جان دینی قبول کر لی ہے۔ مگر ان کی تمنا سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ یعنی تمنا کرینگے تو وہ آئینگے یا ہم کو وہاں بلائیں گے اور ان دونوں صورتوں میں آنکھیں ان کو دیکھیں گی۔ ہم کو رشک آئیگا۔ ہاتھ ان کے ہاتھ سے ملیگا۔ ہم جلینگے۔ قدم ان کے کوچہ کی زمین پر پڑیں گے۔ ہم کو حسد پیدا ہو جائے گا اس لئے ہم نے ان کی تمنا ہی کو چھوڑ دیا۔

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

فرماتے ہیں۔ انہیں تو غیر سے پردہ میں محبت ملی ہے۔ یہ جو انہوں نے اس سے پردہ کی رسم موقوف کر دی ہے یہ اپنی محبت کے چھپانے کی غرض سے ہے یعنی اگر وہ پردہ کرنے کی حالت میں چھپ چھپ کر اس سے ملتے تو رسوا اور بدنام ہو جاتے اب اس کے سامنے ہوتے ہیں تو محبت پوشیدہ ہی رہتی

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

فرماتے ہیں غالب تمہارا عاشق صادق تھا۔ جب تم اسکو برا کہتے ہو تو رقیب بوالہوس ان باتوں سے شکستہ دل ہو کر نا امید ہو جائیگا۔

غزل
کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

فرماتے ہیں۔ شراب تیرے سرخ ہونٹوں سے شوخیِ رنگ حاصل کرنی چاہتی تھی۔ جام پر جو خط پڑا ہوا ہے یہ گویا گلچیں کی تاک نظر ہے جو تیرے پھول سے لبوں کو چن رہا ہے۔

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

قاعدہ ہے سودا ۔ اور جنون کی حالت میں نیند آنی موقوف ہوجاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کبھی تو میرے سر شوریدہ کا بھی التفات ہوجائے۔ کہ یہ برسوں سے تکیہ کی حسرت میں مبتلا ہے مطلب ہے کہ وصل میں سودائے عشق کو کمی ہوکر تکیہ سے آشنا ہوجائیگا اور نیند بھی آجائے گی۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبل زار　　کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے

فرماتے ہیں۔ اگر پھول بلبل زار کے نالے نہیں سن سکتا تو معذور ہے۔ اس لئے کہ گوش گل شبنم کے قطروں سے بند ہوگیا ہے۔ گویا اس نے کان میں روئی ٹھونس لی ہے۔ اب کیا خاک نالۂ بلبل سن سکتا ہے۔

اسد ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا　　مقام ترک حجاب و وداع تمکیں ہے

فرماتے ہیں۔ اسد نزع کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اے بیوفا خدا کے واسطے اسکے پاس چل یہ ایسا ہی وقت ہے کہ جبکہ شرم و حجاب کو ترک کر دینا اور تمکین و وقار کو رخصت کر دینا چاہیئے۔

کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو　　یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

فرماتے ہیں حسینوں کی آنکھ محو تغافل کیوں نہ ہو۔ ضرور محو تغافل ہونی چاہیئے۔ اس بیمار یعنی حسینوں کی آنکھ کو نظارہ سے پرہیز ہے۔ چشم بیمار چشم معشوق کی صفت ہے۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی　　وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

فرماتے ہیں دم نکلتے نکلتے بھی حسرت دیدار پوری نہ ہوسکے گی۔ ہائے ناکامی کاش ایسا ہوتا کہ اس کافر کا خنجر کند ہوتا دشواری سے رک رک کر گلا کٹتا اور حسرت دیدار تمام و کمال پوری ہوجاتی۔

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد　　جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

فرماتے ہیں۔ پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اے اسد ہم کو اپنے دوست کے عارض گل رنگ یاد آگئے۔ فصل بہاراں جوش اشتیاق پیدا کرنے والی ہے۔

غزل

دیا ہے دل اگر اسکو بشر ہے کیا کہیئے　　ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ اگر نامہ بر بھی اس کے حسن دلکش پر فریفتہ ہوگیا اور بوجہ بشریت کے اپنا دل ہارے

معشوق کو دے بیٹھا تو اس میں وہ بے خطا ہے۔ اس کو الزام نہ دینا چاہئے۔ ہمارے معشوق کا حسن دلکش ہی ایسا غضب کا ہے کہ جو شخص اسکو دیکھ لیتا ہے ہمارا رقیب بن جاتا ہے۔ اس امر میں نامہ بر کی کوئی خطا نہیں۔ عجیب دلکش مطلع لکھا ہے۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں موت کا آنا تو لازمی اور ضروری امر ہے کسی نہ کسی روز کمبخت بے بلائے آدھمکیگی مگر اسکو ہم سے یہ ضد آ پڑی ہے کہ آج شبِ فراق میں ہمارے بلانے سے نہیں آتی۔ زندگی بھر ہم کو اس سے یہ شکایت رہے گی۔

رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں وقت بیوقت جب ہم نے رقیب کو دیکھا ہے۔ کوچۂ یار ہی میں پایا ہے۔ اب ہم کیونکر نہ کہیں کہ کوئے دوست اس کا گھر بن گئی ہے۔ اندھیرے اُجالے ہر وقت وہیں پڑا ہوا ملتا ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں اس کے ہر انداز ہر ایک ادا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے دل کے حال سے وہ خبردار اور واقف ہے پھر اس سے حالِ دل کہنے کی کیا ضرورت باقی رہی۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ وہ ادا شناس یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ کہ میرزا صاحب اپنی وضعداری کے سبب رستے میں مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے جھینپینگے اور جواب میں فرمائینگے کہ یہاں بات چیت کرنے کا موقع نہیں ہے۔ سرِ بازار مجھ سے دریافت کرتا ہے۔ فرمائیے آپ کا کیا حال ہے۔

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ تم کو رشتۂ وفا کا مطلق خیال نہیں ہے تم اس کے راز کو بالکل بھولے بیٹھے ہو جب جتاؤ تو ہماری مٹھی میں کیا چیز ہے۔ ندرتِ بیان و طرفگیِ خیال اس شعر میں یہ واقع ہوئی ہے کہ غیر محسوس شئے کو محسوس چیز قرار دیا ہے اور [illegible] ہے کہ پہلے اسکا نام بھی لیا ہے اور باوجود [illegible]

کے پھر یہ کہتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر تم بتاؤ کیا ہے۔ تم کو تو رشتہ وفا کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیئے

فرماتے ہیں۔ وہ شوخ مجھ پر اور میرے سوال پر نظر کر کے یہ سمجھا ہے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے جو مجھ سے ایسا دور از عقل سوال کرتا ہے اور مجھکو جواب سے قطع امید ہے میں سوال کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں رکھتا کہ مجھے میرے سوال کا جواب عنایت فرمائے یہ بندش اور ترکیب بیان اور برجستگی کے ساتھ دونوں مصرعوں کا دولخت ہونا کس کو نصیب ہوتا ہے۔

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیئے

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کمال سخن کے لئے حسد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ مجبوری ہے کیا کیا جائے اور متاع ہنر کی قیمت ستم روزگار ہے کیا شکایت کیجائے۔ دونوں شعر بیت الغزل ہیں

کہا کسی نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

کسی کا اشارہ معشوق کی طرف ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس نے یہ ارشاد کیا ہے۔ کہ غالب آدمی بُرا نہیں ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ دیوانہ ہے اور اس کی نسبت کیا کہا جا سکتا ہے۔

غزل

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

یہ شعر تصوف میں ہے۔ فرماتے ہیں میں مجرد تھا۔ مجھ کو جسمانیت سے تعلق ہی نہ تھا۔ مگر سرگرم دامن افشانی دیکھ کر مجھ کو میرے تجرد نے قید جسم میں پھنسا دیا اور خود رخصت ہو گیا عریانی سے مراد یہاں بے تعلقی ہے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

فرماتے ہیں میں ایسا سخت جان واقع ہوا ہوں کہ تیغ نگہ یار کے زخم کھاتا ہوں اور زندہ ہوں گویا سنگ فساں ہوں۔ کہ اس پر خواہ کتنی ہی تلوار کو آبدار کرنے کے لئے رگڑو۔ مگر وہ کٹتا نہیں مصرعہ ثانی میں طنزاً کہتے ہیں کہ میری سخت جانی میری جان کے لئے بہت مبارک ہو گئی ہے کہ اس نے مجھ کو تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں بنا دیا ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

فرماتے ہیں۔ اس کی طرف سے بے التفاتی کا اظہار کیونکر نہ ہو۔ اس ظالم کی خاطر جمع ہے یعنی وہ مجھ کو یہ جانتا ہے کہ یہ شخص میرے تصور سے باتیں کیا کرتا ہے اور خیالی پرسشہائے نہانی سے مست ہو رہا ہے۔

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی   لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

فرماتے ہیں۔ روزِ ازل میں کاتبِ تقدیر نے میرے غمخانہ کی قسمت رقم کی تھی اس وقت مجھ کو اپنے گھر کی ویرانی کا سبب قرار دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کی ویرانی میری ہی ذات سے علاقہ رکھتی ہے۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے   اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو خوشنوایانِ چمن کے زمزمے سننے کا شوق ہے۔ اور وہ کافر میرے اس شوق سے بدگمان ہوتا ہے۔ اے کاش مجھ کو یہ شوق نہ ہوتا۔

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا   لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے۔ قبر میں بھی مجھ کو شورِ قیامت نے جگا دیا۔ میں تو نیند بھر کے سونے کی غرض سے اور راحت حاصل کرنے کی غرض سے گور میں گیا تھا۔ بے مثل شعر کہا ہے۔

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے   تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے بالکل نیا پیرائے بیان ہے (از یادگار غالب) بے نظیر شعر کہا ہے۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ   پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

فرماتے ہیں۔ ہاں اے نشاط فصل بہاری تیری کیا بات ہے تیری آمد آمد دیکھ کر پھر مجھ کو سودائے غزلخوانی تازہ ہو گیا ہے یعنی تیری مدد سے سرگرمِ غزلخوانی ہو گیا ہوں۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی   میرزا یوسف ہے، غالب یوسفِ ثانی مجھے

میرزا یوسف میرزا صاحب کے بڑے بھائی تھے جو عنفوان شباب میں دیوانے ہو گئے تھے

یہ مقطع ان کی صحت یابی کی مبارکباد میں لکھا ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی دوبارہ پانے سے دوسرا یوسف مل گیا ہے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے غزل

فارسی محاورہ میں یارب کے معنی خدا سے فریاد کرنے کے ہیں اور سبحۂ زاہد سے ذکر خفی مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ مجھ کو شادی میں بھی شور یارب یاد ہے۔ میرا مسکرانا بھی گویا زاہد کا ذکر خفی ہے مطلب یہ ہے میں کسی حال میں یاد الٰہی سے غافل نہیں رہتا۔

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

فرماتے ہیں جسطرح قفل ابجد حرفوں کے مل جانے سے وا ہو جاتا ہے۔ یعنی جب تک پھر کیوں کو پھرا کر حرفوں سے وہ فقرا نہ بن جائے جسکی ترتیب قایم ہونے سے قفل کھلتا ہے قفل کھل نہیں سکتا۔ اسی طرح سخن سے میری طبیعت کھل جاتی ہے۔ یعنی شعر کہتے وقت یا اچھا شعر سننے کے وقت میرا غنچۂ خاطر کھلتا ہے۔

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

فرماتے ہیں۔ یارب میں اپنی صحرا نوردی کی داد کس سے چاہوں۔ جب میں قید خانہ میں تھا تو بیابان گردی کا شوق مجھ کو پریشان رکھتا تھا۔ اور اب صحرا میں آوارہ گرد ہوں تو اب زندان پر مجھ کو رشک آتا ہے۔

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

فرماتے ہیں۔ میری طبیعت حسرت و حرمان کی مشتاق ہے یعنی مجھ کو حسرت و حرمان میں لطف زندگی حاصل ہوتا ہے۔ میں امید اسی غرض سے کرتا ہوں کہ وہ ٹوٹ جائے اور مجھ کو لذت حرمان حسب دلخواہ حاصل ہو جائے۔

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

فرماتے ہیں۔ دل لگا کر غالب بھی مجھ جیسے عاشق بن گئے کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ میرزا صاحب

آپ تو مجھے ترکِ عشق کی نصیحتیں کیا کرتے تھے آپ نے کیوں دامِ عشق کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا

یہاں (آپ) کا لفظ خطاب کے لئے نہیں ہے۔

غزل حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے   چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کے دربار میں شاعروں کا امتحان ہو رہا ہے اور یہ ایسی بات ہے گویا باغ میں خوشنوایانِ چمن کا امتحان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دربار کے تمام و کمال شعرا نغز گو ہیں۔ ان کا امتحان ویسا ہی امتحان ہے جیسا باغ میں خوش الحان جانوروں کا جس مشاعرہ میں میرزا صاحب نے یہ غزل پڑھی تھی۔ بادشاہ رونق افروز تھے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے   جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ مجنوں اور کوہکن کے لئے جو مصیبتیں تھیں وہ صرف لیلیٰ و شیریں کے قد و گیسو تک محدود تھیں لیکن ہم کو ایسے ظالم سے پالا پڑا ہے۔ جو عشقِ قامت کی سزا میں دار پر کھینچتا ہے اور سودائے زلف کی سزا پھانسی تجویز کرتا ہے۔

کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر   ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ ابھی تو صرف کوہکن کی طاقتِ دست و بازو کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ اس کو جوئے شیر نکالنے اور کوہ بے ستون کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر و ضبط کی طاقت آزمائی کا امتحان تو اس وقت ہوگا جب ایک پیرزن مرگِ شیریں کی دلخراش خبر لے کر اس عاشقِ نامراد کے پاس پہنچے گی۔ اور وہ کم حوصلہ تیشے سے سر پھوڑ کر مر جائے گا۔ گویا کوہکن پر طعن ہے کہ وہ کم حوصلہ جان دے کر میدانِ عشق سے بھاگ نکلا

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی   اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ نسیمِ مصر کو پیرِ کنعاں یعنی حضرت یعقوب کی کچھ ہوا خواہی نہیں ہے۔ اسے تو حضرت یوسف کی خوشبوئے پیرہن کا امتحان منظور ہے۔ وہ مصر سے کنعان کی طرف اس خوشبو کو دیکھنے کو لے چلی ہے۔ کہ یہ خوشبو ہوا میں پھیل کر کتنی دور تک قائم رہ سکتی ہے اور کیا اثر پیدا کرتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہنا پھر کہ غافل تھے   شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ صبر و شکیب لوٹ لیجانے والا معشوق وہ سامنے بزم کے اندر آگیا ہے۔ دیکھو خبردار ہو جاؤ۔ پھر نہ یہ عذر کرنا کہ ہم غافل تھے۔ غفلت کی حالت میں ہم پر اس کا وار چل گیا اور یہ بھی ظاہر کئے دیتے ہیں کہ اسے صبر و قرار اہلِ بزم کا امتحان منظور ہے۔ اس لئے اس نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ حسنِ بیان اور بندش الفاظ تعریف سے مستغنی ہے۔

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ تیر خواہ دل میں رہ جائے۔ خواہ دل و جگر کو توڑ کر سینہ سے پار ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں غرض یہ ہے کہ بتِ ناوک فگن کا نشانہ دیکھا جائے کہ وہ قادر انداز ہے یا نہیں۔ ارادے کے ساتھ اسکا تیر نشانہ پر بیٹھا یا خطا کر کے آ لگا۔ بیان کی خوبی کا کیا پوچھنا ہے۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ سبحہ و زنار کے پھندوں میں جو شیخ و برہمن گزرتے ہیں۔ اس میں سبحہ و زنار کے پھندوں کی مضبوطی نہ دیکھو۔ بلکہ یہ امتحان کرو کہ میدانِ وفاداری میں ان دونوں میں سے کونسا شخص پورا اترتا ہے۔ یعنی زندگی بھر پابندی کے ساتھ اس وضع کو کون نباہتا ہے۔ شیخ یا برہمن۔

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ اے دل اسی طرح بندھا ہوا پڑا رہ۔ تڑپ نہیں۔ اگر تو تڑپے پھڑکے گا تو زلف کے پھندے اور زیادہ کس جائینگے۔ تو بیتابی سے زلفِ پرشکن کے پھندوں کا کیا امتحان لیتا ہے بھلا تیری بیتابی سے کہیں وہ کھلنے والے ہیں۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ زہرِ عشق رگ و پے میں جس وقت سرایت کرے وہ انجام دیکھنے کے قابل ہوگا ابھی تو آغازِ عشق ہے صرف اس کی تلخی سے منہ کا مزہ کڑوا ہو گیا ہے۔ کام و دہن کا امتحان ہو رہا ہے انجام بہت سخت ہونے والا ہے۔

وہ آئینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

فرماتے ہیں۔ وہ میرے گھر آینگے نہیں۔ قیامت تک نہ آینگے۔ اے غالب ان کو اپنے وعدہ کا اب خیال ہے۔ وہ تو اس کو بھول بھی گئے ہونگے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ آسمان کس کس مصیبت میں مبتلا کرتا ہے یعنی ان کی وعدہ خلافی سے اور نہ آنے سے یہ دیکھنا ہے۔ کہ آسمان ہم پر انکی جدائی میں کیا مصیبت توڑتا ہے۔

غزل
کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھسے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھسے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں۔ اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے۔ نیکی نہیں کر سکتا۔ (از یادگار غالب)

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھسے

فرماتے ہیں۔ الٰہی کیا میرے جذب دل میں الٹا اثر پیدا کر دیا ہے۔ کہ جسقدر میں اس کو اپنے جذب دل سے کھینچتا ہوں اسی قدر وہ مجھ سے آزردہ خاطر اور برہم مزاج ہوتا جاتا ہے۔

وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھسے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شوخ بہت بدخو اور بدمزاج ہے دوسرے یہ کہ میری داستان عشق اسقدر طولانی ہے۔ کہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتی قصہ مختصر یہ کہ قاصد بھی میرے پیام سنتے سنتے گھبرا جاتا ہے تو پھر بھلا معشوق بدخو اتنی بڑی داستان کب سننی گوارا کریگا

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں وہ تو میری جانب سے ایسا بدگمان ہے کہ اس کو کسی طرح میری محبت کا یقین ہی نہیں آتا جب میں اس سے کچھ کہتا ہوں۔ وہ کہہ دیتا ہے۔ تو جھوٹا ہے اور میں اسقدر ناتوان ہو گیا ہوں کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں دلیل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ وہ بدگمانی کی حالت میں میرا حال مجھ سے کیوں پوچھے اور میں ناتوانی کی صورت میں اپنی مصیبتیں کیونکر اس سے مفصل بیان کر سکوں ندرت بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ اے ناامیدی کیوں مجھ کو گرائے دیتی ہے۔ ذرا تو سنبھلنے دے دیکھ۔ دامن خیال یار میرے ہاتھ سے اب چھوٹ جائیگا۔ مطلب ہے۔ ناامیدی کی وجہ سے اسکا خیال دل سے نکلا جاتا ہے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ میں نے مانا کہ اس کے دیکھنے والوں میں میں بھی شامل ہوں۔ مگر یہ ظلم مجھ سے کبھی نہ دیکھا جائیگا کہ اس کو لوگ دیکھیں۔ بھلا یہ رشک مجھے کیونکر گوارہ ہو سکتا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کیساتھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قوی جن سے عشق کا ترک کرنے یا اس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی۔ ابتدائے عشق میں انہیں کو صدمہ پہنچا پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے۔ کہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے (از یادگار غالب)

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

فرماتے ہیں۔ قیامت کی بات ہے کہ اس کافر کو رخصت کرنے کے وقت میں یہ کہوں کہ جاؤ خدا کو سونپا۔ خدا حافظ۔ تم کو خدا کی حفظ و امان میں دیا۔ بھلا یہ رشک تو مجھ سے گوارہ ہی نہیں ہوتا۔ پھر یہ ستم دیکھو کہ وہ مدعی کا ہمسفر ہو۔

غزل

زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کی نیرنگیوں کا تماشہ دیکھنا ایک دیوانگی کی علامت ہے تماشہ دیکھنے کی حالت میں آنکھوں کا کھلنا اور جھپکنا گویا ندامت کے طمانچے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیائے ناپائدار اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اہل دل اسکا تماشائی بن کر اپنا وقت ضائع کرے اور انجام کار نادم و خجل ہو۔

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں تیری بدعہدی کے دھبے کس پانی سے چھوٹیں گے۔ تیرے واسطے تو آب آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے یعنی تو آئینہ دیکھ کر غیروں کے دکھانے کو بناؤ سنگھار کیا کرتا ہے

جو حقیقتاً بدعہدی میں داخل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو جھوٹے وعدے کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی غیروں سے وفا ہوتے ہیں۔

پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

فرماتے ہیں۔ ہوس کے پیچ و تاب میں پھنس کر سلکِ عافیت کو نہ توڑ۔ اگر سلکِ عافیت ٹوٹ جائیگی تو پھر عافیت کا کہیں پتہ بھی نہ ملیگا۔ نگاہِ عجز یعنی ترکِ ہوا و ہوس ایک سرِ رشتہ ہے سلامتی کا۔ مطلب یہ ہے کہ ہوس رانی سے دونوں جہان کی راحت و آسائش برباد ہو جاتی ہے۔

وفا مقابل و دعویٰ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

اس شعر میں رقیب بوالہوس پر طعن کی ہے۔ فرماتے ہیں معشوق وفادار تو وفا کرنے پہ آمادہ ہو اور عشق کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ موسمِ بہار آگیا ہو اور جنون بناوٹی ہو اس سے زیادہ شرمناک اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

غزل

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ تو رقیب کے خوف سے مجھ سے ملنا کیوں ترک کرتا ہے۔ میں تو اسقدر لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی محفل میں بلائے اور اپنے پاس بٹھائے تو میں کسی کو نظر بھی نہ آؤں۔

کیا تعجب ہے کہ اسکو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ میرا حال ایسا زبوں و زار ہو گیا ہے کہ اگر ان کے کوچہ تک کوئی شخص سہارا دے کر مجھ کو پہنچا دے اور ان سے میرا سامنا ہو جائے تو عجب نہیں کہ آنکھ ملتے ہی انکو بھی مجھ پر رحم آجائے۔

منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

فرماتے ہیں۔ اگر تو مجھ سے حجاب کرتا ہے۔ سامنے ہونے اور منہ دکھاتے ہی شرماتا ہے۔ تو منہ نہ دکھا لیکن غصہ کے انداز سے پردہ ہٹا کر آنکھیں تو مجھے دکھا دے (آنکھ دکھانا۔ خفا ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے) میں دیکھوں تو سہی کہ تیری آنکھوں میں کسقدر غصہ ہے اور غصہ کی حالت میں تیری آنکھ کا کیا رنگ ہوتا ہے۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بنجاؤں تو شانہ میں الجھادے مجھے

فرماتے ہیں۔ اسقدر وہ میری گرفتاری سے خوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض محال میں اسکی زلف بن جاؤں جو گرفتاری کا ایک آلہ ہے تو اس زلف کو بھی وہ شانہ میں الجھادے اور گرفتار کرے۔

غزل

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ دنیا میری نگاہ میں ایک بازیچۂ اطفال ہے ان دنیا کے حادثوں کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا رات دن یہ واقعات دیکھتا ہوں اور ان کو ایک بیجان ہستی کا تماشا جانتا ہوں۔ بے مثل مطلع لکھا ہے۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

فرماتے ہیں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا دیکھنے والا ہوں تخت سلیمان میرے نزدیک ایک کھیل ہے یعنی ایک معمولی شے ہے اور اعجاز مسیحا میری نگاہ میں ایک معمولی درجہ کی بات ہے۔ بات کے لفظ نے اعجاز مسیحا کے مقابلہ میں عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

اس شعر میں فلسفہ اور تصوف کا ایک عجیب مسئلہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عالم کا نام ہی نام ہے اس کی صورت نظر میں کچھ بھی نہیں ہے ہستی اشیاء میرے روبرو سوائے وہم کے اور کچھ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے سوا میں کسی شے کو موجود نہیں سمجھتا۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

فرماتے ہیں میں دیوانگی کے عالم میں اسقدر خاک اڑاتا ہوں کہ جنگل گرد میں پوشیدہ ہوجاتا ہے اور آنکھوں سے اسقدر اشک بہاتا ہوں کہ دریا میرے آگے یہ گھستا ہے۔ پانی کے زور کو جبیں رگڑنے سے تعبیر کیا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ تیری جدائی میں میرا کیا حال ہوتا ہے۔ بلکہ تو یہ دیکھ کہ تیرا میرے روبرو کیا رنگ ہے۔ یعنی تو میرے سامنے آکر کسقدر پریشان اور مضطرب الحال ہو جاتا ہے

یعنی یہی حال میرا تیرے ہجر میں ہو جاتا ہے۔

سچ کہتے ہو خودبین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ تو سچ کہتے ہو کہ میں خود بین و خود آرا ہوں۔ لیکن جب تم سا آئینہ جبیں میرے آگے بیٹھا ہو تو میں کیوں نہ خود بینی و خود آرائی کروں۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ پھر دیکھئے میری زبان سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ میرے آگے ایک گلاس اور شیشہ شراب کا بھر کر کوئی رکھدے۔ سنا گیا ہے کہ میرزا صاحب شام کے وقت پیا کرتے تھے اور شب کو خوشی کے عالم میں عجیب پر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص معشوق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو میں بوجہ رشک کے بے لطف ہو جاتا ہوں۔ لوگ اس کو نفرت پہ محمول کرتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں رشک کرنا چھوڑ دوں یہ تو کسی سے کہہ نہیں سکتا کہ اس کا نام میرے آگے نہ لو۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ ایمان مجھ کو روکتا ہے یعنی کعبہ میری پشت کی جانب ہے۔ جب آگے قدم بڑھاتا ہوں۔ تو کعبہ کی طرف سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ اور کفر مجھ کو کھینچتا ہے۔ یعنی گرجا میرے منہ کے سامنے ہے اور وہ کھینچ رہا ہے کہ ادھر چلا آ۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فرماتے ہیں۔ ہوں تو میں عاشق مگر معشوق فریب عاشق ہوں۔ یعنی ساری دنیا کے معشوق مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ لیلیٰ میرے مقابلہ میں مجنوں کو برا کہتی ہے اور میری تعریف کرتی ہے۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ سب عاشق وصل میں خوش ہوا کرتے ہیں۔ مگر شادی مرگ نہیں ہو جاتے معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ شب فراق میں جو میں نے مرنے کی تمنا اور آرزو کی تھی وہ وصل میں میرے سامنے آئی یہ شعر میرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ یہ جو اک اشک خونی کا دریا میری آنکھوں سے بہ رہا ہے۔ کاش ایسا ہو کہ اسی مصیبت پر خاتمہ ہو جائے۔ مگر نہیں۔ دیکھیے ابھی کیا کیا آفتیں اور مصیبتیں میرے آگے آتی ہیں۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ شعر بھی میرزا کے مشہور نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ فرماتے ہیں۔ اگرچہ اب ہاتھ حرکت نہیں کرتا اور جام اٹھا کر منہ سے لگانے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے لیکن ابھی تک آنکھوں میں جان باقی ہے شیشہ و ساغر کو بھی میرے آگے سے نہ اٹھاؤ۔ میں دیکھ ہی کر مست ہو رہا ہوں۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

فرماتے ہیں۔ غالب میری طرح سے عاشق بھی ہے اور میرا ہم مذہب بھی ہے اور راز دار بھی ہے تم اسکو میرے سامنے کیوں برا کہتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق ابھی حضرت غالب کو پہچانتا نہیں ہے خود بدولت ہی اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ عجب پُر لطف مقطع لکھا ہے۔

غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

فرماتے ہیں میں اگر اپنا حال بیتابی شوق کہتا ہوں تو تم کہہ دیتے ہو کہ مدعا کہیے۔ حالانکہ تم میرے مدعائے دل سے بخوبی واقف و آگاہ ہو اور پھر تجاہل عارفانہ کرتے ہو۔ اب میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے اس پوچھنے کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے۔

نہ کہنا طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے۔ کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

فرماتے ہیں۔ تم میری عادت سے بخوبی آگاہ ہو کہ میری یہ عادت ہے کہ تمہاری ہر بات پر میں درست اور بجا کہہ دیا کرتا ہوں پھر تم نے طعن سے کیوں کہا کہ ہم ستمگر ہیں۔ عادت کے موافق میری زبان سے نکل گیا۔ کہ بجا و درست ارشاد ہوا۔ اب مجھ سے بیوجہ آزردہ کیوں ہوتے ہو پھر بھی طنزاً اپنے کو

شکر نہ کہنا۔ ورنہ میں تو ہر بھی بغیر سوچے سمجھے بجا کہہ دوں گا۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

فرماتے ہیں۔ یہ ہم نے مان لیا کہ نگاہِ ناز بھی نشتر ہے۔ مگر جب دل میں اتر جائے یعنی دلنشین ہو جائے اور دل اس کو قبول کرلے۔ پھر نگاہِ ناز کے آشنا کہنے میں کیا تردد ہے۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

فرماتے ہیں۔ زخمِ پیکاں تیر انشراحِ خاطر کا سبب نہیں ہو سکتا جس زخم کو دلکش کہنا چاہیے۔ وہ تلوار کا زخم دامن دار ہے۔ اس سے دل بشاش ہو جاتا ہے۔

جو مدعی بنے اسکے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اسکو نہ نا سزا کہیے

فرماتے ہیں۔ دشمنی کے مقابلہ میں دشمنی کرنی حسنِ اخلاق سے بعید اور اہلِ ظرف کا کام نہیں ہے اگر کوئی شخص تم کو برا کہے تو تم اس کے جواب میں اسکو برا نہ کہو۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے بہتر ہے تم دشمنی کے مقابلہ میں احسان کرو۔

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کہیے

فرماتے ہیں کہیں تو جانکاہیِ مرضِ عشق کی حقیقت لکھیے یعنی فراق و ہجر میں دل پر جو کچھ صدمے گذرتے ہیں۔ اس کی مفصل حالت اور کہیں ناسازیِ دوا کی مصیبت بیان کیجیے۔ یعنی وصل بھی دردِ عشق کے لئے ناموافق دوا ثابت ہوتی ہے یعنی معشوق سے تکرار۔ شوق کی بیتابیاں ہجر کا کھٹکا۔ رشکِ رقیب کی خلش یہ سب باتیں وصل میں بے چین رکھنے والی ہیں۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

فرماتے ہیں۔ ہماری عمر اسی غم و آلام میں گذر رہی ہے۔ کبھی مصائبِ ہجر کا دکھڑا روتے ہیں کبھی صبرِ گریز پا کی شکایتیں زبان پہ آتی ہیں سننے والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ دشمن ہنستے ہیں احباب طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ایک مصیبت کے ساتھ ہزار بلائیں ہیں۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

فرماتے ہیں۔ محبت میں دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا کا معاملہ ہے۔ جان نکلتے وقت قاتل کو خون بہا معاف کر دینا چاہیے اور زبان کٹ جائے تو خنجر کی مدحت سرائی کرنی چاہیے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

فرماتے ہیں معشوق کی عیب جوئی کسی مذہب عشق میں گناہ عظیم ہے۔ اگر اسکو محبت نہیں ہے، نہ ہو لیکن معشوق تو ہے۔ اس کی خوبیاں بیان کرنی چاہئیں۔ اس کے ناز و انداز و ادا و حسن کی تعریف بیان کرنی مناسب و اولیٰ ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

فرماتے ہیں۔ بہار کو فرصت قیام نہیں ہے نہ ہو۔ مگر پھر بھی موسم بہار تو ہے۔ یہ شکایت چھوڑ کر طراوت چمن کی تعریف اور ٹھنڈی ہوا کی مسرت و خوشگواری بیان کرنی چاہیے۔

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

فرماتے ہیں۔ اے غالب مصیبت اور تکلیف کا وقت گذر جانے کے بعد ان کو بھول جانا چاہیے دل میں گرہ نہ باندھنی چاہیے بلکہ پھر کسی سے شکایت بھی نہ کرنی چاہیے۔ (لقمان نے چار باتوں پر حکمت و اخلاق کا حصر رکھا ہے۔ ان میں سے دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں اور دو باتیں بھول جانے کی۔ موت کا آنا اور خدا کا حاضر و ناظر جاننا۔ یہ دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔ اور کسی شخص پر احسان کر کے اور کسی شخص کی برائی برداشت کر کے۔ یہ دو باتیں بھول جانی چاہئیں)

غزل

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

دھویا جانا۔ بے شرم و بیباک۔ پاک۔ آزاد یا شہدا مطلب ہے۔ کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے تو اس بات کا پاس لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا اور ایسے بے شرم و بے حجاب ہو گئے کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔ (از یادگار غالب)

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی   تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ ظروف مے کی ایک فہرست بنا رکھی تھی ہر روز پڑتال کرنی پڑتی تھی۔ برتنوں کا گننا سنبھالنا۔ قیمتی سامان کا تقفل میں بند کرنا ان کی حفاظت کرنی۔ غرض یہ کہ جان غضب میں آگئی تھی اکثر گلاس چاندی سونے کے تھے۔ ان سب کو بیچ کر ان کے داموں کی شراب نوش فرمالی کہ اب نہ قرضدار رہے نہ برتنوں کی حفاظت اور ان کے گھٹنے بڑھنے کا جھگڑا باقی رہا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم   بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

فرماتے ہیں اگرچہ آوارگی کے سبب سے تم زمانہ بھر میں بدنام و رسوا ہو گئے لیکن پھر بھی اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ شوخ طبیعت اور حاضر جواب بن گئے۔ طبیعتوں کا چالاک ہونا محاورہ ہے جمع و مفرد دونوں طرح سے بولا جاتا ہے۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر   پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ نالۂ بلبل کو بے اثر کون کہتا ہے۔ وہ کہنے والا ہمارے سامنے تو آئے۔ گل کے لباس میں لاکھوں جگر چاک ہو گئے۔ پھولوں کے کھلنے کو جگر چاک ہونے سے تعبیر کیا ہے غرض یہ ہے کہ عاشق کی فریاد میں اثر کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اہل شوق کا وجود و عدم یکساں ہے اپنی آتش شوق میں خود ہی گھاس پھوس کی طرح سے جل گئے۔ اہل شوق سے یہاں عاشقان الٰہی مراد ہیں جو شب و روز کسب فنا فی اللہ میں مصروف رہ کر اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

شاہد حقیقی کا جو معاملہ جو غیر عشاق کے ساتھ ہے اسکو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملہ کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے۔

رباعی   اے زاہد و عاشق از تو در نالہ و آہ   دور تو و نزدیک ترا احوال تباہ

کس نیست کہ جان از تو سلامت ببرد　　　آنرا بہ تغافل کشتی این را بہ نگاہ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آکر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار رہے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔ از یادگار غالب

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش　　　دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

فرماتے ہیں۔ اس نے خلاف توقع اس توقیر اور عزت کیساتھ کل میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کی میت اٹھائی کہ جس کو دیکھ کر دشمنوں کے کلیجہ میں رشک کی آگ بھڑک اٹھی۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب　　　شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

فرماتے ہیں۔ نغمے راگ رنگ سے شاداب ہو گئے ہیں اور ساز نشۂ طرب سے سرشار نظر آتے ہیں یعنی شراب نغمے میں اور نغمے شراب میں اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ مینائے شراب سرو جوئبار نغمہ بن گیا ہے۔

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست　　　واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

فرماتے ہیں اے ہمنشیں تو مجھے نالہ کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اسکی صحبت عیش کو میرا نالہ درہم برہم کر دیگا۔ نہیں ایسا نہیں ہے میرا نالہ تو اس کی محفل میں پہنچکر نغمہ کا کام دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میرے نالہ کو سن کر اور خوش ہوتا ہے۔ میری فریاد سے اسکا عیش کیوں منغض ہوگا۔

غزل

عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے　　　دعوی جمعیت احباب جائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ دانتوں کو اپنی شوخی و خوبی پر جسقدر ناز ہے اس کا اظہار کرنا صرف ہنسی کے واسطے ہوا کرتا ہے یعنی ہنسنے کے وقت دانت نظر آجاتے ہیں۔ احباب کی جمعیت و اتفاق کا دعوی کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ہنسی کے قابل بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بڑھاپے میں دانت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستوں میں بھی جدائی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ہے عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل　　　یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ غنچہ کھل جانے کے بعد معدوم ہو گیا ہے یعنی گل بن گیا اور گل بنکر اس نے یہ دیکھا

جلا ہو گیا۔ کہ دیکھئے گلِ حنا کا انجام کیا ہوتا ہے لیکن اس فکر و تامل کی مقدار مہلتِ زانو بدلنے تک کی مدت ہے۔ یعنی فکر اور سوچ کے وقت انسان سر بزانو ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدلتا ہے۔ یا سر کو زانو پر سے اٹھا لیتا ہے۔ گویا اتنی سی دیر میں پھول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے اور وہ کملا جاتا ہے یا جھڑ جاتا ہے۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام　　ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ افسردگیٔ دل کے وقت بیتاب و بے صبر ہو جانا حرام ہے ورنہ بیتاب ہو کر دل کو دانتوں سے چباؤ ات۔ افسردگی اور انقباض کو فور مٹا سکتا ہے یعنی جب دل کو زخمی کر دیا تو زخم خندہ اس سے حاصل ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ افسردگیٔ خاطر ایسی مصیبت ہے کہ جس کے مقابلہ میں بیتابی و بے صبری گویا عیش کا حکم رکھتی ہے۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

فرماتے ہیں۔ ہمارے احباب ہماری سوزشِ باطن یعنی خشوع و خضوع کے منکر ہیں ورنہ ہمارا دل درد و سوز سے بھرا ہوا ہے۔ ور ہمارے لب آشنائے خندہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں رندانہ حالت رکھتے ہیں۔ اور باطن میں صاحب وجد و حال ہیں

غزل

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے　　آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

فرماتے ہیں۔ باوجودیکہ حسن بے نیاز اور بے پرواہ ہے لیکن پھر بھی اسکو ظاہری آرائش اور جلوہ گری کی خواہش و آرزو رہتی ہے اور آئینہ اس کے واسطے زانوئے فکر کا کام دیتا ہے۔ یعنی آرائشِ حسن میں نئے نئے ایجاد کرنے کی فکر آئینہ ہی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔ فکر کے وقت سر بزانو ہو جانا عادات میں داخل ہو گیا ہے۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن　　چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

فارسی میں رنگ باختن اور رنگ شکستن رنگ بدلنے کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں تماشا سے مراد تماشائے عالم ہے۔ فرماتے ہیں۔ اے آگہی تو کب تک رنگِ تماشا کو بدلتی رہیگی

اور کس وقت تک تماشائے عالم کی موجودہ کیفیت میں مشغول و محو رہے گی۔ کھلی ہوئی آنکھ یعنی چشم تماشائی جلوہ کے رخصت کرنے کے لئے گویا آغوش وداع ہے۔ یعنی عالم بے ثبات پر چشم تماشا وا کرنا گویا اس کے رخصت کرنے کے لئے آغوش کشائی ہے۔

غزل

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

صوفیا کی اصطلاح میں محادثت اور مسافرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو) ہوتی دو مرتبہ ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ شاہد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دہن سے بات چیت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے دہان زخم پیدا کرنا چاہئے۔ یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو۔ یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

فرماتے ہیں ہستی عالم ایک نمائش سراب ہے۔ کب تک دھوکے میں پڑ کر اسکو موج دریا سمجھتے رہیئے

افسردگی نہیں طرب افزائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ افسردہ خاطری ایسی چیز نہیں ہے جسکو دیکھ کر معشوق اپنے عاشق پر نظر التفات ڈالکر خوشی پیدا کرے۔ البتہ عاشق کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ سراپا درد بن جائے۔ اسوقت معشوق ملتفت ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کی افسردہ خاطری دیکھ کر معشوق یہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص بالہوس ہے جو عشق کی سختی سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اس خیال سے وہ بھی بے پروائی اور کم توجہی ظاہر کرتا ہے۔ ہاں سراپا درد بن کر معشوق کے سامنے اگر عاشق پیش ہو تو معشوق اسکو نظر التفات سے دیکھے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اے ندیم مجھکو دل کھول کے رونے سے نہ روک اور برا بھلا نہ کہہ۔ انصاف شرط ہے کبھی تو دل کی گرہ کھلنی چاہئے۔

چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

فرماتے ہیں عشق میں ہم نے اپنے جگر کو اس لئے چاک کیا تھا کہ وہ ہمارا حال دیکھ کر ہمارے حال کی

پیش فرماتے۔ یہ بات نہ ہوئی۔ اب گریبان پھاڑ کر اپنے کو رسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

فرماتے ہیں صحرا نوردی کے عالم میں میرے جگر کے ٹکڑے جو آنسوؤں میں میری آنکھوں سے ٹپکے اور ان سے جنگل کا ایک ایک کانٹا شاخ گل بن گیا۔ اب صحرا کی بہاریں اور کونسی بات باقی رہی۔ جو کوئی باغبان بن کر جنگل کی آرائشگی بڑھاتا رہے۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز   تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

فرماتے ہیں طور پر جس صاعقہ نے گر کر نگاہ میں خیرگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تیرا جلوہ نہ تھا۔ بلکہ ہماری ناکامی نگاہ برق بن کر طور پر گری تھی۔ تو اور تیرا جلوہ ایسا نہیں ہے کہ کسی شائق جمال کے دیکھنے میں آ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ موسیٰ نے تیرا جلوہ دیکھا تھا نہ اور کوئی تجھ کو دیکھ سکتا ہے۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست   نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ لڑکے جو ڈھیلے اور پتھر سر پر مارتے ہیں۔ وہ گویا ایک صدف ہے جس کا موتی زخم سر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے جنون کا سودا اپنے سر لینے میں کسی قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا۔

سر پر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر   فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو صبر کی آزمائش ہی میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی ہے۔

(از یادگار غالب)

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز   یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں معنی آفرینی اور خلاقی مضامین اور ایجاد ندرت بیان اور اختراع بندش الفاظ کچھ ایسا وحشی فن ہے جس سے ہمیشہ یاس پیدا ہوتی ہے باایں ہمہ سب لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ گویا یہ درد ایسا نہیں ہے کہ اسکو کوئی پیدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری ایک بہت دشوار کام ہے لیکن اس میں مزا بھی ایسا ہے کہ ہر شخص اس کی طرف رغبت رکھتا ہے۔

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں جنون کے لئے ایک نہ ایک شغل لازمی اور ضروری ہے جب تک جسم پر لباس کا گریبان چاک کرتے رہے۔ جب تار تار دھجی ہو گئے سر پیٹنے کا شغل مل گیا بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی۔ دامن و گریبان کی دھجیاں اڑ چکیں شغل کے لئے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ اب دیکھنے کی یہ بات ہے کہ اگر ہاتھ بھی ٹوٹ جائیں تو کوئی کیا کرے۔

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

فرماتے ہیں پہلے شمع کی طرح دلِ گداختہ کوئی پیدا کرلے تو اس کے بعد فروغِ شعلۂ سخن کی تمنا اور آرزو کرلے۔

غزل ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے زمانہ کا مسیحا ہے تو میری بلا سے ہوا کرے میں تو جب اس کا قائل ہوں کہ میرے دردِ محبت کی کوئی دوا کرے۔

شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ہم نے یہ مانا کہ آج کل زمانہ میں شرع کی پابندی بھی ہے اور قانون گورنمنٹ بھی جاری ہے جس کے ذریعہ سے قاتل کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ مگر ایسے قاتل کا کوئی کیا کرسکتا ہے جو بغیر تلوار کے عشاق کو قتل کر دیتا ہے یعنی تیغِ نگاہ یا تیرِ نظر سے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ ایسے معشوق کے دل میں جگہ پیدا نہیں کی جاسکتی جسکی بے اعتنائی کی چال کڑی کمان کے تیر سے مشابہت رکھتی ہے۔ مصرعہ اولیٰ تمام و کمال محاورہ ہے۔ کمان جسقدر سخت ہوگی اتنا ہی تیر تیز پرواز ہوگا۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اُن کے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اس جرم میں وہ زبان کاٹ لیتے ہیں اس لئے اُن کی بات خواہ درست ہو یا نادرست خاموشی کے ساتھ سننی پڑتی ہے یہ کسی کی

نہیں ہے کہ اُن سے یہ کہہ سکے کہ تم یہ بات غلط کہتے ہو بجز شعر لکھا کرے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ جوش کے عالم میں بڑے بڑے راز بیان کر رہا ہوں۔ خدا کرے میرے کہنے کو کوئی سمجھے نہیں۔ جس طرح مجذوب اپنی بڑ میں بہت سی کام کی باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ اور عام لوگ ان باتوں سے کچھ مطلب نہیں نکال سکتے۔

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

فرماتے ہیں اخلاق کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی شخص تم کو بُرا بھلا کہے تو اس کے کہنے پر توجہ نہ کرو اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو تم اس کو مطعون خلایق نہ کرو۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط رستہ پر چل رہا ہو تو تم اُسے فوراً روک دو اور اس کی غلطی اس کے ذہن نشین کر دو۔ اور اگر کوئی شخص تمہاری کچھ خطا کرے تو تم فوراً اسے بخش دو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

فرماتے ہیں زمانہ میں ہر شخص حاجتمند ہے۔ اگر وقت پہ کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے تو اس سے گلہ مند نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ دوسرا بھی ہماری طرح سے کوئی ضرورت رکھتا ہوگا

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

اس شعر میں خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف اشارہ ہے حضرت خضر سکندر کو چشمۂ آب حیواں پر لے گئے تھے۔ سکندر نے یہ دیکھ کر چشمے کے گرد بہت سے آدمی چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سے معذور مضغۂ گوشت کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے آب حیات نہ پیا۔ فرماتے ہیں۔ حضرت خضر نے سکندر کی کیا مدد کی باوجود رہنمائی کے سکندر آب حیات سے محروم واپس آ گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے بعد دنیا سے چل بسا۔ اب کوئی کسی کو کیا رہنما بنائے۔

جب توقع ہی مٹ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

فرماتے ہیں۔ توقع کی صورت میں گلہ شکوہ بھی اے غالب زیبا ہے۔ مایوسی کی حالت میں کیوں کسی کا گلہ کیا جائے۔

غزل

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے   غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مانا کہ دنیا میں غم و رنج بہت ہیں مگر غم کے مقابلہ میں شراب بھی مقدار میں کم نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غم دنیا بھلانے والی چیز شراب ہے اور میں چونکہ ساقی کوثر کا غلام ہوں اس لئے مجھ کو شراب کے حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے۔ ابدالآباد تک برابر ملے جائے گی۔ یہاں بھی پیتا رہا اور وہاں بھی پیتا رہونگا۔

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے   رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری عادت سے ہم خوب آگاہ ہیں کہ تم رشک کی آگ عاشق کے دل میں بھڑکا دیا کرتے ہو۔ رقیب پر تمہارا لطف کرنا ہمارے لئے ستم کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی یہ لطف جو تم رقیب کے حق میں برتتے ہو وہ ہمارے واسطے ستم بن جاتا ہے۔

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے   کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ تمہاری زلف خم بہ خم کی یہ دونوں صفتیں ہیں۔ یعنی درازی میں وہ شب فرقت کے برابر ہے۔ اور اس کی محبت ایسی زہریلی ہے کہ اس میں سانپ کے کاٹے کا اثر ہے۔ اب کون بتا سکتا ہے کہ وہ درحقیقت ہے کیا چیز۔

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود   کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ یہ جو اہل نجوم بچہ کی پیدائش کے وقت اس کا زائچہ بنا کر احکام لکھتے ہیں۔ یہ بے فائدہ ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کاتب قسمت نے اس کی تقدیر میں کیا لکھ دیا ہے۔

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا   خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ کافر کیش شرع اسلام کے موافق نہ قیامت کے آنے کا قائل ہے اور نہ کسی مذہب و ملت کا ماننے والا ہے پھر خدا کے واسطے ایسے شخص کی قسم کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ اے ہمدم! بخشش الٰہی اور اس تماشائے عالم کو دیکھنا عجائبات کی قدر و قیمت کا باعث ہو سکتا ہے ورنہ بے دیکھے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مہر سلیمان اور جام جم کیا چیز ہیں۔

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اسمیں دم کیا ہے

فرماتے ہیں۔ فن سخن میں خامہ غالب کی جادو نگاری کے ہم قائل تو ضرور ہیں لیکن اب اس میں بڈھے ہو جانے کی وجہ سے کچھ دم نہیں رہا ہے۔

غزل

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ باغ نے جو مجھ کو خفقانی مزاج پایا ہے تو وہ اب مجھے ڈرا رہا ہے۔ گویا سایۂ شاخ گل افعی بن کر مجھ کو نظر آتا ہے۔ خفقانی آدمی اکثر اپنے وہم کی وجہ سے ڈر جایا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باغ میں پھولوں کی تر و تازگی دلکشی کا اثر رکھتی ہے اور انجام محبت جاں گسل ہوا کرتا ہے۔

جوہر تیغ بسر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ جوہر شمشیر جس طرح زہر آب چھڑکنے سے ابھر آتا ہے اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں جس کی نشو و نما غم و غصہ سے ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سرشت میں غم و غصہ ہے۔

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں میرے مدعا کی دشواریوں اور سختیوں نے میرے دل کو توڑ دیا ہے اور میرا مدعا میرے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشائی بن گیا ہے۔ دل جب ثابت تھا تو آئینہ تھا آئینہ ٹوٹ کر بہت سے آئینے پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے میرا پہلو آئینہ خانہ بن گیا ہے۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

فرماتے ہیں۔ سارے عالم کا سرمایہ صرف نالہ ہے اور خود عالم ایک مشت خاک ہے اور آسمان بیضہ قمری یعنی حاصل دنیا نالہ کشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ گویا دنیا دار محن ہے اور آسمان نالہ کا پیدا کرنیوالا جسقدر تکلیفیں اور مصیبتیں دنیا میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان سب کو آسمان پیدا کرتا ہے۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

فرماتے ہیں زندگی میں تو وہ مجھ کو اپنی محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے۔ اب مر جانے کے بعد مجھ کو دیکھنا ہے کہ کون اٹھاتا ہے۔ یہاں اٹھانے کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دئے ہیں۔ ایک یہ کہ دیکھوں اب انکی محفل سے کیونکر میں اٹھایا جا سکتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

قطعہ

رونڈی ہوئی ہے کوکبہ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سر رہگذار کی

کوکبہ۔ خادمان شاہی جو ہر دلی میں رہتے ہیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں۔

جب اسکے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بہار کے موسم میں سیر لالہ زار کے واسطے اکثر بادشاہ تشریف لایا کرتے تھے۔

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

فرماتے ہیں ہم کچھ سیر گلستاں کے بھوکے نہیں ہیں۔ یعنی لذات دنیا کی خواہش نہیں رکھتے۔ لیکن بہار کا موسم بھی ایک نعمت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہے اس لئے اسکی سیر ضرور کرنی چاہئے۔

غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پہ دم نکلنا اس کے پورے ہونے کے لئے جلدی کرنی چنانچہ کہتے ہیں۔ کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعہ میں مقتضائے مقام یہ الفاظ کہ دل میں باقی ہیں۔ مقدر ماننے چاہئیں۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں (از یادگار غالب)

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

فرماتے ہیں میرا قاتل مجھے قتل کر کے ڈرتا کیوں ہے۔ میرا خون میرے جسم میں تو رہا ہی نہیں آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں سے ہمیشہ نکلتا رہا ہے۔ قاتل کی گردن پر کیا رہ سکتا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرعہ میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تاکہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔ بہت خوب شعر لکھا ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا   اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

فرماتے ہیں۔ اے ظالم لوگ تجھ کو سرو قامت اسی وقت تک سمجھے ہوئے ہیں جب تک تیری زلفیں خم دار ہیں۔ اگر ان کے گھونگر کھول دئے جائینگے تو تیرا قد چھوٹا نظر آنے لگیگا۔

مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے   ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

فرماتے ہیں۔ ہمارا معشوق عالم آشنا ہے۔ اکثر لوگوں سے اور اس سے خط و کتابت ہوتی ہے مضامین خطوط معلوم کرنے کی تدبیر اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہے کہ ہم نامہ نویسی کریں اور ہر شخص کے مدعا دلی سے خبردار ہوتے رہیں۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی   پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

فرماتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں شراب خوری کے واسطے جمشید اور اس کا جام مخصوص تھا۔ جو آج تک ضرب المثل چلا آتا ہے۔ اس زمانہ میں حریف جم میں ہوں اب میرے نام سے وہم جم کی شہرت ہوگی۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی   وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

فرماتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کو اپنی کاربراری کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جب ان کو ٹٹول کر دیکھا تو وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ ظلم فلک کے شاکی نظر آئے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا   اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

محبت میں مرنے جینے کا امتیاز باقی نہیں رہا ہے جس کو دیکھ کر روح تازہ ہوتی ہے۔ اسی کافر پر ہمارا دم بھی نکلتا ہے۔ حاصل زمین شعر کہتا ہے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ   پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ مقطع میرزا صاحب کے نشتروں میں کا ایک نشتر ہے۔ بیان میں ایک عجیب شوخی برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس بات سے تو ہم کو بھی تعجب ہے کہ میخانہ کے دروازہ سے غالب واعظ کو کیا تعلق۔ مگر اتنی بات ضرور ہے۔ کل کے روز ہم میخانہ سے باہر نکلے تو ہم نے یہ دیکھا کہ واعظ بھی ادھر سے گذر رہا ہے لطف اس شعر میں یہ ہے کہ صاف صاف یہ نہیں بتایا گیا کہ واعظ کہاں جاتا تھا۔ آیا میخانہ میں

یا میخانہ کے سامنے سے گذر کر کسی اور طرف۔

قطعہ

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے   بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

فرماتے ہیں۔ اگر ہم آواز کی طرح سبک اور لطیف ہو کر تڑپتے ہیں تو بھی کوہ کے بار خاطر ہوتے ہیں یعنی پہاڑ آواز کو رد کر دیتا ہے۔ جس سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ ہم پہاڑ کے بار خاطر تھے اس نے ہم کو قبول نہ کیا اور واپس کر دیا۔ اے شرار جستہ اگر ہم تیری طرح خود رفتہ و بے تکلف ہو کر تڑپتے تو خبر نہیں۔ ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مطلب یہ ہے۔ جہاں تک ممکن ہو حالت اضطراری کو ضبط کرنا چاہئے۔ شرار پتھر سے نکلتا ہے۔ اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس   از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

فرماتے ہیں۔ جس طرح بیضہ سے پرند پیدا ہو کر زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی طرح اس کنج قفس یعنی بیضہ فلک سے رہا ہو جانے کے بعد نئی زندگی شروع ہو گی مطلب یہ ہے کہ مر جانے کے بعد عالم ارواح میں از سر نو زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے   موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

فرماتے ہیں۔ ساقی کی غفلت شعاریوں کی ادائیں مستی کو بھی ہلاک کر رہی ہیں اور موج شراب اس ذوق و شوق میں بیخود و بےہوش ہو کر ساغر کی مژہ خواب آلود بن گئی ہے۔

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو   جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

فرماتے ہیں۔ آرزو دل نے زخم تیغ ناز کی صورت پیدا کر لی ہے۔ جیب خیال یعنی دل تیرے ہاتھوں سے چاک ہے۔ اور جب دل چاک ہو گیا تو اس میں آرزو کا قیام ناممکن ہے۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ   صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

فرماتے ہیں۔ تماشائے صحرا سے اسقدر جنون میں جوش پیدا ہو گیا ہے کہ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ گویا صحرا ہماری آنکھ کے واسطے ایک خاک کی مٹھی بن گیا ہے یعنی جس آنکھ میں دشت کے ذرے پڑ جائیں اُس کو کیا دکھائی دے سکتا ہے۔

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتہ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

لعل بتاں۔ لب لعل بتاں۔ فرماتے ہیں۔ کشتہ لب لعلیں کی نیند کس قیامت کی نیند ہے کہ حضرت عیسیٰ اعجاز لب بھی اسکو زندہ نہیں کرسکتا۔ جب وہ قم کہتے ہیں تو اسکی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

غزل
آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

فرماتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کو فنا کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ چنانچہ نقش پا بھی جادہ راہ کی انگلیاں کانوں میں دئے ہوئے پڑا ہے۔ اسکو بھی یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ ایسا نہ ہو سیلاب آجائے۔ آبشاروں کی آواز سنی نہیں جاتا۔ اس لئے اس نے کانوں میں انگلیاں دے لی ہیں۔ اور سمجھتا ہے کہ فصل گل میں مینہ برس کر مجھ کو فنا کر دیگا۔

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

فرماتے ہیں۔ بزم مے کو کس معشوق کی چشم مست نے وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ موج شراب نبض پری بنکر شیشے میں پوشیدہ ہو گئی ہے گویا پری انسان سے وحشت کر کے شیشہ میں بند ہو گئی ہے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب بھی بر آئے

فرماتے ہیں۔ میں تو صرف نیرنگ تمنا کا تماشائی ہوں۔ یعنی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمنا کیا کیا رنگ بدلتی ہے اور دل کو کس قسم کی لذت بخشتی ہے۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ میری مراد ہی پوری ہو۔

سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

فرماتے ہیں۔ جس طرح لکھنے کے وقت سیاہی گر کر حرفوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح میرے نوشتہ قسمت میں شبہائے ہجراں کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی کی راتوں نے میرے نوشتہ قسمت کو ایسا چھپا لیا ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ آئندہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔

غزل
ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی ریشہ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

فرماتے ہیں۔ باوجود ہجوم نالہ کے حیرت نے عرض فغاں سے عاجز کر رکھا ہے۔ گویا خاموشی نے نیستان کو جس میں سینکڑوں بانسریاں موجود ہیں خس بدنداں کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود قوت

گویائی کے رازداری کے لحاظ نے لب سی دیئے ہیں۔

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے‌حجابِ ناز تیغِ تیز عریاں ہے

فرماتے ہیں معشوقوں کا لطف ستم سے بھی زیادہ جانستاں ہے گویا نگاہ ناز ایک شمشیر آبدار ہے اور جب وہ بے حجاب ہوگئی تو تیغ عریاں بن گئی۔ اب اس کو قتل کرنے میں کیا حجاب باقی رہا۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

فرماتے ہیں۔ کثرت غم سے اسقدر کیفیت شادی مٹ گئی ہے کہ میری نگاہ میں صبح عید چاک گریبان سے بھی زیادہ بدیمن ونامبارک ہے۔

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست‌گرداں ہے

دست گرداں اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو نقد قیمت پر بکتی ہو۔ فرماتے ہیں۔ اگر ساقی بغاد عشق سے شراب محبت کی خریداری منظور ہے۔ تو دل و دین کو فوراً دے کر اس سے سودا پٹالے اس بازار میں یعنی بازار عشق میں ساغر محبت کی قیمت پہلے وصول کر لی جاتی ہے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش کرتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

فرماتے ہیں غم عشق آغوش بلا میں عاشق کو پرورش کیا کرتا ہے۔ قاعدہ ہے۔ ہوا سے چراغ گل ہو جایا کرتا ہے لیکن طوفان آب دریا میں مرجان کا چراغ نہیں بجھا کرتا ہے۔ اسی طرح عاشق کا چراغ بھی صرصر کے طوفان میں روشن رہا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کا مصیبت اور تکلیف سے کچھ نہیں بگڑتا۔

قطعہ

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جایا کرتی ہے۔ فرماتے ہیں تیری خاموشیوں میں بھی ایک ادائے اظہار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادہ سے جو نگاہ نکلتی ہے وہ سرمہ سا نکلتی ہے یعنی آواز بے صوت ہوتی ہے۔ گویا ع

خموشی معنئی دارد کہ در گفتن نمے آید

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فرماتے ہیں۔ اگر صبا خلوت غنچہ میں بھولی بھٹکی جاتی ہے تو غنچہ اُسکو آغوش میں لے کر ایسا بھینچتا ہے کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو کر شبنم بنجاتی ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ   کہ زخم روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

فرماتے ہیں دل عاشق سے تیغ نگاہ کی آبداری کا حال نہ پوچھو۔ یہ دیکھو کہ جس روزن در سے وہ جھانکتے ہیں۔ اس روزن کو تیغ نگاہ نے ایسا زخم بنا دیا ہے جس میں سے ہوا نکلنے لگی ہے۔ ہوا جس زخم میں سے نکلتی ہے۔ وہ زخم بہت مہلک سمجھا جاتا ہے۔

غزل

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے

فرماتے ہیں جس سرزمین پر نسیم زلف یار کی خوشبو پھیلا دیتی ہے۔ وہاں آہوئے دشتِ تتار کا دماغ بھی مشک نافہ بن جاتا ہے۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا   آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

فرماتے ہیں۔ اے خدا یہ تو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ حیرت کس کے جلوہ کا پتہ لگانا چاہتی ہے جو اس نے شش جہت انتظار کو آئینہ بند کر دیا ہے اور یہ چاہتی ہے کہ کہیں تو اسکا عکس جلوہ نظر آجائے۔

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق   گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

فرماتے ہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے غبار شوق ذرہ ذرہ ہو کر پھیل گیا ہے۔ اور بہت سے ذرے پریشان ہو کر دام بن گئے ہیں۔ فضائے صحرا ان کا شکار ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ غبار شوق صحرا پہ جال کی طرح پھیل گیا ہے۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ   نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

فرماتے ہیں۔ دل نے آنکھوں پر یہ دعویٰ دائر کر دیا ہے کہ ان کی نظارہ بازیوں کے قصور سے میں مبتلائے رنج و بلا ہو گیا ہوں۔ میری دادرسی پیشگاہ سرکار عشق سے ہونی لازم و واجب ہے۔

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب   اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

اس شعر میں میرزا صاحب نے ایران کی رسم کو بیان کیا ہے۔ وہاں یہ تو عذر ہے کہ جب کوئی شخص

سفر کرتا ہے تو مسافر کی پشت پر آئینہ رکھ کر اُس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحت عافیت سے عزت و آبرو کے ساتھ واپس آنا نصیب ہو۔ فرماتے ہیں شبنم آئینہ برگِ گل پر پانی چھڑک رہی ہے۔ اے بلبل وداعِ بہار کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

فرماتے ہیں ہم کو اپنی بات کا نباہنا منظور ہے۔ یعنی معشوق سے جو آنے کا وعدہ لیا ہے۔ وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ وعدہ فراموش اپنے اقرار پہ آئے نہ آئے مگر ہم کو اس کے انتظار میں رات بھر جاگتے رہنا لازمی ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کی نقاب میں دل بے قرار ہے

فرماتے ہیں۔ وادیٔ مجنوں کا ذرہ ذرہ دلِ بیتاب کا حکم رکھتا ہے۔ ایسے مقام پر تجھ کو بے پردہ سفر کرنا نہ چاہئے۔

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

فرماتے ہیں۔ اے بلبل اگر گل میں تجھ کو باغبان کی نظر سے چھپ کر لطفِ بہار اٹھانا منظور ہے تو ابھی سے دو چار تنکے لے کر آشیانہ بنا رکھ ورنہ فصلِ بہار کے جوش و خروش میں بکھرے ہوئے تنکوں کو ترسے گی۔ بہار آکر سارے باغ کو سبزہ زار بنا دے گی۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

فرماتے ہیں۔ دل کو برباد مت کر اگر وہ معرفتِ الٰہی سے باخبر دار نہ ہوا نہ سہی سیر کا لطف تو حاصل ہو جائیگا۔ اے بے دماغ آئینۂ دل میں بتوں کی تصویریں تو نظر آرہی ہیں۔ اگر بتخانہ ٹوٹ کر کعبہ نہ بن سکا نہ سہی بت خانہ میں بھی ایک کیفیت تو موجود ہے۔

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

فرماتے ہیں غفلت نے تو عمرِ اسد کی کفالت پر کمر باندھ لی ہے اور اسد نے دائمی نشاط کی ضمانت کر لی یعنی یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمیشہ عیش و راحت میں زندگی بسر ہوگی۔ اس صورت میں کیسی انجام کا خیال

بھی نہیں آنے پاتا۔ اے ناگہانی موت تو کیوں نہیں آجاتی تجھے کس بات کا انتظار ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص غفلت میں عمر بسر کرے اور اپنی موت کو بھولا رہے۔ انجام کی دور اندیشی کے خیال کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے۔ اس کو ناگہانی موت آجانی چاہیے۔

غزل آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

فرماتے ہیں میں آئینہ کو تیرے روبرو کیوں نہ پیش کر دوں۔ کہ اس کو دیکھ کر تو حیران ہو جائے اور لوگوں کو تیری حیرانی تماشا بن جائے۔ ایسا حسین دوسرا کہاں سے پیدا کروں۔ کہ جس کو دیکھ کر لوگ تجھ سا کہیں۔

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ حسرت نے میرے دل میں کہ وہ تیری بزم خیال ہے۔ ایک گلدستۂ نگاہ لا کر رکھ دیا ہے جس کو سویدا کہتے ہیں (سویدا اس سیاہ داغ کو کہتے ہیں جو دل کے اوپر ہے) مطلب یہ ہے۔ گویا سویدا دل ایک گلدستہ ہے حسرت بھری نگاہوں کا۔

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ اے خدا کس نے گوش محبت میں ایسا افسون انتظار پھونک دیا ہے کہ جس کو تمنا کہتے ہیں۔ تعجب اس بات پر آتا ہے کہ محبت ہوتے دیر نہیں ہوئی تمنا بھی پیدا ہو گئی۔

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

فرماتے ہیں بے وطنی کی تکلیفوں نے مجھ کو ایسا دیوانہ کر دیا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے دیوانوں کی طرح اپنے سر پر خاک ڈالوں مگر وہ خاک ایک مٹھی سے زیادہ نہ ہو۔ مگر ایسی ہو کہ جس کو صحرا کہیں۔ یعنی لوگ سمجھیں کہ اس نے سارے جنگل کی خاک اٹھا کر سر پر ڈال لی ہے۔

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ میری چشم تر میں حسرت دیدار سے پوشیدہ ایسا آنسوؤں کا جوش بھرا ہوا ہے کہ جس کو بے مبالغہ دریا کہہ سکتے ہیں۔

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو   صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ معمولی صبح بہار سے تو باغ کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ ہم ایسی صبح بہار کے طالب نہیں ہیں ہم کو تو ایسی صبح بہار کی ضرورت ہے جس سے گلشنِ عیش و نشاط کے پھول کھلجائیں اور اس صبح بہار کو پنبۂ مینا کہتے ہیں۔

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

فرماتے ہیں۔ اے غالب تجھ کو رند سمجھ کر اگر واعظ بُرا کہتا ہے تو تو کیوں بُرا مانتا ہے۔ ایسا آدمی تو دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا کہ جس کو سارا زمانہ اچھا کہے۔ زمانہ کا دستور یہی ہے کہ دس آدمی کسی کو اچھا کہتے ہیں تو ایک برا بھی کہتا ہے۔

غزل

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے   داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے

فرماتے ہیں۔ گلِ لالہ پر جو اس کے قطرے نظر آرہے ہیں۔ یہ بھی انداز و ادا سے خالی نہیں ہیں وہ گویا اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ دل میں داغ تو ہے لیکن درد و سوز نہیں ہے اسلئے اُس کی بوندیں عرقِ انفعال کا کام دے رہی ہیں گویا گُلِ لالہ اس شرم سے پسینے پسینے ہو گیا ہے۔

دل خون شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار   آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

فرماتے ہیں حسرتِ دیدار کی کشمکش نے دل کو خون کر دیا تھا اب وہ گویا آئینہ بن کر بت بدست حنا کے ہتھے چڑھ گیا ہے مگر اس کے ہاتھوں میں بھی اس کے تغافل کا اظہار کر رہا ہے۔ بدمست حنا سے مراد ایسا معشوق ہے جو مہندی رچانے کے شوق میں از خود رفتہ ہو گیا ہو۔

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی   جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

فرماتے ہیں۔ وہ بات شعلۂ آتش سے بھی نہیں ہو سکتی جو ہوسِ شعلہ نے دل کے ساتھ کی ہے یہاں شعلہ سے مراد شعلۂ عشق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب دل میں شعلۂ عشق اس حد تک بھڑک سکا کہ دل جل کر خاک ہو جاتا تو دل کی ناکامی پہ جی جل گیا۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق   آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

فرماتے ہیں تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ لگایا گیا ہے وہ پھول کی طرح شوقِ ہم آغوشی میں آغوش کشا ہوگیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

فرماتے ہیں۔ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ ہستی نہیں رکھتی اور بلبل جو ایک قفسِ رنگ کے سوا وقعت نہیں پا سکتی گر ان کے بولنے اور چہکنے سے عالم میں ایک دھوم مچ گئی ہے اور سب نے جان لیا ہے کہ قمری سرو کی شیدا ہے اور بلبل پھول کی عاشق۔ گویا جگرِ سوختہ یعنی عشق کا نشان ان کے نالوں سے ملا ہے۔ میرزا صاحب نے اس شعر میں لفظ (اے) کو (وہ) کی جگہ استعمال کیا ہے۔

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

فرماتے ہیں۔ لگاوٹ کے موقعہ پر تیری کم توجہی اور اعراض کی عادت نے جوشِ عشق کو کم کر دیا معشوق بن کر ایسا کم حوصلہ ہونا ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

فرماتے ہیں عشق بے اختیاری شے ہے یعنی ارادہ کے ساتھ پیدا نہیں کیا جاسکتا عشق پیدا ہوجانے کے بعد گرفتاری عشق کا دعوی کرنا ایک ایسی بات ہے جیسے کسی کا ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو اور وہ یہ کہے کہ میں نے اس پتھر سے وفا کا عہد باندھا ہے میں کبھی اپنے ہاتھ اس پتھر کے نیچے سے نہ کھینچوں گا حالانکہ پتھر کے نیچے سے ہاتھ کھینچ لینا امکان سے باہر ہے۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

فرماتے ہیں تیرے تلوار کھینچ لینے اور قتل پر آمادہ ہوجانے سے ہم کو شہیدانِ گذشتہ کا حال معلوم ہوگیا تیری تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے یعنی جس طرح بیکسی کے عالم میں تو ہم کو قتل کرنا چاہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اسی طرح اور مظلوموں کے بھی گلے کاٹے ہونگے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ شعر میرزا صاحب کے نشتروں کا ایک آبدار نشتر ہے۔ خدا بخشے حضرت استادی مولانا حالی

اس شعر کی شرح میں خود تحریر فرماتے ہیں۔ یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ مجسم موجود ہے اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ افگن ہو جائے تو یہ دھوکہ جاتا رہے اور ہم فانی انفس ہو جائیں۔ اس لئے کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں۔ اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئے۔ (از یادگار غالب)

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

فرماتے ہیں۔ اے غالب لوگوں کی کم توجہی سے تو بیدل کیوں ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی تیرا معاون و مددگار نہیں ہے تو نہ ہو خدا تو ہے۔

غزل

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

یہ شعر نعت میں ہے۔ فرماتے ہیں تجلی الٰہی کو تیری نورانی صورت ظاہر ہونا منظور تھا۔ گویا تیرے قد و رخ کے حسن دلکش سے ظہور کی قسمت کھل گئی۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے (از یادگار غالب) میرزا کے نشتروں میں کا ایک نشتر یہ شعر بھی ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

فرماتے ہیں۔ اے واعظ نہ تم خود پی سکتے ہو نہ اور کسی کو پلا سکتے ہو اور تعریف اس شد و مد کے ساتھ کرتے ہو تو معلوم ہوا تمہاری شراب طہور صرف خیالی شراب ہے جس کے بیان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہو۔ نئی قسم کی شوخی برتی ہے اور بہت ہی مزے کا شعر کہا ہے۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

فرماتے ہیں مجھ سے میرا قاتل حشر میں لڑتا ہے کہ تو بغیر میرے حکم کے کیوں زندہ ہو گیا یعنی میں نے مجھ کو قتل کیا تھا میں اُٹھتا تو اُٹھتا اور سلامتی سے تغافل کا یہ حال ہے گویا ابھی تک صور کی آواز بھی نہیں سُنی ہے۔

آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج   اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

فرماتے ہیں بلبل کی نغمہ سنجی بے سبب نہیں ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہار اب آنے والی ہے۔ اگرچہ کامل یقین تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایک اُڑتی سی خبر سُنی گئی ہے اور وہ بھی کسی معتبر کی زبان سے نہیں بلکہ طیور کی زبان سے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم نے مانا کہ اب خانۂ کعبہ میں بت نہیں ہیں مگر کبھی پہلے تو وہاں تھے اور وہاں سے نکال دئے گئے ہیں۔ اس لئے ان بتوں کو کعبہ سے ایک دُور کی نسبت ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کیا خوب شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ہر شخص کو حضرت موسیٰ کی طرح جواب صاف ہی مل جائے۔ ممکن ہے کہ ہماری درخواست منظور ہو اور جلوہ دیدار دکھا دیا جائے۔ پھر کیوں نہ ہم کوہِ طور کی سیر کریں۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر   کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

فرماتے ہیں۔ شوخ زبانی اور حاضر جوابی کوئی بُری بات نہیں ہے اگر حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ وہ جس سے بات کرتے ہیں وہ ان کی شوخ زبانی کی ضرور شکایت کرتا ہے۔ عجیب گرم شعر کہا ہے۔

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے میرزا کی کمال شوخیٔ طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ میرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے

ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منت مانتے ہیں۔ مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کرونگا اور سفر حج کا وہ اشتیاق اور ولولہ ہر حج کے ثواب کی یہ بیقدری (از یادگار غالب)

غزل

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ رنج و غم سہنے میں دل ناکام اسقدر بودا اور کمزور ثابت ہوا ہے۔ کہ اس معمولی سی بات کا افسوس کہ آج شراب گلرنگ تھوڑی مقدار میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کے حق میں غم کا ایک پہاڑ بن گیا ہے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے

میری قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لئے کافی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع نہ سمجھے اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا (از یادگار غالب)

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں (از یادگار غالب)

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ میں اس زہد و عبادت کا قائل نہیں ہوں جس کے انعام میں جنت کی امید اور حور کے ملنے کی توقع شامل ہو۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ کونسی رسم و راہ خاص ہے جس پر عقلمند لوگ ناز کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ عامیانہ رسوم کی پابندی سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ پھر روش خاص برتنے کا دعویٰ کرتے ہیں

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو تو چاہ زمزم ہی پر چھوڑ دو کہ میں بیٹھا ہوا اپنے دامن سے شراب کے دھبے دھوتا رہوں مجھ کو طواف خانہ کعبہ سے کیا ثواب حاصل ہو سکتا ہے جب میرا جامۂ احرام شراب میں آلودہ ہے۔

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ اگر اب بھی میری مراد پوری نہ ہو تو ستم ہے۔ ان کو وصل سے انکار نہیں اور مجھ کو بے انتہا اصرار ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

فرماتے ہیں اے اجل ابتدا عشق میں کیوں مجھ سے مرنے کا تقاضا کرتی ہے ابھی مجھ کو محبت کے کوچہ میں پڑا رہنے دے جگر کا خون ہونا۔ آنکھوں سے بہنا۔ میرا کوچہ و بازار میں رسوا ہونا اور اسی قسم کی بہت سی ذلتیں اور مصیبتیں مجھ کو اٹھانی باقی ہیں۔ ان سب کاموں کو انجام دے لوں تو پھر مرنے کا ارادہ کروں

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

فرماتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی بدنصیب شخص ہوگا جو غالب کو نہ پہچانتا ہو جسقدر وہ اچھا شاعر ہے اتنا ہی مشہور بھی ہے۔

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں بہت ہی دن ہو گئے یار کی مہمانداری نہیں کی اور شراب آتشیں پیالوں میں بھر کر اپنے عزیز مہمان کے سامنے نہیں رکھی جس سے بزم چراغاں کا لطف حاصل ہو۔ یعنی ایک ایک جام ایک ایک چراغ کا کام دے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر بیٹھا ہوا ان جگر کے ٹکڑوں کو چن رہا ہوں جن کو پہلے بھی مژگان یار کے روبرو پیش کر چکا ہوں۔

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

فرماتے ہیں پھر ضبط جنوں سے دم گھٹنے لگا ہے۔ برسوں ہو گئے کہ گریبان کو چاک ہی نہیں کیا۔

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح ویسے نالے کروں کہ جن سے شرر بہنے لگیں

مدت ہو گئی چراغاں کا تماشا دیکھے ہوئے۔

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق　　سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شورِ عشق زخمِ دل پر نمک چھڑکنے کے سامان بہم پہنچا رہا ہے۔

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل　　سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ میں نے خامۂ مژگاں کو پھر خونِ دل میں اس غرض سے ڈبویا ہے۔ کہ صفحۂ دامن پر گلکاریاں کروں۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب　　نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ آپس میں پھر دل و دیدہ رقیب بن گئے ہیں۔ دل نے جمالِ یار کی خیالی تصویر کھینچی ہے اور آنکھ نے نظارۂ روئے نگار کی حسرت ظاہر کی ہے۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے　　پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر دل نے کوچۂ ملامت کے طواف کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ غرور و خودداری کے بت خانہ کو توڑ ڈالا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب　　عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر شوق کسی خریدار معشوق کو ڈھونڈ رہا ہے اور اس نے یعنی شوق دل نے متاعِ عقل و دل و جان کی دکان لگائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر کوئی معشوق خریدار بن کر ہم سے عقل و دل و جان کا سودا کرلے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال　　صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر خیال حسینوں کی طرف دوڑنے لگا ہے۔ نگاہ میں سیکڑوں باغوں کا سامان فراہم کیے ہوئے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

فرماتے ہیں میں پھر یار کا خط کھولنا چاہتا ہوں اس نے جو لفافہ پر میرا نام و پتہ لکھا ہے وہ

دلفریب ہے کہ میں اس کو جان نذر کرنی چاہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں پھر میری آرزو ہے۔ کہ کوئی معشوق سیاہ زلفیں چہرہ پہ پریشان کیے ہوئے کوٹھے پر سے مجھ کو جھانک رہا ہو۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ مجھ کو آرزو ہے۔ کہ پھر کوئی میرے مقابلہ میں مژگان کی چھری کو سرمے سے تیز کیے ہوئے آجائے۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر ایک نوبہار ناز کو نظر تاک رہی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ چہرہ کو فروغ مے سے باغ کا ہمسر بنا کر سامنے آجائے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر جی میں یہ بات سمائی ہے کہ کسی معشوق کے دروازہ پر دربان کا احسان سر پر لیے ہوئے پڑے رہیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ پھر جی یہ چاہتا ہے کہ گذرے ہوئے زمانہ کی طرح ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن تصور یار کیے ہوئے خاموش بیٹھے رہیں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

فرماتے ہیں۔ اے غالب ہم کو نہ ستا کہ ہم پھر جوش اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔

غزل
نوید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

فرماتے ہیں ظلم دوست ہمارے حق میں بہت مبارک ثابت ہوا اس لئے کہ ظلم و ستم کے جتنے طریقے

تھے وہ سب برت لئے گئے۔ گویا جتنے ظلم تھے وہ ختم ہو گئے۔ اب نئی طرزِ ستم آسمان ایجاد نہیں کر سکتا۔ پھر ظلم کرے تو کیونکر کرے مطلب یہ ہے۔ کہ ان کے ستم سہہ کر آسمان کے ظلم سے عمر بھر کے لئے محفوظ ہو گئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کیلئے

فرماتے ہیں۔ میں کیا کروں۔ اگر مژۂ یار ابھی اور خون کی پیاسی ہے۔ میں اس کے حصہ کے موافق خون دل اسکو پلا چکا۔ اب جسقدر خون دل میں باقی ہے وہ میری مژہ خونفشاں کا حصہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

نئی طرح کی شوخی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ دیکھئے زندگی اسکا نام ہے۔ کہ ہم دنیا میں رہکر لوگوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آپ نے اگر عمر جاوداں حاصل کر بھی لی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ لوگوں کی نگاہوں سے تو آپ پوشیدہ رہتے ہیں ایسی حیات جاوداں کس کام کی جس کی بدولت چشم خلائق سے پوشیدہ رہنا پڑے۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فرماتے ہیں۔ کاش میں اکیلا مبتلائے بلا ہوتا۔ تیری ادا اگر بلا تھی تو صرف میرے واسطے ہوتی بلائے رشک سے تو چھٹکارہ حاصل ہوتا۔ ستم یہ ہے کہ تیری ادا ساری دنیا کی بلائے جان قرار پا گئی ہے۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے

فرماتے ہیں۔ اے فلک تو نے مجھ کو اس قاتل سے کیوں دور رکھ چھوڑا ہے۔ ایک میں ہی تو اسکے ستم و جور کے لئے مخصوص نہیں ہو گیا ہوں۔ اوروں پر بھی تو اس کی دراز دستی کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ وہ مجھ کو دیکھتے ہی قتل کر ڈالے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتی (از یادگار غالب)

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے

تھے۔ وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قاتل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صرف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں (از یادگار غالب)

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

فرماتے ہیں غزل کا میدان تنگ میرے شوق بیان کے واسطے کافی نہیں ہے۔ مجھ کو اس سے بہت زیادہ وسیع میدان درکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے غزل سرائی چھوڑ کر مدح سرائی شروع کرتا ہوں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

یہ چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ہیں جنہوں نے میرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً میرزا کا وہاں جانا نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں عیش اور مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اور وہ صرف اس غرض سے کہ میرے ممدوح کو نظر نہ لگ جائے ورنہ حقیقت میں تو عیش صرف تجمل حسین خاں کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کیلئے

فرماتے ہیں۔ ابھی میری زبان پر کس با اقبال شخص کا نام آ گیا ہے کہ جس کے اثر سے میرے نطق نے میری زبان کو چوم لیا ہے۔

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لیے

فرماتے ہیں۔ وہ نصیر دولت و دین بھی ہے اور معین ملت و ملک بھی اور وہ ایسا شخص ہے کہ چرخ بریں اس کے آستانہ کے واسطے بنایا گیا ہے۔

زمانہ عہد میں اسکے ہے محو آرائش
بنینگے اور ستارے اب آسماں کے لئے

فرماتے ہیں۔ اس کے وقت میں زمانہ محو آرائش ہو گیا ہے یہ موجودہ ستارے آرائش فلک کے لئے کافی نہیں تھے اس لئے اور ستارے بننے کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر شے کو کامل تر حالت دیکھنا چاہتا ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

فرماتے ہیں۔ ورق ختم ہو گیا اور تعریف ابھی باقی ہے۔ ایک دفتر درکار ہے۔ اس دریائے اوصاف کے لئے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

فرماتے ہیں۔ غزل میں مدح لکھی۔ غالب کی ادائے خاص ہے۔ دوستوں کو چاہئے۔ کہ وہ بھی یہ طریقہ اختیار کریں۔

قصائد

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

فرماتے ہیں۔ چمن میں ایک خاک کا ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جو جشن بہار سے فیضیاب ہوا ہو۔ یہاں تک کہ سایۂ لالۂ بیداغ بھی دل بہار کے لئے سویدا کا حکم رکھتا ہے اگر لالہ کو داغدار کہا جاتا تو اس کا داغ سویدا سمجھا جاتا۔ اس لئے لالۂ بے داغ کہا ہے کہ اس کا سایہ سویدا کا کام دے سکے۔

مستی باد صبا سے ہے بعرض سبزہ
ریزۂ شیشے مے جوہر تیغ کہسار

تیغ کوہ۔ تلہ کوہ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ باد صبا اسقدر مست ہو گئی ہے کہ اس کی تاثیر سے وہ سبزہ جو جوہر تیغ کہسار سمجھا جاتا تھا۔ ریزۂ مینائے مے بن گیا ہے شیشہ کی کرچیں شکل و رنگ

میں ہری گھاس سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سبزۂ کہسار یہ مطلب ظاہر کر رہا ہے کہ باد صبا کی مستی سے جو ہر تیغ کہسار ریزۂ مینا سے بن گیا ہے۔

سبزہ ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ   تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

فرماتے ہیں۔ چیتے کے داغ سیاہ ہوا کرتے ہیں۔ بہار کے اثر سے جام زمرد کی طرح سبز ہو گئے ہیں اور شرار ریشۂ نارنج کی طرح تر و تازہ ہو گیا ہے۔ دونوں تشبیہیں نہایت بدیع و نادر واقع ہوئی ہیں

مستی ابر سے گلچین طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

فرماتے ہیں۔ ابر کی مستانہ خرامی سے حسرت بھی گلچین طرب ہے۔ یعنی اس طرب اندوز کیفیت سے دونوں جہان کے غموں کا خاتمہ نظر آ رہا ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل   راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

راہ خوابیدہ وہ رستہ جس پر لوگوں کی آمد و رفت مدت سے نہ تھی اور سنسان پڑا ہوا تھا فرماتے ہیں۔ کوہ و صحرا تمام عندلیبان خوشنوا کے چہچہوں سے معمور ہو گئے ہیں اور غنچوں کے چٹکنے کی آواز سے سوئے ہوئے رستے بیدار ہو گئے ہیں یعنی ان پر لوگ تماشائے بہار کے لئے چلنے پھرنے لگے

سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم   سر نوشت دو جہاں ابر بہ یک سطر غبار

فرماتے ہیں۔ باد بہاری سے ہر چیز کو ایسی سیرابی حاصل ہو گئی ہے کہ ایک سطر جو خط غبار میں لکھی ہوئی ہو سر نوشت ابر بلکہ دو صد ابر سمجھی جاتی ہے۔ پھر اس سطر غبار کو مژگان یتیم سے تشبیہ دیکر یہ ظاہر کیا ہے کہ جس طرح کسی یتیم بچے کی مژگان خاک آلود ایک سطر بخط غبار ہو یعنی جس کی سرنوشت میں سالہا سال کا رونا لکھا ہو۔ وہ بھی فیض باد بہاراں سے سرور اندوز ہو گئی ہے۔

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بانداز ہلال   قوت نامیہ اسکو بھی نہ چھوڑے بیکار

فرماتے ہیں۔ آجکل ناخن بھی اگر تراش کر پھینک دیا جائے تو اسکو بھی قوت نمو ہلال کی طرح بڑھاتے بڑھاتے بدر کامل بنا دے۔

کف ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز   دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

فرماتے ہیں۔ بہار نے ہر چیز میں جان ڈال دی ہے۔ یہاں تک کہ مٹھی بھر خاک قمری بن گئی ہے اور ہر شعلۂ آتش طاؤس بن گیا ہے۔ قمری کا رنگ خاکی واقع ہوا ہے اس لئے کفِ خاک سے قمری کا بن جانا ثابت کیا ہے اور کاغذ جل کر شبکہ ہو جاتا ہے اس واسطے اس کو دامِ طاؤس سے تشبیہ دی ہے

میکدے میں ہو اگر آرزوے گل چینی   بھول جا یک قدح بادہ بطاقِ گلزار

فرماتے ہیں۔ اگر تجھ کو یہ تمنا ہے کہ میکدے میں بیٹھا ہوا پھول چنا کرے تو ایک کام کر اور وہ کام یہ ہے کہ ایک جام شراب طاق گلزار پر رکھ کر بھول جا۔ تھوڑے دن کے بعد باغ میں اسی طرح ایک شرابخانہ پیدا ہو جائیگا جس طرح ایک بیج سے درخت پیدا ہو کر سیکڑوں شاخیں نکال لاتا ہے۔ گویا ایک جام شراب شرابخانہ کا تخم ہے جو دیوار باغ کے طاق پر رکھ دینے سے باغ میں میخانہ پیدا کر دیگا۔

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوتکدۂ غنچۂ باغ   گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

فرماتے ہیں۔ اگر تو نشہ کی حالت میں شراب خانہ کے کسی کونے میں اپنی پگڑی رکھ کر بھول جائے تو غنچۂ باغ کے خلوت خانہ میں اسکو جا کر ڈھونڈھ وہ موجِ گل بن گئی ہے۔ .... تجھ کو مل جائے گی اور تجھ پر ہوائے بہاران کی اعجاز نمائی ظاہر ہو جائے گی۔

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر   سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

فرماتے ہیں۔ اگر مصورِ فکر چمن کی تصویر کھینچے تو سبزہ خط کی طرح پرکار کی کھینچی ہوئی لکیر سبز ہو جائے

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ   طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

فرماتے ہیں منقبت سرائی کے لئے لعل سے طوطیِ سبزۂ کہسار نے زبان پیدا کر لی ہے۔ لعل بھی پہاڑ میں ہوتا ہے اور سبزہ زار بھی پہاڑ پر۔

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا   چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فرماتے ہیں۔ وہ شہنشاہ جس کی تعمیر محل کے لئے حضرت جبریل کی آنکھ اینٹیں بنانے کا سانچہ بن گئی ہے

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور   رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

فرماتے ہیں اس کے قصر کی تعمیر کے واسطے آسمان ہفتم دوشِ مزدور کی طرح خم ہو گیا ہے۔ اور

فیضِ ازل ہی کے معمار کا وہ سوت ہے جس سے معمار دیوار کا سیدھا پن دیکھتا ہے۔

سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام　　　رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

سبزۂ نُہ چمن۔ نو آسمانوں سے مراد ہے۔ فرماتے ہیں۔ نو آسمانوں کی بلندی اور اس کا بام قصر بڑا ہے۔ وہ صرف خطِ بام لگتے ہیں۔ سو عارفوں کی بلند ہمت اور اس کے قصر کی چار دیواری مساوات کا درجہ رکھتی ہے۔

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ　　　وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

فرماتے ہیں۔ وہاں کی خس و خاشاک سے جس کو ایک پرِ کاہ بھی میسر آ جائے وہ تمام عمر بالِ پری کے پنکھے سے بیزار رہے۔

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا　　　چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

فرماتے ہیں۔ صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے اور چشمِ نقشِ قدم بختِ بیدار کا آئینہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ اہلِ عرفان خاکِ نجف کو موجبِ فخر سمجھتے ہیں۔ اور سفرِ نجف کے وقت اپنے نقشِ پا میں بختِ بیدار کی صورت مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز　　　گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

فرماتے ہیں۔ وہاں کی خاک کا ذرہ آفتاب کے لئے فخر و ناز کے آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ آئینۂ ناز وہ آئینہ جس میں منہ دیکھنا باعثِ فخر و ناز ہو۔ اور وہاں کے جنگل کی خاک امید کے لئے فصلِ بہار کا جامۂ احرام ہے۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز　　　عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

فرماتے ہیں۔ وہاں سے آفرینش کو مستیٔ فخر و ناز کی طلب ہے۔ گویا موجِ غبار انگڑائی ہے۔ ایجاد کی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح نشے کے اترنے کے وقت انگڑائی آتی ہے۔ اسی طرح وہاں کی موجِ غبار بلند ہو کر بتاتی ہے۔ کہ شرابِ فخر و ناز کا نشہ اتر گیا ہے پھر اس کی طلب میں انگڑائیاں لی جا رہی ہیں۔ گویا وہ سرزمین ایسی ہے کہ پیدا کر کے آفرینش کو بھی بار بار اس پہ فخر و ناز ہوتا ہے۔

مطلعِ ثانی　فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار　　　دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار

فرماتے ہیں۔ اے شمع شبستانِ بہار تیرے فیض سے پروانہ کا دل چراغاں بن گیا ہے اور پر بلبل گلزار ہوگیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ سب کی دلی مرادیں تجھی سے حاصل ہوتی ہیں۔

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

فرماتے ہیں۔ طاؤس کی طرح سارا آئینہ خانہ اُڑنے لگے تو کیا عجب ہے۔ تیرے جلوہ کے ذوق اور تیرے دیدار کے شوق نے اس کو پر لگا دیے ہیں۔

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژہ گوہر بار

فرماتے ہیں۔ تیری اولاد کے غم سے آسمان پہ سلکِ اختر میں مہ نو مژہ گوہر بار بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس غم میں رونے سے آنسوؤں کو موتیوں کا رتبہ مل جاتا ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

فرماتے ہیں۔ تیرا نقشِ قدم عبادت کے واسطے سجدہ گاہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور ریاضت کیلئے تیرا حوصلہ پشت پناہ کا کام دیتا ہے۔

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

فرماتے ہیں تیری مدح میں زمزمۂ نعت نبی پوشیدہ ہے۔ گویا جس نے تیری مدح لکھی۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح لکھی۔ اور جس نے تیرا جام محبت پی لیا۔ گویا بادۂ اسرار سے بیخود و سرشار ہوگیا۔

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

فرماتے ہیں۔ تیرے دستِ دعا کا ایک ادنیٰ جوہر یہ ہے کہ وہ تاثیر کا آئینہ ہے۔ یعنی ادھر ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اور ادھر دست بستہ اثر سامنے آموجود ہوا۔ ایک طرف تو مژگان کو بوجہ اشک ریز ہونے کے جو دعا قبول ہونے کا ذریعہ ہے فخر و ناز ہے۔ دوسری طرف جوہر تاثیر خار حسرت کے واسطے موجب رنج و ملال ہے۔ یعنی جب دعا قبول ہوگئی تو حسرت پامال ہوگئی۔

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

فرماتے ہیں۔ جو آنکھ تیرے خاکِ در کی آئینہ دار نہ ہو۔ یعنی خادم و فرمانبردار نہ ہو۔ اس کی نظر سعادت

واقبال کا عزا خانہ بن جائے اور اس کی مردمک سیاہ سوگ نشینوں میں شمار کی جائے۔

دشمن آل نبی کو یہ طرب خانہ دہر   عرض خمیازہ سیلاب ہو طاق دیوار

فرماتے ہیں۔ آل نبی کے دشمن کو اس طرب خانہ دنیا کی ایک ایک محراب اور ایک ایک طاق موج سیلاب بن کر ڈبو دے۔

دیدہ تا دل اسدؔ آئینہ یک پرتو شوق   فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

فرماتے ہیں۔ آنکھ سے لگا کر دل تک اے اسدؔ یہ تو شوق کا آئینہ دار بن جائے۔ اور فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار ہو جائے

قصیدۂ دیگر

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

فرماتے ہیں۔ اس دنیا کا وجود جلوۂ یکتائی معشوق کا آئینہ ہے۔ اگر حسن کو اپنے دیدار کی طلب نہ ہوتی تو ہم کہاں سے ہوتے۔ گویا ہم کو آئینہ بنا کر اپنا جمال بے مثال دیکھا ہے شعر تمام و کمال تصوف کے ایک مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم نے ایسی بیدلی کے ساتھ اس دنیائے ناپائدار کے تماشے دیکھے کہ جس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ کچھ لذت ملی اور تمنا ایسی بیکسی کی حالت میں رہی کہ جس سے نہ دین ہی ملا نہ کچھ دنیا کا ہی فائدہ حاصل ہو سکا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تماشے سے اگر انسان کو عبرت حاصل ہو تو دین کا فائدہ ہے اور اگر اس کے دیکھنے سے لطف ہو تو دنیا کھرے ہیں۔ ہماری بیدلی نے اور ہماری بیدماغی نے ان دونوں فائدوں سے ہم کو محروم رکھا۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم   لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

فرماتے ہیں۔ وجود باری تعالی کے سوا کسی دوسری شے کے وجود و عدم کی نسبت گفتگو

کرنی یا جنون وتمکین کے متعلق کوئی فرق ثابت کرنا لغو وبیفائدہ ہے۔

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

فرماتے ہیں۔ جو لوگ معنی شناسی کے مدعی ہیں۔ ان کو صرف ظاہرداری منظور ہے۔ اور جو لوگ حق گوئی کے دعویدار ہیں۔ ان کو فقط اپنی تحسین وستائش ستی مقصود ہے۔ معنی شناسی ایسی ہونی چاہیے جس میں ظاہرداری کا میل نہ پایا جائے اور حق گوئی اسکا نام ہے جس میں اپنی کوئی غرض مخفی نہ ہو۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا چہ دین

فرماتے ہیں۔ جو آدمی دنیاوی معاملات میں عقلمندی کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ غلطی پر ہے۔ اور جو کوئی دین کے معاملات میں عبادت سے نفع کی امید رکھتا ہے۔ اسکا خیال بے جا ہے۔ واقعی بات تو یہ ہے کہ دین ودنیا دونوں غفلت کی بدولت خراب ہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح شراب کی تلچھٹ اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ اسی طرح سے دین ودنیا ساغرِ غفلت میں تلچھٹ ہیں۔

شکلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکین

فرماتے ہیں دنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں تسلیم ورضا جیسی قابلِ قدر دولت بیکار اور بیفائدہ ثابت ہوتی ہے اور اسی طرح وقار تمکین سے مثل نقشِ قدم ذلت ورسوائی حاصل ہوتی ہے یعنی جس طرح نقشِ قدم خاک بسر ہوتا ہے۔

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزا حواس وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقین

فرماتے ہیں۔ ہوشیار لوگوں کے نزدیک اس زمانہ میں بیخودی ودیوانگی کا نام عشق رکھ لیا گیا ہے اور اصحاب اہلِ یقین کی نظروں میں آئینۂ یقین کا زنگار وصلِ معشوق ہے۔ اگر آئینۂ یقین مجلی ہوتا۔ تو معشوق کا جلوہ خود اپنی ذات میں نظر آتا اور پھر اس سے کبھی مفارقت نہ ہوتی۔

کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب بے ستون آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

فرماتے ہیں۔ فرہاد کے عشق کو ہم عشقِ کامل تسلیم نہیں کرتے وہ تو صرف خسرو کے محل کا ایک مزدور تھا۔ اس کے جذبِ محبت کا شیریں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ گویا کوہ بے ستون شیریں کے خوابِ غفلت کی

ایک تصویر سایہ دار ہے جس پہ پتھر کاٹتے کاٹتے کوہکن تیشہ سے اپنا سر پھوڑ کر مر گیا۔

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں نفسِ اہلِ وفا کو آگ لگا دیتے ہوئے کس نے دیکھا ہے اور کس نے دردمندوں کی فریاد میں اثر پایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ اب اہلِ وفا کی آہ میں گرمی ہے نہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے نالہ میں اثر ہے۔

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

یہاں زمزمہ کا لفظ طنزاً بجائے ہرزہ سرائی استعمال ہوا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اہلِ جہاں جو کچھ ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ بمجبوری میں بھی سن لیتا ہوں۔ مجھ سے نہ تو ان کی تعریف کی جا سکتی ہے اور نہ اُن کی مذمت کرتا ہوں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

یہ شعر گریز کا ہے۔ اہلِ دنیا کی نافہمی کی نسبت لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ خدا کی پناہ میں کس قدر ہرزہ سرا ہو گیا ہوں میں نے جو باتیں اوپر بیان کی ہیں وہ یکقلم خارج آداب و وقار و تمکین تھیں۔

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

فرماتے ہیں۔ اے قلم ہذیان کے رفع کرنے کو لاحول کا تعویذ لکھ اور اے فطرت وسواس کے رفع کرنے کو یا علی کا وظیفہ پڑھ۔

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

فرماتے ہیں۔ وہ فیض خدا کا ظاہر کرنے والا ہے۔ اور خاتم رسل کا جان و دل ہے اور وہ قبلۂ آلِ نبی ہے اور کعبہ ایجاد یقین۔

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

فرماتے ہیں۔ وہ باعث نازش ایجاد عالم جہاں سرگرم خرام ہو۔ وہاں کی ہر کفِ خاک گردۂ زمین بن جائے۔

جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا
وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی امیں

فرماتے ہیں۔ ان کا نقش قدم جس جگہ جلوہ پرواز ہو جائے ان کے قدموں کے اثر سے اس کف خاک سے دونوں جہان کو عزت و آبرو حاصل ہو۔

نسبت نام سے اسکے ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشت فلک خم شدۂ ناز زمیں

فرماتے ہیں۔ اس کے نام کی نسبت سے زمین کو یہ رتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ کہ ابد تک پشت فلک نازش زمین سے خم رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کی کنیت ابو تراب ہے اور تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سبب سے زمین نازاں ہے۔

فیض خلق اسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں

فرماتے ہیں۔ بوئے گل سے جو باد صبا معطر ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھولوں کو میرے ممدوح نے خلق کا فیض پہنچایا ہے۔

برش تیغ کا اسکی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی برش شمشیر کا سارے جہان میں شہرہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رشتۂ ایجاد اس کی شہرت کے خوف سے قطع ہو جائے۔

کفر سوز اسکا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانہ چیں

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے کہ جس سے رنگ عاشق کی طرح بت خانہ چین بھی شکستہ ہو جاتا ہے۔

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصی ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

فرماتے ہیں۔ اے جان کے پناہ دینے والے اور دل و جان کو فیض پہنچانے والے ختم رسل کا وصی تو ہی ہے اور اس کا فتویٰ یقین تک پہنچ گیا ہے۔

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر
نام نامی کو ترے ناصیہ عرش نگیں

فرماتے ہیں۔ تیرے جسم اطہر کے لئے دوش پیمبر منبر ہے۔ اور تیرے نام نامی کا نگین

عرش کی پیشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نے دوشِ پیمبر پہ چڑھ کر کعبہ کے بُت توڑے ہیں اور تیرا نام عرشِ معلیٰ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع گر شمع پہ باندھے آئین

فرماتے ہیں۔ تیری مدح خدا تعالیٰ کے سوا کون کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ تیری ذات کو فنا فی اللہ ہو جانے کے سبب سے ایسا ربط حاصل ہو گیا ہے۔ جیسا شمع کو شعلہ سے حاصل ہے یعنی شعلہ ہی سے شمع کو زینت حاصل ہوتی ہے۔

آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ
رقم بندگیٔ حضرت جبریل امیں

فرماتے ہیں۔ تیرے آستان پر جبریلؑ امین نے جو سجدے کئے ہیں وہ سنگ آستان پر اسی طرح ہویدا ہو گئے ہیں۔ جس طرح آئینہ میں جوہر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گویا حضرت جبریلؑ کے سجدوں کے نشان تیرے سنگ آستان پہ جوہر آئینہ کا کام دیتے ہیں۔

تیرے در کیلئے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

فرماتے ہیں۔ تیرے دروازہ پر تصدق ہونے کے لئے یہ سب آمادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو جان و دل و دین بخشے ہیں۔

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

فرماتے ہیں۔ تیری مدح سرائی کے لئے دل و جان کام و زبان بن گئے ہیں اور تیرے آداب بجالانے کو لوح و قلم دست و جبین ہو گئے ہیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

فرماتے ہیں اس کی مداحی کس سے ہو سکتی ہے جو ممدوح خدا ہو اور سوا خدا کے فردوس بریں کی آرائش کس سے ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے مدح کے واسطے بہشت بریں آراستہ کی جاتی ہے۔

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اسکا خریدار نہیں

فرماتے ہیں جس کا نام اسد اللہ اور تخلص اسد ہے وہ بازار معاصی کی ایک جنس ہے

اور گنہگار کا حامی اور خریدار ترے سوا کوئی نہیں ہے۔

شوخیٔ عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بسکہ یقیں

فرماتے ہیں۔ مطالب مدح کا بیان جو اسقدر شوخ واقع ہوا ہے وہ تیرے حوصلہ اور بخشش کے یقین کی وجہ سے ہے۔

دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

فرماتے ہیں۔ میری دعا کو ایسا حسن قبول کا مرتبہ عطا فرما دے۔ کہ میرے ایک ایک حرف پر سو سو بار اجابت آمین کہے۔

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

فرماتے ہیں۔ حضرت شبیر کے غم سے میرے دل کو اسقدر لبریز کر دے کہ خون جگر کے اثر سے میری آنکھیں سرخ رہنے لگیں۔

طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

فرماتے ہیں میرے دلدل کی محبت میں مجھ کو یہ شوق پیدا ہو جائے۔ کہ جہاں وہ زمین پر قدم رکھے میں اپنی جبین اس کے سم کے نیچے فرش کر دوں۔

دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں

فرماتے ہیں۔ دل میں جوش محبت ہو اور سینہ میں نور عرفان نگاہ جلوہ پرست ہو اور نفس صدق گزین

صرف اعدا اثر شعلہ و دود دوزخ
وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

فرماتے ہیں تیرے اعدا کے لئے آگ کا شعلہ اور دوزخ کا دھواں مخصوص ہو جائے اور احباب کے واسطے فردوس بریں کے گل و سنبل وقف کر دیے جائیں۔

قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اسکا نام
جسکو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

فرماتے ہیں۔ اے ہلال عید ہم کو اس کا نام بتا دے جس کو تو جھک کے سلام کر رہا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح　　　یہی انداز اور یہی اندام

فرماتے ہیں پچیس اور چھبیس کی شب کو صبح کے وقت ہم نے تجھ کو دیکھا تھا۔ ایسا ہی نازک اندام تھا اور اسی انداز سے ایک جانب جھکا ہوا تھا۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب　　　بندہ عاجز ہے گردش ایام

یہ تو بتا تو دو دن تک کہاں چھپا رہا اور کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بندہ عاجز ہے زمن کی گردش سے ایسا ہوا کرتا ہے۔ بندہ عاجز ہے۔ گردش ایام۔ یہ سارا مصرعہ تمثیل ہے۔

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا　　　آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

فرماتے ہیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تو اڑ کے کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔

مرحبا اے سرور خاص خواص　　　حبذا اے نشاط عام عوام

فرماتے ہیں مرحبا۔ اے خاص الخاص لوگوں کے سرور پہنچانے والے اور حبذا اے تمام عام لوگوں کو نشاط بخشنے والے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے　　　لے کے آیا ہے عید کا پیغام

فرماتے ہیں تین دن نظر نہ آنے کے عذر میں عید کا پیغام لے کر آیا ہے۔ تاکہ تجھ سے غیر حاضر رہنے کی باز پرس نہ ہو۔

اسکو بھولا نہ چاہیے کہنا　　　صبح جو جائے اور آئے شام

فرماتے ہیں۔ اسکو بھولا نہیں کہتے جو صبح کا بھولا شام کو آجائے۔ یعنی چھبیس یا ستائیس کی صبح کو چاند نکل کر پھر انتیس یا تیس کی شام کو نظر آتا ہے۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا　　　تیرا آغاز اور ترا انجام

فرماتے ہیں۔ ایک میں ہی نہیں۔ یہ تو سارے زمانہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو بدر سے گھٹتے گھٹتے بالکل مٹ جاتا ہے اور پھر نئے سر سے تیرا آغاز ہو کر تو کمال کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے یعنی بدر ہو جاتا ہے

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

فرماتے ہیں۔ تو مجھ سے اپنا راز دل کیوں چھپاتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو کوئی غمّاز سمجھا ہے۔

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امیدگاہ انام

فرماتے ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ آج سارے جہان میں ایک ہی بارگاہ ایسی ہے کہ جہاں سے لوگ مرادیں پاتے ہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اسکا مگر نہیں ہے غلام

فرماتے ہیں۔ یہ میں نے مان لیا کہ تو اس کا حلقہ بگوش غلام ہے تو کیا غالب اس کا غلام نہیں ہے؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرز استفہام

فرماتے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ تو بھی اس بات سے واقف ہے کہ مجھ کو بھی اس کی غلامی کا فخر حاصل ہے اسی وجہ سے میں نے بطور استفہام انکاری تجھ سے دریافت کیا ہے۔

مہر تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ
قرب ہر روزہ بر سبیل دوام

فرماتے ہیں۔ مہر تاباں کو ممدوح کی بارگاہ سے قرب ہر روزہ ہمیشہ کیلئے حاصل ہو تو ہو لیکن اے ما؟

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریب عید ماہ صیام

تجھ کو یہ رتبہ بجز عید کے کس دن حاصل ہو سکتا ہے۔

جانتا ہوں کہ اسکے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام

فرماتے ہیں۔ سو۔ تو اپنے بخل سے میرے ممدوح کا نام ہی مجھ کو نہ بتاتا تھا مقصد میں تجھکو یہ بتائے دیتا ہوں کہ تو پھر اسکے فیض سے ماہ کامل بنا چاہتا ہے۔ اب تو سمجھ گیا ہوگا کہ تجھ سے زیادہ میری وہاں رسائی ہے۔

ماہ بن ماہتاب بن میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام

فرماتے ہیں۔ ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون ہوں جو تجھ پر رشک کروں۔ مجھکو کیا تو اپنا انعام بانٹ دیگا۔ جو تجھ کو تیری قسمت سے ملیگا۔ وہ تیرے ہی پاس رہیگا۔ اس شعر کا بیان ندرت سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ سارا قصیدہ میرزا صاحب نے ایسی زبان میں لکھا ہے۔ کہ جس پر قیامت

تمک آمد دو زبان فخر کرے گی۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

فرماتے ہیں کہیں یہ خیال نہ کرنا کہ مجھ کو تجھ پر رشک آتا ہے۔ اور میں عید کے انعام سے محروم ہی رہجاؤنگا نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تجھ کو تیری حیثیت کے موافق انعام ملیگا اور مجھ کو میرے رتبہ کے قابل خلعت و جواہر عطا ہوگا۔

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص
گر تجھے ہے امید رحمت عام

فرماتے ہیں میں بخشش خاص کا تمنائی ہوں۔ اگر تجھ کو امید رحمت عام ہے۔

جو کہ بخشیگا تجھ کو فر فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

فرماتے ہیں۔ جو ممدوح تجھ کو ایسی روشنی بخشیگا جو ضیا بخش عالم ہوگی۔ کیا مجھ کو شیشہ کی لال پری جو چاندنی رات کو اور زیادہ روشن کردے گی نہ دیگا۔

جبکہ چودہ منازل فلکی
کر چکی قطع تیری تیزی گام

فرماتے ہیں جب تو تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی چودہ منزلیں طے کریگا اور چودھویں رات کا بدر کامل بن جائیگا

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

اور تیرے پرتو سے کوچے اور محل سرا اور صحن اور در و بام پر چاندنی پھیل جائے گی تو

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

اس میرے ہاتھ میں بھی ایک جام بلوریں مئے گلگوں سے چھلکتا ہوا تیری شکل کا روشن اور منور ہوگا۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسن طبع چاہتا تھا لگام

فرماتے ہیں۔ جام شراب اور شب ماہ کا ذکر آتے ہی پھر غزل سرائی میں لے شروع کردی گویا توسن طبع باگ کا اشارہ چاہتا تھا۔ اشارہ پاتے ہی چل نکلا۔

غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

فرماتے ہیں۔ میرے حق میں تو غم ستم قاتل ثابت ہو ہی چکا تھا۔ تجھکو کس بیوقوف نے میرے قتل کرنے کی صلاح دی۔ ناحق ایک تیر لگاکر بدنام ہوا۔

میں ہی پھر کیوں نہ مے پئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

فرماتے ہیں۔ حرام تو شراب بھی ہے اور غم سے زیست بھی حرام ہے پھر میں کیوں شراب نہ پیوں اس سے کیقدر غم غلط تو ہو جاتا ہے۔ اگر شراب کو حرام جان کر شراب پینے سے پرہیز کرتا ہوں۔ تو غم زیست حرام کئے دیتا ہے۔ لاجواب شعر لکھا ہے نئی قسم کی شوخی ہے۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

فرماتے ہیں۔ بوسہ تو کب وہ دیتا ہے۔ ہم تو اسی بات کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ گالیاں کھانے میں بھی ہم کو لطف حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے تو وہ اپنے منہ سے گالیاں بھی نہ دے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

فرماتے ہیں جس طرح بجائے کعبے کے دیر میں احرام باندھ لیا ہے اسی طرح ایک دن دیر کے بدلے کعبہ میں جاکر ناقوس پھونکیں گے۔

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

فرماتے ہیں۔ مجھ کو وہ جام عرفان نصیب ہے۔ جس شراب معرفت سے بیخود ہو کر آسمان رقص کر رہا ہے۔

بوسہ دینے میں انکو ہے انکار
دل کے لینے میں جنکو تھا ابرام

فرماتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بوسہ کے دینے میں ان کو انکار ہے۔ جن کو دل لینے میں ضد کرنے کی عادت تھی۔

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

بالکل نئی شوخی میرزا صاحب نے اس مقطع میں برتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے تو صرف

چھیڑنے کی غرض سے کہ ان کو غصہ آئے اور وہ مجھ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں میں نے اپنا نام غالب رکھ لیا ہے ورنہ میں تو ان کے حسنِ دلکش سے مغلوب ہو چکا ہوں۔ غالب کیونکر بن سکتا ہوں۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام

یہاں سے پھر ماہ نو کی جانب مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ میں تو سب کچھ کہہ چکا۔ اب اے پری چہرہ پیک تیز خرام تو بتا کہ تو کیا کہتا ہے۔

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

بہرام فلک مریخ کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں وہ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا مہ و مہر اور زہرہ و بہرام ہیں۔

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نام شاہنشہ بلند مقام

فرماتے ہیں۔ تو اگر نہیں جانتا تو مجھ سے سن۔ میرے شاہنشہ بلند مقام کا نام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذو الجلال والاکرام

فرماتے ہیں۔ وہ دل و چشم کے قبلہ ہیں۔ یعنی چشم امید انہی کو دیکھتی ہے۔ اور دل متمنی انہیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ان کا اسم گرامی بہادر شاہ ہے اور وہ مظہر ذوالجلال والاکرام ہیں۔

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام

اور یہ دونوں صفتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

جس کا ہر فعل صورت اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام

فرماتے ہیں۔ اور وہ بادشاہ ایسا ہے۔ کہ جس کا ہر فعل اعجاز نما ہے اور جس کا ہر قول الہام ثابت ہوتا ہے۔

بزم میں میزبان قیصر و جم
رزم میں اوستاد رستم و سام

فرماتے ہیں۔ بزم میں وہ قیصر و جم کا میزبان ہے اور رزم میں وہ رستم و سام کا استاد ہے گویا قیصر و جم اس سے فیض پاتے ہیں اور رستم و سام اس سے جنگ کے طریقے سیکھتے ہیں۔

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

یہاں سے مدح حاضر شروع ہوگئی ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

فرماتے ہیں۔ خدا تجھ کو نظر بد سے بچائے۔ تیری خسروانہ شان آنکھوں میں کھپی جاتی ہے اور ماشاء اللہ تیرا عارفانہ کلام دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

فرماتے ہیں۔ تیرے جاں نثاروں میں قیصر روم بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اور تیرے جرعہ خواروں میں جمشید بھی داخل ہے۔

وارث ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

فرماتے ہیں۔ یہ سب بادشاہ جنکا مصرعہ ثانی میں نام لیا گیا ہے تجھ کو وارث ملک جانتے ہیں

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز بیژن و رہام

مصرعہ ثانی میں زور آور اور مشہور پہلوانوں کا نام لیا گیا ہے۔

قطعہ

مرحبا موشگافیِ ناوک
آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیر غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

دونوں شعر دست و گریباں ہیں۔ اور لف و نشر مرتب ہے۔ فرماتے ہیں تیرا تیر ایسا بال کی کھال کھینچنے والا ہے۔ کہ دشمن کا تیر گویا اس کا نشانہ ہے اور تیری شمشیر اسقدر آبدار ہے۔ گویا دشمن کی تلوار اسکا نیام ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا تیر دشمن کے تیر کو نشانہ کی طرح اڑا دیتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار میں نیام کی طرح اتر جاتی ہے۔

قطعہ

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فرماتے ہیں۔ رعد کا دم بند کر رہی ہے۔ تیرے فیل فلک شکوہ کی چنگھاڑ اور بجلی کو الزام دے رہا ہے۔ تیرے رخش سبک عناں کا خرام یعنی بجلی سے کہتا ہے۔ کہ تو ایسی سست رفتار ہے کہ میرے ساتھ دس قدم بھی نہیں چل سکتی۔

قطعہ

فن صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اسکے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

فرماتے ہیں۔ تیرے گرز کے مصوری و صورت گری آتی ہے اور اس فن میں اسکو کمال حاصل ہے۔ وہ ایک ضرب میں دشمن کے سر و تن کو اس طرح ملا دیتا ہے کہ ادغام کی تصویر آنکھوں کے روبرو کھنچ جاتی ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

فرماتے ہیں۔ ازل کے دن جو احکام رات اور دن کے اوراق پر رقم ہوئے تھے۔

اور ان اوراق میں بکلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

وہ مجمل طور پر رقم ہوئے تھے۔ ان احکام کی تفصیل ابد الآباد تک ہوتی رہے گی۔

ان ہی احکام کی تفصیل میں یہ حکم بھی مندرج ہوئے تھے کہ

لکھدیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام

معشوقوں کو عاشق کش لکھدیا اور عاشقوں کو دشمن کام لکھدیا۔ دشمن کام وہ شخص جو دشمنوں کے حسب مراد خستہ و دل شکستہ ناکام و نامراد ہو۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گرد نیلی فام

آسمان کی نسبت یہ حکم نافذ ہوا کہ لوگ اسکو گنبد تیز گرد نیلی فام کے نام سے مشہور کریں۔

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

اسی کے ساتھ یہ حکم بھی لکھا گیا کہ معشوق کے خالِ عارض کو دانہ اور زلف کو دام لکھیں

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

فرماتے ہیں۔ آگ۔ پانی۔ ہوا۔ خاک کے حصہ میں یہ باتیں آئیں۔ کہ ان کی وضع سے سوز و نم و رم و آرام ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی آگ کو سوز دیا گیا۔ پانی کو نمی عطا کر دی۔ ہوا کو بھاگنا پھرنا ملا اور خاک کو آرام بخشا گیا۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

فرماتے ہیں۔ مہرِ رخشاں کو خسروِ روز کا خطاب عطا ہوا اور ماہِ تاباں کا نام کوتوالِ شام قرار پایا

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

فرماتے ہیں۔ تیرے فرمانِ سلطنت کو حسبِ ضابطہ صورتِ ارقام عطا ہوئی۔ دستور فارسی میں وزیر کو بھی کہتے ہیں۔

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

فرماتے ہیں۔ خالقِ قدرت نے تیرے واسطے فرمانِ سلطنت لکھ کر اس پر دوامِ دولت کا طغرہ بنا دیا

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

یہ شعر دعائیہ ہے۔ روائی امکان و جواز کے معنی پر استعمال ہوتا ہے۔ باقی شعر کے معنی صاف ہیں

میرزا صاحب کا یہ قصیدہ ان کے کمالِ شاعری کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ سو برس پہلے اردو زبان میں ایسی تشبیب اور ایسی مدح لکھنی جس کا جواب آج تک بھی کوئی نہیں لکھ سکا۔ کار دارد کا مصداق ہے۔

قصیدہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

فرماتے ہیں۔ صبح ہو گئی اور مشرق کا دروازہ کھل گیا یعنی جس دریچہ سے مہرِ عالمتاب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ منظر ظاہر ہو گیا۔

خسرو انجم کے آیا صرف میں　　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

فرماتے ہیں۔ خسرو انجم یعنی آفتاب کی ضیاء میں ستارے چھپ گئے۔ گویا خورشید تاباں نے گنج گوہر کو صرف کر دیا۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود　　　صبح کو راز مہ و اختر کھلا

سیمیا وہ فن ہے جس کے ذریعہ سے اشکال وہمی وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں یہ اختر جو رات کو نظر آ رہے تھے صبح ہو جانے پر سیمیائی اشکال کی طرح نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

فرماتے ہیں ستاروں کی اصل و حقیقت کچھ اور ہے اور نظر کچھ اور طریقہ پر آتے ہیں۔ گویا ایسی قسم کے بازی گر ہیں جو کھلا ہوا دھوکا دیتے ہیں۔

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو　　　موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

فرماتے ہیں۔ سطح گردوں پر رات کو ستارے نہ تھے بلکہ معشوق کا زیور تھا جو موتیوں سے بنایا گیا تھا اور وہ قدر و قیمت میں ستاروں سے بہتر تھا۔ یہاں تشبیہ نے ستاروں کو آفتاب روز سے زیادہ چمکا دیا ہے۔

صبح آیا جانب مشرق نظر　　　اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

فرماتے ہیں۔ شب کو تو آسمان پر یہ کیفیتیں نظر آ رہی تھیں اور صبح کو یہ دیکھا کہ ایک معشوق آتشیں رخسار برہنہ سر سامنے موجود ہے۔

تھی نظر بندی کیا جب رد سحر　　　بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

فرماتے ہیں۔ وہ نگار آتشیں رخسار گویا ایک جادو کا پتلا تھا۔ جب ہم نے رد سحر کا عمل پڑھا تو یہ ثابت ہوا کہ بادۂ گلرنگ کا ساغر ہے۔

لاکے ساقی نے صبوحی کیلئے　　　رکھدیا ہے ایک جام زر کھلا

اور اس ساغر کو ساقی نے صبوحی کے واسطے لا کر رکھدیا ہے جو ایک سونے کے جام کی

شکل میں بغیر سرپوشش کے نظر آرہا ہے۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ　　کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تشبیب ختم ہوئی۔ گریز میں فرماتے ہیں۔ کہ اس تمہید میں صبح کا بیان صرف اس غرض سے کیا گیا تھا کہ جب صبح ہوگئی تو بزم سلطانی آراستہ ہوگئی۔ گویا امن و امان کے کعبہ کا دروازہ کھل گیا

تاج زریں مہر تاباں سے سوا　　خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

منہ پر کھلنا محاورہ ہے اس کے معنی زیب دینے کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مہر تاباں کا تاج زریں اتنا زیبندہ نہ تھا جتنا بادشاہ عالم کا تاج زریں بادشاہ کے منہ پر زیب دیتا ہے

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے　　راز ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

فرماتے ہیں۔ میرا بادشاہ بہادر شاہ روشن دل ہے اور روشن دلی کی دلیل یہ ہے کہ ہستی کا راز اس پر بتمام و کمال کھل گیا ہے۔

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں　　مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

فرماتے ہیں۔ وہ ذات ستودہ صفات ایسی ہے کہ جس کی تکوین میں نو آسمانوں اور سات ستاروں کا مقصد تخلیق ظاہر ہوتا ہے۔ قدیم استادوں کے ہاں اعلان نون بعد اضافت زیادہ عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے　　عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

فرماتے ہیں۔ وہ ایسا بادشاہ ہے کہ اس کی تاویل کے ناخن سے عقدۂ احکام پیغمبر کھل گیا ہے۔ ناخن تاویل اور عقدۂ احکام دونوں استعارے ہیں۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام　　اسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

فرماتے ہیں سب سے پہلے دارا کا نام نکلا ہے۔ جب اسکی فوج کے سرہنگوں کا دفتر کھولا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ دارا کے پاس بے انتہا فوج تھی اور سرہنگ کے معنی ہراول فوج یا مقدمۃ الجیش لشکر کے ہیں۔

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے　　واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

فرماتے ہیں۔ اسکے روشناسوں کی یعنی جاننے والوں کی جہاں فہرست رقم ہے وہاں چہرۂ قیصر یعنی حلیۂ قیصر واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ مدح میں یہ دونوں شعر بے مثل ہیں اور دونوں بادشاہ کی خصوصیت ان کے صفات کی وجہ سے لازمی اور ضروری تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور نام مثل سکندر یا قیصر رقم کر دئے جاتے تو یہ دونوں شعر اپنے بلند درجوں سے گر جاتے۔

قطعہ

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بت خانۂ آزر کھلا

فرماتے ہیں۔ توسنِ شہ میں وہ خوبیاں ہیں۔ کہ جب تھان سے وہ غیرتِ صرصر یعنی ہوا سے زیادہ چالاک گھوڑا کھلتا ہے۔ تو اس نقشِ پا میں ایسی دلفریب شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آذر بت تراش کا بت خانہ سامنے نمودار ہو گیا ہے۔

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

فرماتے ہیں۔ بادشاہ کی تربیت سے مجھ کو یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ آفتاب کا منصب اور ماہ کا عہدہ اور محور کی حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے۔ محور اس لکیر کو کہتے ہیں۔ جو کرۂ متحرکہ کے درمیان میں یعنی کرۂ قطبین کے بیچ میں موہوم سی ہوتی ہے۔

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا

فرماتے ہیں۔ میری لاکھوں مشکلیں جن کا حل ہونا میری استطاعت اور قدرت سے باہر تھا وہ آسانی سے حل ہو گئیں۔

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا۔ کب کھلا۔ کیونکر کھلا

فرماتے ہیں۔ میرا دل وابستہ تو ایک ایسا قفل تھا کہ جس میں کوئی کنجی ہی نہیں لگتی تھی۔ مجھ کو حیرت ہے کہ اس قفل کو کس نے کھولا اور یہ کب کھلا اور کس طرح کھل گیا۔

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

کھلنے کے معنی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے کے ہیں۔ مگر یہاں اسکے دوسرے معنی لئے گئے ہیں۔

فرماتے ہیں۔ باغ معنی کی بہار دکھاؤں گا۔ اگر بادشاہ نے میرے حال پر نگاہ توجہ فرمائی۔

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

فرماتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ اس موقعہ پر میں ایک غزل بھی سنانی شروع کر دوں اور میرے مضامین کی خوشبو سے لوگوں کو یہ گمان گذرے کہ عنبر کا ڈبہ کھول دیا گیا ہے۔

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے کنج قفس میں اسطرح سے میں پر کھلا ہوا بیٹھا رہوں۔ کاش قفس کی کھڑکی کھلی ہوئی ہوتی اور میں اڑ جاتا۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے — یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

فرماتے ہیں۔ ہمارا اعزاز یہ چاہتا ہے کہ ہم یار کے دروازے پر جا کر آواز دیں اور ہمارے واسطے دروازہ کھولا جائے۔ ایسی حالت میں ہمارے جانے کا لطف ہے۔ یوں ہماری بلا جاتی ہے کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر ہم جا کر شریک صحبت ہو جائیں۔ اسطرح عام لوگ جاتے ہیں

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

فرماتے ہیں۔ افسوس ہے ہم کو اسی رازداری پر گھمنڈ ہے اور ہم یہی سمجھتے ہیں۔ کہ سوا ہمارے کوئی شخص راز دوست سے آگاہ نہیں ہے۔ حالانکہ دوست کا راز دشمن پر کھل گیا ہے تف ہے ہماری رازداری پر۔

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

فرماتے ہیں۔ کہ سچی بات تو یہ ہے۔ کہ دل پر داغ بہت ہی زیب دیتا تھا۔ لیکن زخم داغ سے بھی بڑھ کر زیبندہ ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں زخم کا کھلنا۔ ایک دوسرے معنی بھی دیتا ہے جس کا لطف اس لطف معنی سے بالاتر ہے۔

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان — کب کمر سے غمزہ کا خنجر کھلا

ابرو جو دو کمان سے مشابہ ہے اسکو کماندار کہنا اور غمزہ جسکو خنجر سے تشبیہ دیجاتی ہے۔ اس کو خنجر گذار لکھنا میرزا صاحب کی جدت طبع کی دلیل ہے۔ مطلب شعر کا صاف ہے یعنی ابروئے یار اور غمزۂ دوست ہر وقت ہمارے قتل کے درپے رہتے ہیں۔

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ   رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

بدرقہ کے معنی رہبر اور نگہبان قافلہ کے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ مفت کا راہبر کس کو برا معلوم ہوتا ہے باوجودیکہ رہروی میں رہبر کا بھرم کھل گیا یعنی ہم نے یہ جان لیا کہ وہ آشنائے منزل مراد ہے لیکن پھر بھی ایک آدمی تو ساتھ چلنے کے لئے بغیر داموں کا مل گیا۔ کیا برا ہے۔

سوز دل کا کیا کرے باران اشک   آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

فرماتے ہیں۔ باران اشک سوز دل کو کیونکر چھپا سکتا ہے۔ جب یہ حالت ہو۔ کہ اگر مینہ برسنا دم بھر کے واسطے بند ہو جاتا ہے۔ تو آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے دل کی تپش تھمی رہتی ہے۔ ادھر آنسو بند ہوئے اور ادھر دل میں شعلہ بھڑکا۔

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ   رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

شادی مرگ ہو جانے کو کس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی میرزا صاحب کے نشتروں میں کا نشتر ہے۔

دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی   ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

فرماتے ہیں۔ خبردار اگر کوئی غالب سے الجھے گا تو وہ اس کے دھرّے بکھیر دیگا۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال   پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

فرماتے ہیں۔ پھر مدح سلطان کی طرف طبیعت رجوع ہوئی اور مدح کے شعر لکھنے شروع کئے اور ایک ایک شعر چاند سورج کا مقابلہ کر رہا ہے۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد   بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

فرماتے ہیں۔ قلم اٹھتے ہی طبیعت شعر گوئی کی طرف رجوع ہو گئی۔ گویا ادھر جہاز کا لنگر

اٹھایا اور ادھر بادبان کھل گیا۔ بحر معنی میں کشتی سخن رواں ہوگئی۔

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا

فرماتے ہیں۔ یہاں مدح سے ممدوح کی شان وشکوہ ظاہر ہوگئی۔ گویا عرض سے جوہر کا رتبہ کھل گیا۔ جوہر کا لفظ یہاں درِ بے بہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا رایت لشکر کھلا

فرماتے ہیں۔ آفتاب۔ نشان لشکر کے رعب داب سے لرزاں ہوگیا اور آسمان کو چکر آنے لگے۔

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایۂ منبر کھلا

فرماتے ہیں۔ منبر کا رتبہ اس سبب سے بلند ہے کہ اس پر خطیب بادشاہ کا نام خطبے میں پڑھتا ہے۔

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروئے زر کھلا

فرماتے ہیں زر وسیم کی آبرو اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ اس پر بادشاہ کا سکہ ہے۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مآل سعی اسکندر کھلا

فرماتے ہیں۔ شاہ کے روبرو آئینہ رکھا ہوا ہے۔ اتنے برسوں کے بعد اب سکندر کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوا ہے۔ یعنی اس نے اسی آئینہ داری کی تمنا میں آئینہ بنایا تھا۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا

فرماتے ہیں۔ ملک کا وارث خاص میرا ممدوح ہونا چاہیے تھا۔ اب ہمیں جا کر حق بحقدار رسید کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ طغرل اور سنجر جو بادشاہ بن بیٹھے تھے وہ ان کا فریب تھا۔ جو اب کھل گیا۔

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں داور کھلا

فرماتے ہیں۔ خوش نصیبی سے میرا نام اس کے مداحوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ اور لوگ جانتے ہیں۔ کہ اس نے دفتر کے دفتر بادشاہ کی مدح میں رقم کر دیئے ہیں۔ لیکن جیسی مدح رقم ہونی چاہیے تھی۔ وہ مجھ سے رقم نہ ہو سکی۔

فکر اچھی پر ستائش نا تمام عجز اعجاز ستائش گر کھلا

فرماتے ہیں۔ فکر تو اچھی ہے لیکن مدح ناتمام ہے۔ وہ پوری پوری ادا نہیں ہو سکی۔ اعجاز مدح کا عجز ظاہر ہو گیا۔ فکر کے کامل تر ہونے سے اعجاز بیانی کا دعویٰ کرنا اور مدح کے ناتمام رہ جانے سے عجز کا اظہار کرنا یہ دونوں باتیں اس شعر میں ایسی بدیع و نادر اور اس خوبی کے ساتھ ادا ہوئی ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جانتا ہوں خط لوحِ ازل　　　تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

فرماتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ تم پر لوحِ ازل کا حال واضح اور منکشف ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ میرا حال بھی تم سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں مجھ کو کیا ضرورت ہے کہ میں عرضِ حال کروں

تم کرو صاحبقرانی جب تلک　　　ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

فرماتے ہیں۔ خدا کرے تم اس وقت تک صاحبقرانی کرتے رہو جب تک طلسم روز و شب کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ صاحبقران فاتح اور جلیل القدر بادشاہ کو کہتے ہیں۔ لفظی معنے صاحبقران کے یہ ہیں کہ وہ بادشاہ جو قران علمی کے وقت پیدا ہو۔

مثنوی

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز　　　کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

فرماتے ہیں۔ اے دلِ دردمند اور ہاں اے دل زمزمہ ساز تو کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز

خامے کا صفحہ پر رواں ہونا　　　شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

فرماتے ہیں۔ فکرِ سخن کے وقت خامہ کا صفحہ کاغذ پہ چلنا بعینہ ایسا ہے جیسے شاخِ گل سے بہار کے موسم میں پھولوں کا جھڑنا۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے　　　نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

اپنے دل سے کہتے ہیں کہ تو مجھ سے یہ کیا دریافت کرتا ہے کہ کیا لکھنا چاہئے۔ عقل بڑھانے والے نکات لکھنے چاہئیں۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے　　　خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

پھر سوچکر جواب دیتے ہیں۔ کہ اچھا آموں کی کچھ تعریف لکھنی چاہیے اور ایسی خوبی کے ساتھ لکھنی چاہیے کہ خامہ نخل رطب فشاں کا مدمقابل بن جائے یعنی بہت ہی شیریں مضامین رقم ہوں۔

آم کا کون مرد میداں ہے   ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

فرماتے ہیں۔ آم کا کون مرد میداں یعنی مدمقابل کون ہے۔ ثمر و شاخ گوئے و چوگان کا حکم رکھتے ہیں۔

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں   آئے یہ گوئے اور یہ میداں

فرماتے ہیں۔ انگور کی بیل کے جی میں کیوں ارمان باقی رہے۔ میدان کارزار میں آکر آم سے چوگان بازی کرلے۔

آم کے آگے پیش جائے خاک   پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

فرماتے ہیں۔ آم کے آگے پیش تو خاک بھی نہیں جاتی۔ اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے تاک انگور پھوڑ رہا ہے۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور   بادۂ ناب بن گیا انگور

فرماتے ہیں۔ جب کسی طرح آم کا مقابلہ نہ کر سکا تو انگور ہار کر شراب ناب بن گیا۔

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے   شرم سے پانی پانی ہونا ہے

فرماتے ہیں۔ انگور کا بادۂ ناب بن جانا گویا شرمندگی سے پانی پانی ہو جانا ہے اور مجبوری سے انگور اپنی جان کھوتا ہے۔

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے   آم کے آگے نیشکر کیا ہے

فرماتے ہیں مجھ سے پوچھو تم ابھی اس کی حقیقت سے خبردار نہیں ہو۔ آم کے سامنے نیشکر ایک بے قدر چیز ہے۔

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار   جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار

فرماتے ہیں۔ گنے میں نہ پھول آتا ہے نہ اس میں شاخیں ہیں نہ پتے ہیں نہ پھل ہیں اور

ان سب سے زیادہ بڑائی کی بات یہ ہے۔ کہ خزاں کا موسم اس کی بہار کا زمانہ ہے۔

اور دوڑائیے قیاس کہاں   جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

فرماتے ہیں۔ اور کہاں قیاس دوڑا کر آم کی شیرینی کا جواب پیدا کیا جائے۔ جان کو شیریں بیان کیا جاتا ہے۔ مگر اس میں ایسی مٹھاس کہاں ہوتی ہے۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی   کوہکن باوجود غمگینی

فرماتے ہیں۔ اگر جان میں ایسی شیرینی ہوتی تو کوہکن یعنی فرہاد باوجود غمگین ہونے کے

جان دینے میں اسکو یکتا جان   پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جان دینے میں اسکو یکتائے روزگار اور بے مثل زمانہ فرض کر لیا جائے تو بھی وہ اس آسانی سے جان نہ دے سکتا یعنی اگر جان میں شیرینی ہوتی تو وہ اس آسانی سے جان نہ دیتا

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر   کہ دواخانۂ ازل میں مگر

مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ثمر یعنی آم دواخانہ ازل کا بنا ہوا ہے اور یہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ

آتش گل پہ قند کا ہے قوام   شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

آتش گل پر قند کا قوام پکایا گیا ہے۔ اور شیرے کے تار کا نام ریشہ رکھدیا ہے۔

یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے   باغبانوں نے باغ جنت سے

یا یہ بات ہوگی۔ کہ جوش محبت سے باغبانوں نے باغ جنت سے

انگبیں کے بحکم رب الناس   بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

شہد کو خدا تعالیٰ کے حکم سے گلاسوں میں بھر کر اور ان پہ مہر لگا کر دنیا میں بھیج دیا ہے۔

یا لگا کر خضر نے شاخ نبات   مدتوں تک دیا ہے آبحیات

یا یہ بات ہے۔ کہ حضرت خضر نے شاخ نبات لگائی ہے اور مدت تک اس میں آبحیات دیا ہے

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل   ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

جب جا کر کہیں یہ درخت پھل لایا ہے۔ ورنہ ہم کہاں اور یہ نخل کہاں۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ خسرو پرویز کے پاس اس قسم کا کندن تھا۔ کہ ہاتھ سے دبا کر جو چیز اسکی چاہتے تھے بنا لیتے تھے۔ پرویز نے اسی کا ترنج بنوایا تھا۔ کھانے کے وقت وہ ترنج دسترخوان پر رکھدیا جاتا تھا اس کے بعد کسریٰ نے اسی سونے کا ساگ بنوایا۔ اور دسترخوان کی زینت اور آرائش کا اس سے کام لیا۔ دست افشار اسی واسطے میرزا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ وہ سونا موم کی طرح دبانے سے دب جایا کرتا تھا باقی دونوں شعروں کے معنی صاف ہیں۔

رونق کارگاہ برگ و نوا
نازش دودمان آب و ہوا

برگ نوا سامان کے معنی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور برگ کا لفظ درخت کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے۔ اور نوا سے طائران خوش الحان کی آواز بھی مراد ہے۔

رہرو راہ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

فرماتے ہیں۔ آم رہرو راہ خلد کا توشہ بھی ہے۔ اور طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ بھی ہے مراد یہ ہے۔ کہ آم کھاتے کھاتے اگر انسان مر بھی جائے تو سیدھا جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور طوبیٰ اور سدرہ بھی دانہ انبہ کو عزیز رکھتے ہیں۔

صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردہ بہار ہے آم

فرماتے ہیں۔ آم بڑا ساز و سامان رکھنے والا پھل ہے اور بہار نے بڑے نازوں سے اسکو پالا ہے۔ مصرع ثانی کی داد کچھ اہل زبان ہی دے سکتے ہیں۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبر نخل باغ سلطاں ہو

یہ دو باغ باغ سلطان مشہور تھے جن میں ایک باغ کا نام باغ حیات بخش تھا۔ اور دوسرے باغ کا نام مہتاب باغ تھا۔ باغ حیات بخش قلعہ معلیٰ کے اندر تھا۔ اور مہتاب باغ زیر فصیل کھائی کے اوپر واقع تھا۔ ان باغوں کا آم سلاطین اور بیگمات کے علاوہ کسی کو کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا

ان باغوں میں بہت سے درخت ابوظفر بہادر شاہ آخر بادشاہ دہلی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے تھے میرزا صاحب اس شعر میں انہیں باغوں کے آموں کی نسبت نوبر نخل باغ سلطان خطاب کر کے لکھتے ہیں۔

وہ کہ ہے والی ولایت عہد   عدل سے اسکے ہے حمایت عہد

فرماتے ہیں۔ وہ بادشاہ کہ ولایت عہد و پیمان کا وارث ہے اور اسی کے عدل و انصاف سے زمانہ و وقت کی حمایت ہے۔

فخر دیں عز و شان جاہ و جلال   زینت طینت و جمال و کمال

فرماتے ہیں۔ میرے ممدوح کی ذات والا صفات دین کے واسطے باعث فخر و عزت اور جاہ و جلال کی شان اس سے بڑھ گئی ہے اور نیک طینتی کی وہ زینت ہے اور کمال کے واسطے وہ جمال کا حکم رکھتا ہے۔

کارفرمائے دین و دولت و بخت   چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

فرماتے ہیں۔ دین و دولت و بخت کا وہ بادشاہ ہے اور تاج و مسند و تخت کی عزت میں اس نے اضافہ کر دیا ہے۔

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے   خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

فرماتے ہیں۔ اس کے سایہ میں جو شخص آجائے وہ بادشاہ بن جائے اور مخلوق کے سر پہ وہ ظل اللہ کا حکم رکھتا ہے۔

اے مفیض وجود سایہ و نور   جب تلک ہے نمود سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو   وارث گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو   اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

یہ تینوں شعر دعائیہ ہیں۔ اور مطلب ان کا صاف ہے۔

قطعات

اے شہنشاہ فلک منظر و بیمثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ عدیل

فرماتے ہیں۔ اے شہنشاہ فلک مرتبہ تو بے مثل اور بے نظیر ہے۔ دوسرے مصرع میں کہتے ہیں۔ اے بادشاہ تیری عادت کرم کرنے کی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تو عادل زمانہ ہے۔

پانو سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل

فرماتے ہیں۔ تخت شاہی تیرے قدموں سے اپنا سر ارادت ملتا رہتا ہے۔ اور تیرے سر اقدس سے تاج شاہی سعادت حاصل کرتا رہتا ہے۔

تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

فرماتے ہیں۔ تیری گفتار میں یہ اعجاز ہے کہ الہامی دقیق باتوں کو الجھی ہوئی زلفوں کی طرح سلجھا دیتی ہے اور تیرے قلم کی رفتار بازوئے جبرائیل کی جنبش سمجھی جاتی ہے۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل

فرماتے ہیں۔ جن لوگوں نے قرب کلیم اور بذل خلیل کی کیفیت صرف کانوں سے سنی تھی آنکھوں سے نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے تیری وجہ سے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ کہ تیری ذات میں یہ دونوں صفتیں نظر آتی ہیں۔

بسخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

فرماتے ہیں۔ تیرے کلام سے معنی و لفظ کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے اور تیرے کرم سے یعنی تیرے جود و بخشش سے دریائے قلزم و دریائے نیل شرما جاتے ہیں

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج وعلم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

فرماتے ہیں اس لئے کہ تیرے وقت میں عیش و طرب کی ترقی ہو۔ ماہ نے برج ثور سے باہر

نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس واسطے کہ تیرے زمانہ میں رنج و الم کم ہو جائے۔ زہرہ نے برج حوت میں داخل ہونا ترک کر دیا ہے

تیری دانش میری اصلاح مفاسد کی رہین
تیری بخشش میرے انجاح مقاصد کی کفیل
تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید
تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

یہاں اقبال کے معنی التفات کرنے کے ہیں۔ باقی دونوں شعروں کا مطلب صاف ہے۔

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

فرماتے ہیں۔ میری بدنصیبی یہ چاہتی ہے کہ مجھ کو کہیں امن و امان میسر نہ آئے۔ اور آسمان کی گردشیں یہ چاہتی ہیں کہ مجھ کو ذلیل کریں۔

پیچھے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

مطلب یہ ہے۔ کہ پہلے ناخن تدبیر کو ناقابل عقدہ کشائی کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سررشتۂ اوقات میں گرہ لگائی ہے۔

تپش دل نہیں بے رابطۂ خوف عظیم
کشش دم نہیں بے ضابطۂ جر ثقیل

فرماتے ہیں تپش دل خوف عظیم سے خالی نہیں ہے میرے واسطے سانس لینا بھی جر ثقیل سے کم نہیں ہے۔

در معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فرماتے ہیں۔ معنی کے موتیوں سے میرا کاغذ تحریر لقا کی ڈاڑھی بن گیا ہے (بیان کیا جاتا ہے کہ لقا ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرویا کرتا تھا) اور دنیا کے غموں سے میرا سینہ عمر عیار کی زنبیل بن گیا ہے۔ عمر عیار کی زنبیل کی نسبت داستان گو بیان کرتے ہیں۔ کہ ساری دنیا کی چیزیں اس میں رہتی تھیں۔ بیشک کہ زنبیل عمر بجائے خود ایک دوسری دنیا تھی۔ گویا میرے سینہ میں غم گیتی کی اسی طرح سمائی ہے جس طرح عمر عیار کی زنبیل میں اشیاء عالم کی۔

فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

فرماتے ہیں۔ میں نے اپنی عبارت قلیل میں اشارات کثیر ادا کر دئے ہیں۔ مطلب یہ ہے گو میں نے اپنا مختصر حال عرض کیا ہے۔ اور وہ بھی صاف صاف بیان نہیں کیا لیکن پھر بھی اشارات کثیر اس میں ایسے موجود ہیں۔ جس سے میری مصیبتوں کا حال تمام و کمال مفصل و مشرح آپ سمجھ سکتے ہیں۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

فرماتے ہیں میں ایسا جادو بیان شاعر ہوں۔ کہ میرا مبہم حال بیان کیا ہوا۔ توضیح سے بڑھ کر ظاہر ہوتا ہے۔ اور میرے مجمل بیان سے تفصیل پڑی ٹپک رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری عبارت کے الفاظ قلیل ہیں اور معنی کثیر۔

نیک ہوتی مری عادت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل،

فرماتے ہیں۔ اگر مجھ کو مصائب کا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں حضور کو تکلیف نہ دیتا۔ اور مصائب سے میرا دل اگر پریشان نہ ہو جاتا تو میں زود طلبی کو کام میں نہ لاتا۔

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

سارے قطعہ کا لب لباب یہ شعر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ معنی صاف۔

قطعہ گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

یہاں تقریر کرنا بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو فارسی محاورۂ تقریر کردن کا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ وہ دن تو گذر گئے کہ تم ناتجربہ کاری سے غیروں کی وفاداری کی تعریف بیان کیا کرتے تھے اور ہم خاموش بیٹھے ہوئے سنا کرتے تھے اور اپنے دل میں جلا کرتے تھے۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

فرماتے ہیں۔ بس اب ان سے بگڑ گئی ہے۔ تو ہم سے تم کیوں شرمندگی کی وجہ سے نہیں ملتے۔ آؤ مل جاؤ۔ ہم قسم کھاتے ہیں۔ کہ تم سے یہ بات بھی نہ کہیں گے۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ یہ لوگ بے وفا ہیں۔ تم سے بے وفائی کریں گے۔

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حف نظر کے معنی چشم بد دور کے ہیں۔ باقی شعر صاف ہیں۔

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

اس قطعہ کی نسبت حضرت استادی مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۸۶۸ء میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ مولوی محمد علم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانہ میں میرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے۔ اور میں بھی حاضر تھا شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ میرزا نے کہا فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اس نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ میرزا بولے اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ ڈھائی سو نہیں تو دو چار شعر موقع پر بداہۃً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال ہتھیلی پر رکھی اور میرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ میرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا اور وہ یہی قطعہ ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

فرماتے ہیں۔ خامہ انگشت بدنداں یعنی حیرت میں مبتلا ہے کہ اس چکنی ڈلی کو میں کیا لکھوں اور ناطقہ سر بگریبان یعنی فکر و تشویش میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کو کیا کہنا چاہیے۔

مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھیے — حرز بازوئے شگرفان خود آرا کہیے

فرماتے ہیں۔ اس کو کسی کے نامۂ شوق کی مہر سے مشابہ لکھنا چاہیے۔ یا کسی معشوق شوخ و

شنگ کے بازو کا تعویذ سمجھنا چاہیے۔

مسی آلودہ سر انگشت حسیناں لکھیے
داغ طرف جگر عاشق شیدا کہیے

چھنگلیا کے پاس کی انگلی سے عورتیں مسی ملا کرتی ہیں۔ اور مسی کے رنگ سے انگلی کی پور مسی رنگ کی ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں حسینوں کی مسی آلود پور اسکو لکھنا چاہیے یا داغ جگر عاشق شیدا قرار دینا مناسب ہے۔

خاتم دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سر پستان پریزاد سے مانا کہیے

فرماتے ہیں۔ ایک تشبیہ تو اس کی یہ ہے کہ خاتم دستِ سلیمان اسکو لکھا جائے اور دوسری تشبیہ یہ ہے کہ پستان پریزاد کی بھٹنی کہا جائے۔

اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے
خال مشکین رخ دلکش لیلے کہیے

یا اس کو قیس کے اختر سوختہ سے نسبت دینی چاہیے۔ یا خال مشکیں جو رخ لیلی پر تھا وہ اس کو سمجھنا چاہیے۔

حجرالاسود دیوار حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے

یا اس کو حجرالاسود فرض کرنا چاہیے۔ یا آہوئے ختن کا نافہ کہنا چاہیے۔

وضع میں اسکو اگر سمجھیے قاف تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

یہ شعر صاف ہے۔

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے

فرماتے ہیں۔ عبادت خانہ میں اسکو سجدہ گاہ کا رتبہ حاصل ہے۔ تو میخانہ میں خشت پائے سر خم کا رتبہ رکھتی ہے۔

کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہیے
کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجیے
کیوں اسے مردمک دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہن لیلے کہیے
کیوں اسے نقش پے ناقۂ سلما کہیے

فارسی میں تخم گندمی کے معنی پر استعمال ہوتا ہے اور میرزا صاحب نے اسی معنی پر تخم کو نقطہ باندھا ہے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے۔

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضورِ والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور اُلوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریہ میں کبھی کبھی میرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے جس وقت چوبدار بادشاہی یہ اُلوش لے کر آیا۔ ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو میرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا۔ موجود تھا۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس سے متعجب ہو کر پوچھا۔ کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اُلوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ میرزا نے کہا ارے احمق چنا وہ چیز ہے۔ کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں۔ اور مجھ سے سینکڑوں چیزیں کھانے کی بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے۔ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔ (از یادگارِ غالب)

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

یہ وہی سہرا ہے جس کے جواب میں استاد ذوق نے بھی سہرا لکھا ہے۔ اور مقطع میں چوٹ کی ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ چوٹ کا جواب دیا ہے۔ معنی صاف ہیں۔

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

فرماتے ہیں کس قدر اس چاند سے چہرہ پر اچھا معلوم ہوتا ہے گویا سہرا تیرے حسنِ دل افروز کے واسطے زیور کا کام دیتا ہے

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

فرماتے ہیں۔ اے گوشۂ کلاہ تجھ کو یہ سرفرازی مبارک ہو کہ تو نوشاہ کے سر تک پہنچ گیا ہے۔ مگر مجھ کو یہ خوف ہے کہ تیرے درجہ اور مرتبہ کو سہرا چھین نہ لے

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

میرزا صاحب کی نزاکت معنی اس شعر میں اپنی آب و تاب دکھا رہی ہے۔ مطلب صاف ہے اور کوئی بات شرح طلب نہیں۔

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

گویا سہرے میں اتنے موتی پروئے گئے ہیں کہ جب تک ہفت قلزم کے گوہر آبدار جمع نہ کئے جائیں اس وقت تک گز بھر کی لڑی بھی سہرے کی نہیں بن سکتی۔

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا

فرماتے ہیں۔ دولھا کے رخ پر جو گرمی سے پسینے کے قطرے جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابر نیساں بار موتی برسا رہا ہے۔ سہرے کی لڑی نہیں ہے بلکہ رگ ابر ہے

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

یہ دونوں شعر صاف ہیں۔ معنی میں کسی قسم کی دقت نہیں ہے۔

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوش مسرت سے چاک ہو جانا ہے۔ ایسی صورت میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا ہے۔

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

رخ روشن کو فروغ ماہ سے اور گوہر غلطاں کو ستاروں کی چمک سے تعبیر کیا ہے۔ باقی شعر کا مطلب صاف ہے

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا

فرماتے ہیں۔ یہ ریشم کا تار نہیں ہے رگ ابر بہار ہے۔ ریشم کا تار اتنے بڑے بڑے موتیوں کو کب سنبھال سکتا ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں،
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشدزادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولیعہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقعہ آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالبؔ نے یہ سہرا کہہ کر زرنگار کاغذ پر لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔ جب سہرا کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا۔ کہ استاد اسے تو دیکھو۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو۔ اور کہا مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
تابش حسن سے مانند شعاع خورشید
رخ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغان نواسنج نہ کیونکر سہرا
رخ فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئین ہے دم آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
ایک گوہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لیکے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھولدے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرت تار نظر سے ہے تماشائیوں کی
دم نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو انکو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں لازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا۔ اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ میرزا بڑے ادا شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہوگیا کچھ اور یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گذرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں (از شمس العلماء مولانا آزاد مولف آبحیات و دیوان ذوق وغیرہ)

قطعہ مد

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ واقعی حال گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو اپنے حسن طبیعت کا بیان کرنا منظور نہیں ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اہل سیف کی عزت و توقیر اہل قلم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور میرا موروثی پیشہ سپہگری ہے اور یہی میرا باعث عزت ہے۔ کچھ شاعری کو میں اپنی عزت کا سبب نہیں سمجھتا

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ میں آزاد روش کا انسان ہوں اور میرا طریقہ صلح کل ہے۔ میں کبھی کسی سے عداوت نہیں رکھتا۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ یہ شرف میرے لئے کیا کم ہے کہ میں ظفر کا غلام ہوں۔ پھر کیا دیوانہ ہوں کہ شاعری کو عزت کا ذریعہ سمجھوں۔ اس بات کو میں مانتا ہوں کہ اور غلاموں کی طرح مجھ کو ثروت و منصب و جاہ حاصل نہیں ہے۔ نہ ہو۔ مجھ کو کچھ اس کا افسوس بھی نہیں۔

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

اس شعر کا مطلب صاف ہے۔

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا　　جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

فرماتے ہیں مجھ کو ریختہ گوئی سے کیا واسطہ۔ اردو شعر کہاں میں کہاں مجھ کو اگر ہے تو فارسی زبان میں شعر کہنے کا شوق ہے۔ یہ تو صرف حضور کے خوش کرنے کو اردو میں غزل وغیرہ لکھ لیا کرتا ہوں۔ چنانچہ

سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر　　دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

حضور کے حکم سے سہرا میں نے لکھا ہے جب دیکھ لیا کہ سوا اطاعت کے یعنی حکم بجا لانے کے مجھے چارہ ہی نہیں ہے،

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات　　مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اس سہرے کا مقطع جو میں نے یہ لکھا ہے ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

یہ ایک شاعرانہ بات ہے۔ اس سے میرا مطلب نہیں ہے کہ میں دوستانہ مراسم قطع کر دوں

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ　　سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے

فرماتے ہیں میں نے اگر کسی پر چوٹ کی ہو تو کالا منہ ہو۔ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ مجھ کو جنون نہیں ہے۔ میں انسان ہوں۔ ذی عقل ہوں۔ وحشی جانور نہیں ہوں۔

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں　　ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ میں بد قسمت ہوں۔ بد طینت نہیں ہوں۔ یہ شکر کی بات ہے۔ کہ مجھ کو کسی بات کی شکایت نہیں ہے۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ　　کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ اے غالب میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں صادق القول شخص ہوں وہ میں جو کچھ کہتا ہوں یعنی کہہ رہا ہوں وہ سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھ کو جھوٹ کی عادت نہیں ہے۔

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے　　تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے　　ج

فرماتے ہیں۔ اے نصرت الملک بہادر مجھ کو جو تجھ سے اسقدر ارادت ہے۔ میں حیران ہوں کہ

یکس وجہ سے ہے یعنی انعام واحسان کی وجہ سے جو ارادت ہوا کرتی ہے اس میں روحانی تعلق خاطر کی جھلک نہیں ہوا کرتی محبت قلبی دوسری شے ہے اور بغیر احسان مندی کے قدرتی طور سے دل میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ عجیب بلیغ شعر لکھا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے　　　رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

فرماتے ہیں۔ اگرچہ تو وہ ہے کہ اگر دربار آراستہ کرے تو بزم مہ و مہر کو بھی تیری ذات سے رونق حاصل ہو جائے۔

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں　　　غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

فرماتے ہیں تیری خوبیوں کا موازنہ جب اپنی ذات سے کرتا ہوں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ مجھ سا ننگ آفرینش تیرے لطف و عنایت کا سزاوار نہیں ہے۔ غیر تو غیر مجھ کو خود اپنی اوقات سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست　　　نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

فرماتے ہیں۔ میری خستہ دلی کا بھلا ہو جس کے سبب سے سر دست تیری ذرہ نوازی کی بدولت مجھ کو بھی تجھ سے ایک شکر گذاری کا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ شخص ہوں اور تو مصیبت زدہ آدمیوں کی امداد کا خوگر ہے۔

ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عناں　　　یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

فرماتے ہیں۔ تیرے دست زیر دست میں توسن دولت کی باگ رہے۔ صبح و شام قاضی الحاجات کی درگاہ میں یہ دعا کیا کرتا ہوں۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا　　　گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

تو میرا سکندر ہے۔ مجھ کو تجھ سے مل کر فخر حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ حضرت خضر کی بھی ملاقات سے مجھ کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ اشارہ خضر و سکندر کے مشہور قصہ کی طرف ہے۔

اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار　　　غالب خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

فرماتے ہیں۔ بدکاری و ریاکاری کے واسطے اہل صلاح و تقوی مخصوص ہیں۔ غالب خلوت نشین رندان خرابات سے ہے جن کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے فریب مکر جانتے ہی نہیں۔

قطعہ ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشکبو کی ناند

فرماتے ہیں۔ آج آخری چہار شنبہ ہے۔ سبزہ روندنے کے لئے باہم مل کر احباب آتے ہیں۔ ہم بھی چمن میں مے مشکبو کی ناند بھر کر رکھ دیں۔

جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست — سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

جو شخص آئے ایک جام بھر کے پی لے اور مست ہو کے سبزے کو روندے اور پھولوں پر سے کود جائے

غالب کیا بیاں ہے بجز مدح بادشاہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

فرماتے ہیں اے غالب اس قطعہ کی تشبیب میں تو فضول باتیں کیا لکھ رہا ہے تشبیب کو چھوڑ کر فوراً مدح کی طرف متوجہ ہو جا۔ مجھکو بجز مدح بادشاہ کے اور کوئی بات پسند نہیں آتی۔

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں — ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

فرماتے ہیں۔ آج کے دن بادشاہ کے دربار میں سونے چاندی کے چھلے جن کے دم کئے ہوئے پانی میں بجھا کر تقسیم کئے جاتے ہیں اور وہ چھلے ایسے آب و تاب کے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی چمک دمک نہیں سکتا۔ دھوپ کا سنہری رنگ مانا گیا ہے۔ اور چاندنی کا سفید۔ چنانچہ کسی شاعر کا مصرعہ ہے ع

چاندنی چاندی کا ہے تو دھوپ سونے کا ورق

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے — لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

فرماتے ہیں۔ ان سونے چاندی کے چھلوں کو یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ اگر بیچ سے خالی نہ ہوتے تو گویا لاکھوں آفتاب اور بے شمار چاند تھے۔

در مدح شاہ اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاندار — ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

میرزا صاحب نے اس شعر میں بادشاہ کی تین صفتیں بیان کی ہیں۔ پہلی صفت جہانگیری دوسری

صفت جہان بخشی تیری صفت جہانداری۔ فرماتے ہیں۔ یہ صفتیں تجھ کو اسی وجہ سے حاصل ہو گئی ہیں کہ تجھے ہر کام کے کرنے کے لئے غیب سے بشارت ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیرا ہر ارادہ پورا ہو جاتا ہے اور کسی کام میں ناکامی کا دخل نہیں ہوتا۔

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

فرماتے ہیں۔ تیرے ایک ادنیٰ سے اشارہ سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جو برسوں کی کوشش سے بھی حل نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

فرماتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ حضرت خضر سکندر سے تیرے عز و جاہ کا ذکر فرمائیں اور پہلے آب حیواں سے کلیاں نہ کرلیں۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

فرماتے ہیں۔ آصف کو حضرت سلیمان کا وزیر بن کر شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اگر حضرت سلیمان تیری وزارت کا کام انجام دیں تو ان کے لئے باعث فخر ہے۔

ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی
ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

فرماتے ہیں۔ تجھ سے ارادت رکھنی اور تیری فرمانبرداری حکم الٰہی کے موافق ہے اور جسکو تیرا داغ غلامی نصیب ہو گیا۔ اسکو گویا امیری کی سند حاصل ہو گئی۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

لف و نشر مرتب ہے یعنی اگر پانی سے اس کے بہنے کی طاقت کو سلب کرلے تو موجۂ دریا میں روانی باقی نہ رہے۔ اور اگر تو آگ سے اس کی گرمی کو دفع کر دینا چاہے تو جلتی ہوئی آگ میں گرمی باقی نہ رہے۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر   قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت

فرماتے ہیں باوجودیکہ میں بہت مشاق شاعر ہوں اور بہت بڑے مضمون کو تھوڑی عبارت اور کم لفظوں میں ادا کر سکنے پر قادر ہوں لیکن تیرے اوصاف بیان کرنے میں بھی قاصر ہو جاتا ہوں۔ اس لئے مجبور ہو کر مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں   نظارگی صنعت حق اہل بصارت

فرماتے ہیں۔ آج جشن نوروز کا دربار ہے۔ اور تماشائی چشم بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی صنعت تخلیق کو دیکھ رہے ہیں۔ مطلب ہے کہ تیرے چہرۂ انور کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔

تجھ کو شرف مہر جہانتاب مبارک   غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

فرماتے ہیں تجھ کو شرف آفتاب مبارک ہو اور غالب کو تیری زیارت۔

قطعہ

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو   اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو   روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

میرزا ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینہ میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا گیا تھا جس کو سن کر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے بے اختیار ہنس پڑے (از یادگار غالب)

قطعہ

یہ وہ قطعہ ہے جو میرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست سے گذرانا تھا۔ کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی۔ وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی (از یادگار غالب)

اے شہنشاہ آسماں اورنگ   اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں   تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی   ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز   روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری   ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ اگر آپ کو کہوں خاکی   جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں   بادشاہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح   تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی میرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گذرانتے تھے اور خلعت پاتے تھے۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر   نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں   ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر   تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش   جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال   کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ   بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان   دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی   وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے   اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک   خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات   اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض   اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا   ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیے　　ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے　　ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد　　قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام　　شاعری سے نہیں مجھے سروکار

شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے چونکہ یہ قطعہ میرزا نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے (از یادگار غالب)

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ
سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے　　جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے　　کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

شریک غالب اس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو شریک غالب کے لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے (از یادگار غالب)

قطعہ
سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی　　مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد　　تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کتنے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے (از یادگار غالب)

قطعہ تاریخ
خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر　　کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسی ہی فرخندہ سال میں غالب　　نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ
۱۸۵۴ء

طوے کے معنی بیاہ کے ہیں۔ شاہزادہ میرزا جعفر کی تاریخ لکھی ہے۔ مادہ مخطوط ہے سنہ ۱۸۵۴ء نکلتا ہے۔

ایضاً

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی   ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اسکی کیا ہے   تو بولا انشراح جشن جمشید
سنہ ۱۲۷۰ھ

قطعہ
گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں   دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام   اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ آداب تھا۔ کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پہ ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پہ رکھ لیتے تھے۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پہ ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اسلئے میرزا نے اسکو اس پیرایہ میں بیان کیا ہے [illegible]

رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال   ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم   اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال

اس رباعی میں میرزا صاحب نے عمر گذشتہ کو واپس پلٹ آنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے عمر گذشتہ تو جہاں ہے۔ اسی اقلیم کے قرب و جوار میں ہم بھی آ پہنچے ہیں ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم تو بھی واپس چلی آ۔ شاید تیرے واپس آنے سے دو چار دن کے لئے شباب رفتہ بھی واپس آ جائے۔

رباعی
شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا   کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک   ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

فرماتے ہیں۔ رات کے وقت مجھکو اس کی زلفیں اور رخِ عرق فشاں یاد آکر کچھ ایسی پریشانی پیدا ہوئی تھی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور چونکہ زلف اور رُخ کا تصور تھا اسلئے آنسو نے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی پیدا کر لی تھی گویا ہر آنسو میرا ایک آنکھ بنگیا تھا اسلئے ہزاروں آنکھوں سے روتا رہا۔

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال　　ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

فرماتے ہیں۔ آتش بازی جس طرح بچوں کا کھیل ہے، اسی طرح معشوقانِ ستمگار سوزِ جگرِ عاشق کو دلچسپی کا باعث سمجھتے ہیں۔ موجدِ عشق بھی کوئی قیامت کا پتلا تھا۔ جوان معشوقوں کے لئے یہ کھیل ایجاد کر گیا ہے۔

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی　　بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس　　تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

فرماتے ہیں۔ کچھ روز پہلے ہمارے پہلو میں دل تھا۔ ہم دل رکھتے تھے۔ جو زندگی پر درد کی سختیاں برداشت کر لیتے تھے۔ بیتابیِ رشک کو جھیلا اور دیدار کی حسرت سہی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اب ہم ہیں اور افسردگی اور بے دلی۔ اے تجلّی طور اگر تیری تکرار ناممکن اور محال ہے تو تجدید ہی سہی کہ مجھے نئے سرے دل کو پھر اسی سوز و گداز کی ہوس ہے۔ گو تکرار ہر شے کی محال ہے یعنی معدوم کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سوز و گداز کا از سرِ نو پیدا ہو جانا تو ناممکنات سے نہیں ہے

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد　　ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

فرماتے ہیں۔ یہ مخلوق جس نے اپنا شعار حسد و بغض کر لیا ہے۔ رات دن لڑنے بھڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور وحشت کدۂ تلاش یعنی تلاشِ معاش لڑنے کے واسطے ہے تکلوں اور گڈیوں کی طرح یہ بدمعاش باہم ملتے ہیں۔ ملنے سے ان کی مراد لڑائی ہوتی ہے جس طرح تکل اور گڈی آپس میں مل کر لڑتی ہے۔

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

فرماتے ہیں۔ دل نہایت غمگین ہو گیا گویا۔ اور اس سے گلہ مند ہو گیا ہے۔ گویا باوجود ان دونوں باتوں کے یار کے سامنے طاقت گویائی باقی نہیں رہتی۔ گویا غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے۔

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک کے بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

اکثر دیوانوں میں اس رباعی کا مصرعہ ثانی رُک رُک کر لکھ دیا گیا ہے۔ اور اس صورت میں دو حرف وزن سے بڑھ جاتے ہیں۔ باقی رباعی کے معنی صاف ہیں۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس اخیر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے۔ کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ بُرا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بات میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخنوران کامل کی نافہمی و کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں بس ہر طرح مشکل ہے (از یادگارِ غالبؔ)

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اس کے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاہ نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کے شبِ قدر و دیوالی باہم

فرماتے ہیں۔ دیوالی کی بُت پرستی مرتبہ سافل ہے اور شب قدر کی عبادت درجۂ عالی ہے

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے   تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ   ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

رباعی

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا   اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں   ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یہ دونوں رباعیاں بادشاہ کی سالگرہ کی مبارکباد میں لکھی گئی تھیں۔ دونوں ہمثل طریقہ سے۔ دونوں رباعیوں میں ترقی عمر کی دعائیں دی گئی ہیں۔

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں   عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہو گا   کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

کسی کام سے ہاتھ اٹھانا۔ گویا اس کام سے دست بردار ہونا اور دوسرے معنی ہاتھ اٹھانے کے ہیں کہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا۔

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے   کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ   وہ آپ ہیں صبح و شام کرنیوالے

اس رباعی میں میرزا نے غایت درجہ کی شوخی کی ہے۔ جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے۔ کہ ہم ہرچند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کارروائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے۔ ایسی

کہیں نہیں ہوتی۔ کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گذر جاتی ہے۔ اور مطلب حاصل نہیں ہوتا
از یادگار غالب)

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں   آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن   خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزہ کا مضمون باندھا ہے دربار میں پیش کی گئی تھی

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے   بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیوینگے ہم دعائیں سو بار   فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے اسکے شکریہ میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے (از یادگار غالب)

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے   ثاقبؔ حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکے بیوجہ جواب   غالبؔ کا پکا دیا کلیجہ تم نے

ایضاً

اے روشنیِ دیدۂ شہاب الدیں خاں   کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک   سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

میرزا صاحب نے یہ دونوں رباعیاں شہاب الدین احمد خاں المتخلص بہ ثاقب خلف نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر المتخلص بہ نیر درخشاں کو لکھ کر بھیجی تھیں۔ حضرت ثاقب میرزا صاحب کے بہت عزیز شاگرد تھے اور فارسی بھی میرزا صاحب سے پڑھی تھی علاوہ شاگردی کے قرابت بھی رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ عہد جوانی میں انتقال فرما گئے۔

تمام شد

بار دوم   ۲۶ر جولائی ۳۵ء

PDF By :

Ghulam Mustafa Daaim Awan